احمد یار خان

چڑیا پھنس گئی.....

جرم و سزا اور تفتیش کی چھ سنسنی خیز کہانیاں

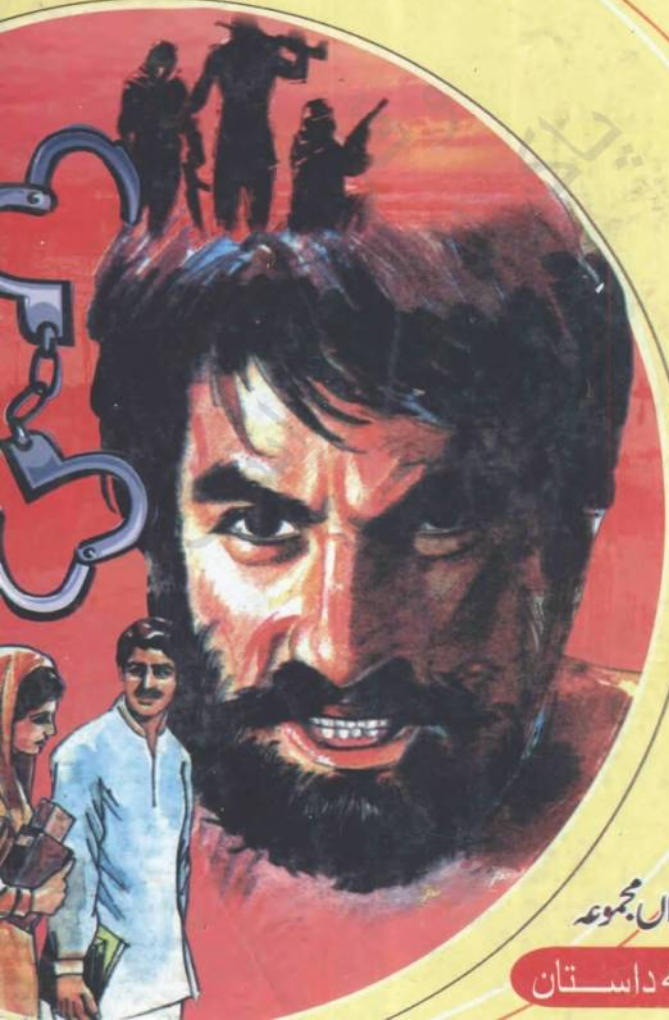

پچیسواں مجموعہ

مکتبہ داستان

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی چھ طویل کہانیوں پر مشتمل 25 واں مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پچھلی تین دہائیوں سے محترم احمد یار خان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ قارئین کے لیے ان کی شخصیت تعارف محتاج نہیں۔

تفتیش اور سراغرسانی میں ان کا نام اور کام ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ محترم احمد یار خان کی قارئین میں مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کئی معاصر پرچوں نے بھی پرانے ریٹائرڈ پولیس افسروں کی تفتیشی کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی محترم احمد یار خان جیسی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احمد یار خان افسانے نہیں سناتے بلکہ چار دیواری کی دنیا کے گورکھ دھندے اور معاشرے کے حقیقی ڈرامے پیش کرتے ہیں جو پڑھنے میں اپنے اندر دلچسپی اور سنسنی خیزی کا تاثر لئے ہوتے ہیں اور آئے دن ہمارے سامنے، ہمارے گھروں میں کھیلے جاتے ہیں۔ یہی ڈرامے جب تھانے پہنچتے ہیں تو ان کے اندر سے بڑی ہی شرمناک، سنسنی خیز اور چونکا دینے والی کہانیاں برآمد ہوتی ہیں۔

عام طور پر جرم و سزا اور جاسوسی کہانیوں میں بے جا مار دھاڑ اور لذت پرستی ضروری خیال کی جاتی ہے لیکن احمد یار خان کی کہانیاں ایسی خرافات سے پاک ہوتی ہیں اور انہیں بلا جھجک گھر کا ہر فرد پڑھ سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ محترم احمد یار خان نے پاکستان کے قارئین کو انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی، فحش اور لچر جرم و جاسوسی کی کہانیوں سے نجات دلا دی ہے۔

مدیر "حکایت"

فہرست

جب مارتھا ئُروبینہ بنی	5
بٹن، بزرگ اور بدکار بیوی	45
چڑیا پھنس گئی	84
اس جینے سے موت اچھی	120
وہ بھی باپ تھا	162
خواب اور حقیقت	201

وقار پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جب مارتھا ئُروبینہ بنی

ایک عیسائی لڑکی مسلمان ہوگئی اور کچھ دنوں بعد قتل ہوگئی۔ یہ واردات نئی دلی کی ہے اور جنگِ عظیم فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکی تھی۔ میں اس وقت سی آئی اے میں تھا۔ متعلقہ تھانہ تفتیش کر رہا تھا۔ پندرہ سولہ دنوں بعد یہ کیس سی آئی اے کو دے دیا گیا۔ مقتولہ چونکہ ایئر ہیڈ کوارٹر میں کام کرتی تھی اس لیے ایئر ہیڈ کوارٹر کی درخواست پر کیس تھانے سے سی آئی اے کو دیا گیا تھا۔ اس میں ایئر فورس پولیس کا عمل دخل زیادہ تھا۔

یہ تفتیش سی آئی اے کے انسپکٹر کلارک کو دی گئی اور مجھے اس کا اسسٹنٹ مقرر کیا گیا۔ اس وقت میں بھی انسپکٹر تھا۔ ہمارے ڈی ایس پی نے ہمیں بلا کر ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ ہم ایئر فورس پولیس کے ہیڈ کوارٹر یعنی ایئر ہیڈ کوارٹر میں چلے جائیں اور وہاں سے ہمیں بتایا جائے گا کہ اس کیس کی کیا اہمیت ہے اور یہ سی آئی اے کو کیوں دیا گیا ہے۔

''میں یہ بتا دیتا ہوں'' ــــ اس انگریز ڈی ایس پی نے کہا ــــ ''جس تھانے کا یہ کیس ہے اس تھانے میں ایس ایچ او ہندو ہے۔ چونکہ لڑکی مسلمان ہوگئی تھی اس لیے ہندو مسلمانوں کے خلاف تعصب میں آگیا ہے اور تفتیش میں گڑبڑ کر رہا ہے۔ تمہارا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ صرف یہ پیش نظر رکھو کہ ایک عورت قتل ہوگئی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ قاتل کو پکڑنا اور اسے سزا دلوانی ہے''۔

ہم دونوں انسپکٹر جیپ میں بیٹھے اور ایئر ہیڈ کوارٹر چلے گئے۔ وہاں ایئر فورس پولیس کے کمانڈر سے ملے۔ اسے دراصل کمانڈر نہیں بلکہ پروسٹ مارشل کہا جاتا تھا۔ وہ بھی انگریز تھا۔ یہ تو مجھے احساس تھا کہ ایک لڑکی قتل ہوگئی اور تفتیش میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور قاتل کو پکڑ کر پھانسی دلوانی ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ انگریز قتل کے معاملے بڑے ہی سخت ہوا کرتے تھے اور تفتیش میں سستی یا کوتاہی برداشت نہیں کرتے

تھے۔ان کا اصول تھا کہ قاتل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی کے قتل کو یہ انگریز افسر کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ لڑکی مسلمان ہوگئی تھی اور یہ ان کے لیے کوئی اچھا واقعہ نہیں تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، ہمیں اس واردات کی تفتیش کرنی تھی اور قاتل کو پکڑنا تھا۔ ہم اس وقت ایئر فورس پولیس کے سب سے بڑے افسر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جس کا عہدہ ونگ کمانڈر تھا۔

''یہ قتل کا ایک عام کیس ہے''۔۔۔ اس انگریز ونگ کمانڈر نے کہا۔۔۔ ''لیکن ہم لڑکی کو کچھ زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ ایک اس وجہ سے کہ لڑکی ایئر ہیڈ کوارٹر کی ایک بڑے ہی اہم اور نازک شعبے کی سٹینوگرافر تھی۔ اس کا سارا کام اور رابطہ اس شعبے کے ڈائریکٹر کے ساتھ رہتا تھا۔ مجھے ایسا وہم تو نہیں لیکن یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کا تعلق جاسوسوں کے ساتھ نہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ تھانے کا ایس ایچ او کوئی تسلی بخش تفتیش نہیں کر رہا۔ ہم اس کی تفتیش کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے ایک مسلمان فلائٹ لیفٹیننٹ کو پکڑ کر تھانے میں بٹھا لیا تھا۔ مقتولہ کے باپ نے بھی شکایت کی ہے کہ تفتیش ٹھیک نہیں ہو رہی۔ مقتولہ کا منگیتر بھی ہے۔ شک اس پر ہونا چاہیے لیکن اس سب انسپکٹر نے منگیتر کو شاملِ تفتیش کیا ہی نہیں''۔

منگیتر کا نام سن کر میں چونکا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ پہلا شک منگیتر پر ہی ہونا چاہیے۔

ونگ کمانڈر نے دو اور باتیں بتائیں۔ ایک یہ کہ لڑکی کچھ زیادہ ہی خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس منگیتر کا بڑا بھائی پولیس انسپکٹر ہے اور ان دنوں وہ انبالہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں تھا اور تفتیش کے دوران دلی آیا تھا۔

یہ لڑکی سویلین نہیں بلکہ فوجی تھی۔ میں نے اپنی پہلی کسی کہانی میں بتایا تھا کہ جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے عورتوں کی ایک فوج بنائی تھی۔ یہ فوجیوں کی طرح وردی پہنتی تھیں اور ان کے فوجیوں والے ہی عہدے تھے لیکن انہیں کسی محاذ پر نہیں بھیجا جاتا تھا کہ یہ دفتروں میں کام کرتی تھیں۔ اس فورس کی عورت کو ویکائی کہا جاتا تھا۔ ویکائی اس فورس کے نام کا مخفف تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اس لڑکی کے قتل کو زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ اس ونگ کمانڈر نے کہا تھا کہ ایک ویکائی کا قتل آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ونگ کمانڈر نے ایک دو اور باتیں بھی کہیں جو وہ نہ کہتا تو بھی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں تفتیش کرنی تھی اور پوری دیانتداری اور جانفشانی سے کرنی تھی۔ مقتولہ چونکہ مسلمان

ہوگئی تھی اور اس کے بعد قتل ہوئی تھی اس لیے میں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے محسوس کیا کہ میں صرف ایک پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ جذباتی لحاظ سے بھی اس کیس میں دلچسپی رکھتا ہوں..... ہم دونوں وہاں سے اٹھے اور اس تھانے کو چلے گئے جس تھانے کے علاقے میں واردات ہوئی تھی اور اب تفتیش ہو رہی تھی۔

وہاں کا ایس ایچ او سب انسپکٹر پنڈت شنکر داس تھا۔ پنڈت کا مطلب ہے کہ وہ برہمن تھا اور برہمن تو مسلمانوں کے جانی دشمن ہوا کرتے تھے اور اب بھی وہ مسلمانوں کے جانی دشمن ہیں۔ شنکر داس سے ہم نے اپنا تعارف کرایا اور اس کیس کی فائل مانگی۔ فائل دیکھی تو پتہ چلا کہ مقتولہ کا نام مارتھا ولیم تھا اور وہ مسلمان ہو کر روبینہ مریم بن گئی تھی۔ شنکر داس نے مقتولہ کا سروس کارڈ بھی دکھایا جس پر مقتولہ کی فوٹو بھی تھی۔ فوٹو سے پتہ چلتا تھا کہ وہ صرف خوبصورت نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ ہم نے فائل میں لکھی ہوئی کار گزاری اور روزنامچے پڑھنے شروع کر دیئے۔ یہ اردو میں لکھے ہوئے تھے اس لیے میں پڑھ پڑھ کر انسپکٹر کلارک کو سناتا جا رہا تھا۔ انسپکٹر کلارک اردو پڑھ نہیں سکتا تھا۔ پڑھنے کے دوران ہم شنکر داس سے کچھ باتیں پوچھتے بھی جاتے تھے۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ ہماری بات کا وہ جو بھی جواب دیتا ہے وہ تسلی بخش جواب نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعض جواب اناڑیوں جیسے تھے، مثلاً میں نے پوچھا کہ اس نے مقتولہ کے منگیتر کو شاملِ تفتیش کیوں نہیں کیا؟

''وہ تو مقتولہ کے باپ کے ساتھ رپورٹ لکھوانے آیا تھا''۔۔۔ شنکر داس نے جواب دیا۔

''فضول بات مت بولو''۔۔۔ انسپکٹر کلارک نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔۔۔ ''جو رپورٹ لکھوانے آتا وہ قاتل بھی ہو سکتا ہم تم کو ایسا بہت کیس سنا سکتا ہے کہ ایف آئی آر لکھوانے والا بعد میں خود قاتل نکلا''۔

ہمیں جلد ہی پتہ چل گیا کہ پنڈت شنکر داس دانستہ اناڑی بنا ہوا ہے اور اس نے تفتیش میں خاصی گڑبڑ کی ہے۔ ہمارے کہنے پر اس نے واردات کی تفصیلات سنائی۔

پندرہ سولہ روز پہلے سوموار کی صبح گھوڑوں کی ریس کے کلب سے تھانے فون آیا کہ ریس کورس میں ایک بوری میں بند لاش ملی ہے۔ شنکر داس سٹاف کے کچھ آدمی ساتھ لے کر

وہاں گیا۔ بوری بند لاش ریس کورس کے میدان میں پڑی ہوئی تھی۔ گھوڑ دوڑ کے اس میدان میں ایک طرف تو کلب کے دفتر کی بلڈنگ تھی اور تماشائیوں کے بیٹھنے کے لیے انتظامات تھے اور اس کے بالمقابل میدان کے چاروں طرف موٹی لکڑی کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ لاش اس طرف پھینکی گئی تھی۔

اس طرف ویرانہ تھا یعنی ادھر کوئی بلڈنگ یا کوئی چھوٹا موٹا مکان بھی نہیں تھا۔ لکڑی کے جنگلے سے باہر زمین کا نام ونشان نہ تھا۔ کچی دھول والی زمین تھی اور ایک دوسرے سے دور دور درخت کھڑے تھے۔ لاش جنگلے کے اندر پھینکی گئی تھی۔

زمین ایسی تھی کہ اس پر کھرے بڑے صاف نظر آتے لیکن تماشائیوں نے سارے کھرے مٹا ڈالے تھے۔ لاش بوری میں بند تھی۔ علی الصبح کوئی ادھر سے گزرا تو دیکھا کہ تین، چار کتے ایک بوری کو پھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور آپس میں لڑ بھی رہے تھے۔ اس شخص نے یا کسی اور نے دیکھ لیا کہ اس بوری میں لاش معلوم ہوتی ہے۔ کتوں کو بھگا کر اور قریب جا کر دیکھا تو وہ لاش ہی معلوم ہوتی تھی۔ دیکھنے والوں نے اسے کھولا نہیں۔

ان آدمیوں نے ریس کورس کلب میں جا کر بتایا تو وہاں سے کلب کے کسی ملازم نے تھانے فون کیا۔ شنکر داس نے جا کر بوری کھلوائی تو اس میں ایک جواں سال عورت کی دوہری کی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی۔

لاش اکڑ گئی تھی اس لئے اسے سیدھا نہ کیا جا سکا۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ تو جواں سال لڑکی تھی۔ اس نے بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کمر سے نیچے برہنہ تھی۔ اس کا لمبا سکرٹ جسے فل سکرٹ کہتے ہیں، بوری میں سے برآمد ہوا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ قتل سے پہلے اس کی آبروریزی کی گئی ہے۔ بوری میں سے مقتولہ کا پرس بھی آمد ہوا۔ پرس میں سے اس کا شناختی کارڈ جسے سروس کارڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔ برآمد ہوا۔ اس سے یہ پتہ چل گیا کہ مقتولہ ایئر ہیڈ کوارٹر میں ملازم تھی۔ کارڈ پر اس کے گھر کا ایڈریس نہیں تھا اور ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔

پرس میں سے ایک خوبرو جواں سال آدمی کا فوٹو برآمد ہوا جس کے پیچھے لکھا ہوا تھا فلائٹ لیفٹیننٹ ایم اے امجد تھانے کی فائل میں بھی یہ نام لکھا ہوا تھا۔ اس شخص کو شنکر داس نے شاملِ تفتیش کیا تھا اور تین دن تھانے میں ہی رکھا تھا۔ انسپکٹر کلارک نے تھانے میں شنکر داس سے پوچھا تھا کہ اس امجد کو کیوں شاملِ تفتیش کیا تھا؟

''مجھے اس پر شک تھا''۔۔۔ شنکر داس نے جواب دیا تھا۔۔۔ ''اسی نے مقتولہ کو مسلمان کیا ہوگا اور پھر مقتولہ واپس اپنے مذہب عیسائیت میں آنا چاہتی ہوگی اور اس امجد نے اسے قتل کروایا کر دیا ہوگا''۔

شنکر داس بڑی ہی غلط بات کہہ رہا تھا۔ ہم نے مقتولہ کا سروس کارڈ دیکھا تو اس پر اس کا نام روبینہ مریم لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہو چکی تھی اور اس نے اپنے کارڈ میں بھی اپنا نام تبدیل کروالیا تھا۔ یہ ہمیں ایئر ہیڈ کوارٹر میں پولیس کے ونگ کمانڈر نے بتا دیا تھا کہ فلائٹ لیفٹیننٹ امجد کو ایئر فورس پولیس نے تھانے سے رہائی دلوائی تھی۔

وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی

لاش کی تفصیلات یہ تھیں کہ مقتولہ کے سر میں دائیں کنپٹی سے گولی ماری گئی جو بائیں طرف سے نکل گئی تھی۔ یہ اعشاریہ 22 پستول کی گولی تھی۔ بالوں میں خون جما ہوا تھا اور بال جڑ گئے تھے۔ بلاؤز بھی خون سے بھرا ہوا تھا۔ جسم پر بھی خون تھا لیکن بوری کے ساتھ خون نہیں تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ مقتولہ کو کہیں اور گولی ماری گئی اور پھر اسے بوری میں بند کر کے ریس کورس کے میدان میں پھینک گئے۔ پوسٹمارٹم رپورٹ میں آبروریزی صاف لکھی تھی اور موت کا وقت ساڑھے دس اور گیارہ بجے رات کے درمیان لکھا گیا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ قتل کا باعث آبروریزی ہی ہو سکتا ہے۔ مقتولہ کے ساتھ یہ جرم جبری طور پر کیا گیا ہوگا اور مجرم نے قتل کر دینا مناسب سمجھا ہوگا۔

انسپکٹر کلارک نے اس شک کا اظہار کیا کہ مقتولہ کے ساتھ جبری زیادتی نہیں ہوئی، یہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ پکڑی گئی اور پکڑنے والا اس کا منگیتر ہوگا یا کوئی دوست۔ اس نے فوری اشتعال میں آ کر اسے گولی مار دی۔

میں نے کلارک کے ساتھ اتفاق نہ کیا کیونکہ مقتولہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھی اور ان دنوں جو ماحول بنا ہوا تھا اس میں عورت کے معاملے میں اتنا جذباتی کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ویکائیوں کی دوستیاں لگتی اور ٹوٹتی رہتی تھیں۔ ''تم نہیں اور سہی'' والی دوستیاں چلتی تھیں۔ ایک لڑکی کے ایک سے زیادہ دوست ہوا کرتے تھے۔ سب سے اچھا دوست وہ ہوتا تھا جو

سب سے زیادہ عیش کرواتا تھا یا زیادہ قیمتی تحفے دیتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ شنکر داس نے ایئر ہیڈ کوارٹر کو فون کیا کہ فلاں نامی لڑکی کی لاش فلاں جگہ سے ملی ہے اور اس کے گھر والوں کو اطلاع دی جائے۔ تھانے کی اس اطلاع پر ایئر فورس پولیس کا ایک افسر اور دو سارجنٹ تھانے پہنچ گئے۔ جس شعبے میں مقتولہ کام کرتی تھی وہاں اس کے گھر کا ایڈریس تو تھا لیکن اس کے گھر فون نہیں تھا۔ کسی کو وہاں مقتولہ کے منگیتر کے دفتر کا فون نمبر معلوم تھا۔ اس نے منگیتر کو اطلاع دی اور منگیتر مقتولہ کے گھر دوڑا گیا۔ وہاں یہ خبر سنائی۔ اس طرح مقتولہ کا باپ، ماں اور منگیتر تھانے پہنچ گئے۔

ان لوگوں نے لاش اس وقت دیکھی جب پوسٹ مارٹم کے بعد تھانے واپس گئی تھی۔ اگر مقتولہ کے ماں باپ لاش کو پوسٹ مارٹم سے پہلے دیکھ لیتے تو وہ بے ہوش ہو جاتے کیونکہ لاش کو لہوں سے دوہری کی ہوئی تھی یعنی لاش کی ٹانگیں اوپر والے دھڑ کے ساتھ ملی ہوئیں اور پاؤں سر کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ نیچے سے لاش برہنہ تھی۔ پوسٹ مارٹم میں ڈاکٹر نے ٹانگیں کولہوں سے کاٹ کر سیدھی رکھ دی تھیں اور اوپر چادر ڈال دی تھی۔ اس طرح لگتا تھا جیسے مقتولہ کی جسمانی پوزیشن قدرتی ہو۔ یہ پتہ چلتا ہی نہیں تھا کہ لاش دو ٹکڑوں میں کاٹی ہوئی ہے۔

انہوں نے لاش شناخت کر لی۔ باپ نے سب انسپکٹر شنکر داس کو بتایا کہ اس کی بیٹی کا اصل نام تو مارتھا تھا، مارتھا ولیم، لیکن بارہ چودہ روز پہلے وہ مسلمان ہو گئی تھی اور اس نے اپنا نام روبینہ مریم رکھ لیا تھا۔

باپ نے یہ بھی بتایا کہ مارتھا گھر نہیں رہتی تھی بلکہ اس نے اپنی رہائش ویکائیوں کی بارک میں رکھی ہوئی تھی، ہفتے کی شام گھر آتی اور اتوار کی شام چلی جاتی تھی۔ اس ہفتے کی شام بھی وہ آئی تھی اور اتوار کی شام چلی گئی تھی۔ وہ یعنی باپ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی بیٹی اپنے ٹھکانے پر پہنچی ہی نہیں ہوگی۔ اگلے روز یعنی سوموار کے دن جس دن وہ تھانے میں یہ بیان دے رہا تھا، اس کی بیٹی کا منگیتر سخت گھبراہٹ کی کیفیت میں اس کے گھر آیا اور بتایا کہ مارتھا کی لاش تھانے پڑی ہے اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس اطلاع پر باپ تھانے پہنچ گیا۔

یہ کہانی پڑھتے وقت یہ خیال رکھیں کہ مقتولہ کا باپ یا کوئی بھی عیسائی اس کے متعلق

کوئی بات بتاتا یا بیان کرتا تو اسے وہ مارتھا کہتا تھا لیکن میں اسے روبینہ ہی لکھوں گا۔ ایف آئی آر میں بھی اس کا نام مارتھا ولیم لکھوایا گیا تھا۔ میں نے اس کا سروس کارڈ یا شناختی کارڈ دیکھا تھا جس پر اس کا نام روبینہ مریم لکھا ہوا تھا۔ اس طرح یہ اس کا سرکاری نام بن گیا تھا اور میں چونکہ مسلمان تھا اور پہلے بھی تفتیش کے دوران جہاں بھی اس کا نام لکھتا یا بولنا پڑتا تو میں روبینہ ہی لکھتا اور بولتا رہا تھا۔

یہ تو ہوئی واردات کی وہ تفصیل جو ہمیں سب انسپکٹر پنڈت شنکر داس نے سنائی تھی۔ میں نے اور انسپکٹر کلارک نے تفتیش از سرِ نو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ واردات کو پندرہ سولہ دن گزر گئے تھے۔ ہم نے شنکر داس سے کہا کہ مقتولہ کے باپ اور منگیتر کو کل صبح سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں بھیج دے۔ ہم تھانے سے نکلے تو چار بج چکے تھے۔ انسپکٹر کلارک نے کہا کہ اس وقت تمام ویکائیاں اپنی بارک میں ہوں گی، بہتر ہے وہاں سے مقتولہ کے متعلق کچھ معلومات لے لی جائیں۔

تجویز اچھی تھی، ہم وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جیپ میں بیٹھے اور وہاں جا پہنچے۔ میں جسے بارک کہہ رہا ہوں اسے فوجی زبان میں DOMESTIC CAMP کہا جاتا تھا۔ وہاں جا کر دیکھا، ارد گرد دیوار تھی اور اس کے اندر ایک دوسری سے دور دور تین بارکیں اور ایک قطار کمروں کی تھی، وسیع لان، ٹینس کورٹ اور بیڈمنٹن کورٹ بھی بنے ہوئے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ قریب ہی ایک بنگلے میں ایک انگریز عورت رہتی ہے جس کا رینک لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ کیمپ کے اندر جانے کے لیے اس عورت کی اجازت ضروری تھی۔

ہم اس بنگلے میں چلے گئے۔ انگریز لیفٹیننٹ کرنل نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا اور جب ہم نے اپنا تعارف کرایا تو وہ اور زیادہ عزت و احترام سے پیش آئی۔

''میں اس لڑکی کے قاتل کو پھانسی کے رسے سے لٹکتا دیکھنا چاہتی ہوں''۔۔۔ اس لیفٹیننٹ کرنل نے کہا۔۔۔ ''بڑی پیاری اور اپنے کام میں ماہر لڑکی تھی۔ میں مارتھا کو کبھی نہیں بھول سکوں گی''۔

میں نے انگریز عورت کا ذہن پڑھنے کے لیے کہا کہ سنا ہے مقتولہ مسلمان ہو گئی تھی!

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''ہمیں کسی کے مذہب سے

ساتھ کوئی دلچسپی اور کوئی عناد نہیں۔ ہم انسان کو کسی اور پیمانے سے ناپا کرتے ہیں۔ میں نے اسے مارتھا اس لیے کہا ہے کہ وہ اسی نام سے جانی پہچانی جاتی تھی''۔

''کیا آپ ہمیں اس کے متعلق کوئی ایسی بات بتا سکتی ہیں جس سے ہمیں کچھ سراغ مل جائے؟''۔۔۔ انسپکٹر کلارک نے پوچھا۔

''میں اس کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی''۔۔۔ اس انگریز عورت نے جواب دیا۔۔۔ ''میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں، کیمپ میں اس کی قریبی دو تین دوستوں کو آپ کے پاس بٹھا دوں گی، انہیں جو کچھ معلوم ہوا آپ کو بتا دیں گی''۔

''آپ کے ذہن میں کوئی شک تو آیا ہوگا!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کے ذہن میں ایسا شک آیا تھا کہ قتل کا باعث مقتولہ کے مذہب کی تبدیلی ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ مقتولہ کا منگیتر بھی تھا۔ کوئی شخص اپنی اتنی خوبصورت منگیتر سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس منگیتر پر شک کیا جا سکتا ہے اور کوئی اور انتہا پسند عیسائی بھی قاتل ہو سکتا ہے''۔

ہم نے محسوس کر لیا کہ اس لیفٹیننٹ کرنل کے پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ ہمیں ویکائیوں کے کیمپ میں لے گئی اور وہاں ایک لیفٹیننٹ عورت سے ملوایا اور ہمارا تعارف کروایا۔ ہم نے اسے کہا کہ مقتولہ کی جو قریبی اور رازدان دوست تھیں وہ ہمارے پاس بھیج دی جائیں۔

لیفٹیننٹ کرنل چلی گئی اور کیمپ کی لیفٹیننٹ ہمیں دفتر کے ایک کمرے میں بٹھا کر نکل گئی۔ میں اور انسپکٹر کلارک آپس میں صلاح و مشورہ کرنے لگے کہ تفتیش کا آئندہ پروگرام کیا ہو اور کس کس کو شاملِ تفتیش کیا جائے..... ہماری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ لیفٹیننٹ تین لڑکیوں کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے ہمیں بتایا کہ یہ مقتولہ کی بہت ہی قریبی دوست تھیں۔ ہم نے لیفٹیننٹ کو جانے کے لیے کہا اور ان تینوں کو اکٹھے ہی اپنے پاس بٹھا لیا۔

ان سے ان کے نام پوچھے تو پتہ چلا کہ دو ہندو ہیں اور ایک عیسائی ہے۔ انسپکٹر کلارک نے مجھے اشارہ کیا کہ میں ان سے بات شروع کروں۔ میں نے سب سے پہلے تو ان سے یہ پوچھا کہ ان کی مقتولہ کے ساتھ دوستی کس حد تک تھی۔ تینوں نے باری باری

اپنا اپنا جواب دیا جو ایک ہی جیسا تھا اور وہ یہ تھا کہ ان کی آپس میں گہری رازداری تھی کہ دل کی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپاتی نہیں تھیں۔

''پھر تو تم تینوں کو اس کے مرنے کا بہت ہی دکھ ہوگا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اور تم یقیناً چاہتی ہوگی کہ اس کے قاتل کو بڑی جلدی پکڑ کر پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا جائے''۔

میری یہ بات سن کر دو لڑکیوں کے تو آنسو نکل آئے اور تیسری نے سر جھکا لیا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ قاتل کو پکڑ کر ان کے حوالے کیا جائے اور وہ اپنے ہاتھوں اسے اذیتیں دے دے کر مارے۔

''تو پھر ہمیں مقتولہ کی چھوٹی چھوٹی سی بات بھی بتائیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کچھ چھپائیں نہیں ورنہ ہم کسی سراغ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور قاتل آزاد گھومتا پھرتا رہے گا''۔

یہ تینوں روشن خیال لڑکیاں تھیں۔ روشن خیالی کوئی بری بات نہیں ہوتی، مجھے کہنا یہ چاہئے کہ یہ بالکل ہی آزاد لڑکیاں تھیں۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ جو لڑکیاں اس زنانہ فورس میں بھرتی ہوئیں اور ویکائیاں بنی تھیں، وہ خاصی بدنام ہوتی تھیں۔ ان میں شاید ہی کوئی کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہو یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ یہ زنانہ فورس افسروں کی تفریحِ طبع کے لیے بنائی گئی تھی۔ اگر یہ بات غلط تھی تو ان لڑکیوں نے خود ہی ایسی پرائیویٹ زندگی اختیار کر لی تھی کہ افسروں اور من پسند آدمیوں کی تفریح کا ذریعہ بنتی تھیں جسے عام زبان میں یوں کہہ لیں کہ عیش موج کرتی تھیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

ان تینوں لڑکیوں نے ہمیں بہت کچھ بتایا۔ اس دوران کئی ایک سوال میں نے کیے اور کئی باتیں انسپکٹر کلارک نے پوچھیں اور اس طرح مقتولہ کی ایک واضح تصویر ہمارے سامنے آ گئی۔

میں مقتولہ کی یہ تصویر پیش کرتا ہوں۔ وہ زندہ دل اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ ہنسی مذاق کو زیادہ پسند کرتی تھی اور ہنسی مذاق کا سلیقہ بھی اسے آتا تھا۔ رومان پسند بھی تھی لیکن زیادہ دوستیاں لگانا اسے پسند نہیں تھا۔

''ایک بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے''۔۔۔ ان میں سے ایک لڑکی نے کہا۔۔۔ ''ہم جب باہر نکلتی ہیں یا کوئی بھی ویکائی باہر نکلتی ہے دل پھینک عاشق ہمیں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی پکچر لے جانا چاہتا ہے، کوئی ہوٹل میں کھانے کی دعوت دیتا ہے اور کوئی

دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور کوئی سچے پیار کا جھانسہ دیتا ہے۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ویکائی کسی آدمی کو پسند کر کے اس کے ساتھ چل پڑتی ہے اور کھا پی کر اور عیش وعشرت کر کے واپس آجاتی ہے۔ ایک ویکائی جانتی ہے کہ سچے دل سے ان کا کوئی دوست نہیں یا یہ سب وقتی چکر ہیں لیکن مارتھا اس طرح کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ چونکہ وہ خاصی خوبصورت اور پُرکشش تھی اس لیے اسے زیادہ امیدوار ملتے تھے اور وہ ہر کسی کو ہنس کر ٹال دیتی تھی"۔

یہاں میں ایک وضاحت کرنا چاہوں گا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ ان دنوں کوئی اتنا جذباتی نہیں ہوا کرتا تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ دوستی پکی کر لے، دوستیاں لگتی تھیں اور ٹوٹتی تھیں اور یہ ایک معمول تھا اور سب سے پیار و محبت عارضی ہوتا تھا۔ میں نے یہ بات صرف ویکائیوں کے متعلق کہی ہے۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان دنوں معاشرے میں اتنی بے حیائی اور آزادی آگئی تھی۔ معاشرے میں آج والی آزادی اور بے حیائی نہیں تھی۔

پھر ان لڑکیوں نے بتایا کہ مقتولہ سٹینوگرافر تھی۔ ایئر ہیڈ کوارٹر کے اس شعبے کا ڈائریکٹر ایک انگریز سکواڈرن لیڈر تھا۔ اس نے مقتولہ کو اپنی پی اے بھی بنا رکھا تھا۔ مقتولہ نے ان دوستوں سے یہ بات بالکل ہی نہیں چھپائی تھی کہ یہ سکواڈرن لیڈر اسے اپنی تفریح کے لیے بھی استعمال کیا کرتا تھا۔ مقتولہ نے یہ بات شکایت کے رنگ میں نہیں بتائی تھی بلکہ کچھ خوش تھی کہ اس کا افسر اس پر اتنا مہربان ہے۔ لڑکیوں نے بتایا کہ مقتولہ اتنی خوبصورت تھی کہ انگریز اپنی میموں سے نظریں پھیر لیتے تھے۔ یہ سکواڈرن لیڈر مقتولہ کے ساتھ دفتر میں بھی پیار و محبت کی حرکتیں کر لیا کرتا تھا اور کبھی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر بھی لے جایا کرتا تھا۔ اس سکواڈرن لیڈر کے بیوی بچے انگلینڈ میں تھے۔

ہم نے جو بات واضح طور پر پوچھی تھی وہ ان لڑکیوں نے یقینی انداز میں بتائی۔ وہ یہ تھی کہ مقتولہ ایسے چال چلن کی نہیں تھی کہ کچھ عرصہ ایک کو دوست بنائے رکھتی اور پھر اسے چھوڑ کر کسی اور کی دوستی میں الجھ جاتی۔ اس میں کچھ وقار ضرور تھا اور وہ شاید اپنی قدر و قیمت جانتی تھی۔ وہ اکثر ان مردوں کا مذاق اُڑایا کرتی تھی جو عورتوں کے پیچھے گھوم پھر کر زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے ڈائریکٹر سکواڈرن لیڈر کے متعلق اس نے اپنے آپ کو ایسی خوش فہمی میں مبتلا کیا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہ انگریز سچی محبت کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ

جگہ آجائے تو وہ اس کے ساتھ بھی ایسی ہی حرکتیں اور ایسا ہی رویہ اختیار کر لے گا۔

پہلی بار روحانی محبت کا ذائقہ چکھا لیکن.....

ہم ان لڑکیوں کو مقتولہ کے منگیتر کی طرف لے آئے۔ یہ تو ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ مقتولہ کے خیالات، انداز اور اس کی سوچیں کیا تھیں اور وہ کس قسم کے اخلاق اور چال چلن کی لڑکی تھی۔ اس کی عمر ابھی تئیس چوبیس سال ہی ہوئی تھی۔

منگیتر کی بات آئی تو لڑکیوں نے بتایا کہ دلی محبت کرنے والی بات تھی۔ قتل سے آٹھ نو مہینے پہلے مقتولہ کی دوستی اس جواں سال آدمی کے ساتھ ہوگئی تھی۔ یہ بھی عیسائی تھا۔ میری ڈائری میں اس کا نام نہیں لکھا ہوا اور میں نام بھول چکا ہوں اس لیے اس کا فرضی نام ولسن لکھ دیتا ہوں۔ ولسن کی مقتولہ کے ساتھ دوستی کے متعلق ان لڑکیوں نے بتایا کہ تیسرے چوتھے روز شام کے وقت ولسن یہاں آیا کرتا تھا۔ وہ کسی بڑی پرائیویٹ فرم میں سیلز منیجر یا کسی ایسے ہی رتبے کا آدمی تھا۔ اس نوکری میں اسے زیادہ تر گھومنا پھرنا پڑتا تھا اور اس کی سواری موٹر سائیکل تھا جو اسے غالباً کمپنی نے دے رکھا تھا۔

لڑکیوں نے یہ بھی بتایا کہ بڑا اچھا موٹر سائیکل تھا اور یہ TRIUMPH تھا.....

میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس دور کے موٹر سائیکل آج کل کے موٹر سائیکلوں سے بالکل ہی مختلف تھے۔ آج کل موٹر سائیکل کے انجن کی طاقت CC کے پیمانے سے سمجھی جاتی ہے، اس دور میں موٹر سائیکل کی طاقت ہارس پاور کے حساب سے ہوتی تھی۔ مثلاً یہی موٹر سائیکل تین ہارس پاور کا بھی ہوتا تھا، چار کا اور پانچ ہارس پاور کا بھی۔ ان کی آواز پھٹ پھٹ جیسی ہوتی تھی اس لیے لوگ موٹر سائیکل کم ہی کہتے بلکہ اسے پھٹ پھٹا کہتے تھے۔ اس دور میں عام لوگوں کے پاس کاریں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ موٹر سائیکل بھی کسی بڑے ہی امیر آدمی کے پاس ہوتا تھا۔

ولسن آتا اور مقتولہ کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر ساتھ لے جاتا تھا۔ مقتولہ نے ان تینوں دوستوں کو بتایا تھا کہ یہ سچی محبت ہے اور اسے وہ کورٹ شپ سمجھیں۔ مقتولہ بہت خوش تھی کہ اسے ایسا دوست مل گیا ہے جس کی دوستی کا تعلق جسم کے ساتھ نہیں بلکہ دل کے ساتھ ہے۔ تقریباً چار مہینوں بعد مقتولہ نے بڑی خوشی سے اپنی ان دوستوں کو خوشخبری سنائی کہ

ولسن کے ساتھ اس کی باقاعدہ منگنی ہوگئی ہے اور کچھ عرصے بعد شادی ہو جائے گی۔

دو اڑھائی مہینے گزرے تو مقتولہ کچھ اداس سی نظر آنے لگی۔ ان دوستوں نے اس سے پوچھا تو پہلے وہ ٹالتی رہی آخر ایک روز اس نے انہیں بتایا کہ اس منگیتر کو صرف اس لیے پسند کرتی تھی کہ اس کی نظر اس کے جسم پر نہیں تھی اور وہ پاک محبت کا قائل تھا لیکن وہ محبت کو اسی مقام پر لے آیا ہے جس مقام پر عام لوگ ہمیں لانے کی کوشش کیا کرتے ہیں اور ہم پر روپیہ پیسہ بھی خرچ کرتے ہیں۔

مقتولہ نے منگیتر سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ایسی دوستی نہیں چاہتی اور جسموں کا ملاپ شادی کے بعد ہی ہوگا لیکن ولسن اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ منگنی ہو جانے کا بھی مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ میاں بیوی بن گئے ہیں۔ میں مقتولہ کی یہ بات سن کر کچھ حیران ہوا کہ ایسے مادر پدر آزاد ماحول میں مقتولہ ایسے پاک کردار کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

میں نے بے ساختہ مقتولہ کے اس کردار کی تعریف کر ڈالی لیکن اس کی جو سہیلی عیسائی تھی اس نے کہا کہ وہ اتنے پاک کردار والی بھی نہیں تھی۔ اپنے شعبے کے ڈائریکٹر انگریز سکواڈرن لیڈر کے ساتھ اس کے تعلقات ناجائز بھی رہے تھے۔ اس نے کبھی شکایت یا افسوس کے رنگ میں یہ بات نہیں کی تھی کہ ایسا کرنے پر مجبور ہے بلکہ وہ بڑی خوشی سے سناتی تھی کہ اپنے افسر کو اس نے اپنی مٹھی میں رکھا ہوا ہے، البتہ اپنے منگیتر کے معاملے میں وہ بڑی بااصول نکلی۔ بڑی سنجیدگی سے کہا کرتی تھی کہ منگنی ہوئی ہے تو باقاعدہ گرجے میں شادی کر کے ہی میاں بیوی والا کھیل کھیلیں گے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا مقتولہ نے منگیتر ولسن سے بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔ وہ آتا تھا تو اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر چلی جاتی تھی لیکن اب وہ واپس آ کر پہلے کی طرح خوش نہیں ہوتی تھی۔ ان دوست لڑکیوں نے اسے کہا کہ وہ منگیتر سے خوش نہیں تو منگنی منسوخ کرا دے لیکن وہ کہتی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔

ان لڑکیوں نے بتایا کہ مقتولہ پر روز بروز سنجیدگی طاری ہوتی جا رہی تھی اور وہ چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔ اتنی خوش طبع اور ہر وقت ہنسی مذاق کے موڈ میں رہنے والی لڑکی میں یہ تبدیلی ان دوستوں کے لیے تکلیف دہ سی ہوتی گئی۔ منگیتر کا یہ غلط مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

آخر ایک روز اس نے کہا کہ وہ منگنی منسوخ کرانے کی سوچ رہی ہے۔ ان دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ منگنی توڑنے کی بجائے وہ شادی جلدی کر لے تاکہ منگیتر کی بے صبری ختم ہو جائے لیکن کوئی ایسی وجہ تھی کہ منگیتر ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ مقتولہ اسے دھوکہ سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ ولسن اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا بلکہ ناجائز تعلقات رکھنا چاہتا ہے۔

ایک رات وہ ولسن کے ساتھ جا کر واپس آئی تو بستر پر گر پڑی اور بہت روئی۔ ان تینوں لڑکیوں میں سے ایک وہیں تھی۔ وہ پریشان ہوگئی اور مقتولہ سے پوچھا کہ آج کیا نئی واردات ہوگئی ہے۔ مقتولہ نے بتایا کہ ولسن کے ساتھ اس کی اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی ہے جسے وہ لڑائی جھگڑا کہتی تھی۔ اس دوست نے اسے یہی مشورہ دیا کہ منگیتر کی فرمائش پوری کرے یا منگنی توڑ دے۔

مقتولہ دراصل یہ صدمہ لیے بیٹھی تھی کہ اس نے پہلی بار دلی یار روحانی محبت کا ذائقہ چکھا تھا اور اسے کچھ اور ہی لذت اور سکون ملا تھا۔ ولسن اس روحانی سکون کو تباہ کر رہا تھا۔ مقتولہ نے یہاں تک کہا کہ ولسن اگر شادی کی خواہش کی بجائے ناجائز دوستی کی خواہش کرتا تو وہ شاید اسے قبول کر لیتی لیکن وہ اتنی پاک اور پیاری محبت کا خون کرنے سے گھبرا رہی تھی۔

''کیوں ملک!'' — انسپکٹر کلارک نے مجھ سے کہا — ''میرا تو خیال ہے کہ مقتولہ نارمل ذہنی حالت والی لڑکی نہیں تھی یا وہ اپنی ان دوستوں کو غلط باتیں بتاتی رہی ہے''۔

تینوں لڑکیوں نے باری باری کہا کہ مقتولہ کوئی غلط بات نہیں بتاتی تھی۔ ان کی بے تکلفی اور رازداری ایسی تھی کہ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھیں۔ میں نے انسپکٹر کلارک سے اتنا کہا کہ اس کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور میں خود بھی حیران ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ جسے ہدایت دے کر راہِ راست پر لانا چاہتا ہے اس کے دماغ میں ایک روشنی ڈال دیتا ہے۔ مقتولہ نیک اور بد کی تمیز رکھتی تھی۔

میں نے ان لڑکیوں سے پوچھا، کیا مقتولہ ولسن کے سوا کسی اور کو نہیں ملتی تھی؟..... لڑکیوں نے بتایا کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ بڑی سوشل اور ملنسار لڑکی تھی۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس نے اپنی پرائیویٹ زندگی ولسن تک ہی محدود کر لی ہو۔ اکثر شام کو باہر چلی جاتی تھی اور کبھی

رات ذرا دیر سے بھی واپس آتی تھی۔ مثلاً اس نے ایک مسلمان فلائٹ لیفٹیننٹ امجد کے ساتھ آنا جانا شروع کر دیا تھا۔

یہ وہی امجد تھا جس کی فوٹو مقتولہ کے پرس سے نکلی تھی۔ اس کے بعد مقتولہ کا یہ معمول بن گیا کہ کبھی شام امجد کے ساتھ گزاتی اور کبھی ولسن کے ساتھ لیکن مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے مقتولہ میں ایسی کوئی تبدیلی آ گئی تھی کہ وہ زیادہ تر سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ امجد کے متعلق مقتولہ نے اپنی دوستوں کو اتنا ہی بتایا تھا کہ اچھا آدمی ہے، اس کی عادات اچھی ہیں اور اخلاقی لحاظ سے گندہ آدمی نہیں۔ لڑکیاں مقتولہ سے پوچھتی رہتی تھیں کہ امجد کی دوستی محبت والی ہے یا وقت گزارنے والی لیکن مقتولہ اس کا کوئی صاف جواب نہیں دیتی تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرتے، پوچھتے اور ان سے صحیح جواب سنتے ہمیں ذرا سی بھی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ با اخلاق اور شریفانہ گھرانوں کی کسی عورت سے کسی مرد کے ساتھ تعلقات کی بات معلوم کرنا یا کسی مرد اور عورت کے تعلقات کی باتیں پوچھنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتا تھا لیکن ان لڑکیوں میں اتنی بے باکی تھی جو بے حیائی کی حد تک پہنچ رہی تھی۔ کئی باتیں تو وہ بغیر پوچھے اگل دیتی تھیں۔ ناجائز دوستی کی در پردہ باتیں بھی کھل کر ہمیں بتا رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ آزاد ماحول کی لڑکیاں تھیں دوسری وجہ یہ کہ میرے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر تھا۔ لڑکیاں اس انگریز پر یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ بھی انگریزوں سے کم نہیں۔ تینوں لڑکیاں انگریزی بڑی اچھی بولتی تھیں۔

لڑکیاں ہمارے اس سوال کا جواب نہ دے سکیں کہ جب مقتولہ کی دوستی امجد کے ساتھ شروع ہوئی تو ولسن کا ردِعمل کیا تھا۔ مقتولہ نے اپنی ان دوستوں کو اس دوستی کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس سلسلے میں لڑکیوں کے ساتھ جو باتیں ہوئیں ان سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مقتولہ اب اپنی پرائیویٹ زندگی کی باتیں اپنی دوستوں سے کرنے میں محتاط ہو گئی تھی۔ یہ تو لڑکیوں نے صاف بتایا کہ مقتولہ زیادہ سنجیدہ رہنے لگی تھی۔

ایک روز مقتولہ نے اچانک اپنی دوستوں کے درمیان یہ بم پھینکا کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے اور اب اس کا نام روبینہ مریم ہے۔ ان لڑکیوں نے یہ پرواہ کیے بغیر کہ میں مسلمان ہوں، اس خبر پر اپنا ردِعمل بے تکلفی سے بتایا۔ انہوں نے مقتولہ پر بہت زور دیا کہ وہ واپس اپنے مذہب میں آ جائے۔ مسلمانوں کے خلاف بہت باتیں کیں اور یہ بھی کہا کہ کسی مسلمان

کی بیوی بنے گی تو خاوند اسے پردے میں قید کر دے گا وغیرہ وغیرہ لیکن مقتولہ تہہ دل سے اسلام قبول کر چکی تھی اور اس نے لڑکیوں کو اپنا نیا سروس کارڈ دکھایا جو اس نے تبدیل کروا لیا تھا اور اس پر اس کا اسلامی نام لکھا ہوا تھا۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لڑکیوں نے بتایا کہ مقتولہ نے ان کے ساتھ دوستی ترک نہیں کی تھی لیکن ان تینوں کے دلوں میں اب اس کا پہلے والا پیار نہیں رہا تھا۔ مقتولہ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی پھر ایک روز ان لڑکیوں کو یہ خبر ملی کہ مقتولہ قتل ہو گئی ہے۔

ہم ویکائیوں سے رخصت ہوئے تو سات بج چکے تھے۔ ہماری پہلی کامیابی تھی کہ ہمیں یہاں سے بڑی قیمتی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ میں اور انسپکٹر کلارک اس نتیجے پر متفق تھے کہ ہمارا مشتبہ نمبر ایک مقتولہ کا منگیتر ولسن ہے۔ لڑکیوں کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ مقتولہ برائے نام مسلمان نہیں ہوئی تھی نہ ہی اس نے اپنے مسلمان دوست کو خوش کرنے کے لیے رسمی طور پر اسلام قبول کر لیا تھا بلکہ وہ مذہب کی اس تبدیلی میں بہت ہی سنجیدہ تھی۔

ہم نے ایک خاص بات نوٹ کر لی۔ وہ یہ کہ سب انسپکٹر شنکر داس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ مقتولہ کی دوستوں سے اس کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق کچھ معلوم کر لیتا جس طرح ہم نے کیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ شنکر داس تفتیش کو اپنی مرضی اور اپنے تعصب کے مطابق کسی اور طرف لے جا رہا تھا۔

پیار کی پیاس

اگلی صبح ہم اپنے آفس میں گئے تو مقتولہ کا باپ اور اس کا منگیتر آئے بیٹھے تھے۔ ہم پہلے باپ کو تفتیش والے کمرے میں لے گئے۔ قدرتی بات تھی کہ وہ بہت ہی مغموم تھا۔ اس سے ہم نے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کے دل میں کسی پر شک ہے کہ وہ اس کی بیٹی کا قاتل ہو سکتا ہے؟..... وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے سوچ میں کھویا رہا۔

''سوچ لیں، اچھی طرح سوچ کر جواب دیں'' — میں نے کہا — ''جو آپ کے ذہن میں بات آتی ہے، کہہ گزریں، ڈریں بالکل نہیں۔ ہمارا مقصد آپ کی بیٹی کے قاتل کو پکڑنا ہے۔ آپ کی بیٹی مسلمان ہو گئی تھی۔ اگر مسلمانوں کے خلاف دل میں کوئی بات آتی

ہے تو کہہ ڈالیں''۔

''جب بھی سوچتا ہوں بیٹی کے منگیتر کا نام ہی سامنے آتا ہے''۔۔۔باپ نے کہا۔۔۔ ''لیکن ایک مہربانی یہ کرنا کہ منگیتر سے تفتیش کرتے ہوئے میرا حوالہ نہ دینا۔ مجھے شک اسی پر ہے''۔

انسپکٹر کلارک نے اسے کہا کہ اس کے اس شک سے ہم متفق ہیں لیکن وہ وضاحت کرے کہ اسے اس شخص پر شک کیوں ہے۔ کیا اس نے کوئی ایسی باتیں کی تھیں؟

''جی ہاں، میں خود بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں''۔۔۔باپ نے کہا۔۔۔ ''قتل سے دس گیارہ روز پہلے ولسن نے میرے گھر آ کر بڑے غصے میں کہا تھا کہ مارتھا نے اسلام قبول کر لیا ہے اسے سمجھائیں کہ واپس اپنے مذہب میں آ جائے ورنہ میں کسی اور طریقے سے اسے سیدھے راستے پر لاؤں گا..... بیٹی نے ابھی مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ ولسن کو پہلے بتا دی۔ غصہ مجھے بھی آیا تھا اور افسوس بھی ہوا تھا لیکن ایک باپ کی حیثیت سے اسے سمجھانا چاہتا تھا۔ ولسن تو مرنے مارنے پر آیا ہوا تھا''۔

''ولسن کے ساتھ آپ کی بیٹی نے خوشی سے منگنی کی تھی؟''۔۔۔میں نے کہا۔۔۔ ''کیا اس کے بعد کبھی آپ کی بیٹی نے آپ سے کوئی ایسی بات کی تھی جیسے وہ ولسن کے ساتھ اب اتنی خوش نہیں جتنی منگنی کے وقت تھی؟''

''جی ہاں''۔۔۔باپ نے جواب دیا۔۔۔ ''منگنی کے خاصے عرصے بعد مارتھا نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ منگنی سے پہلے ولسن جیسا ہوا کرتا تھا اب ویسا نہیں رہا۔ اس کی ماں نے مجھے بتایا اور ایک بار مارتھا گھر آئی تو میں نے اور اس کی ماں نے الگ بٹھا کر اس سے پوچھا کہ وہ ولسن سے اتنی بیزار کیوں ہوتی جا رہی ہے؟..... مارتھا نے بڑے صاف الفاظ میں کہا کہ وہ ہے تو میرا منگیتر لیکن اب وہ میرے ساتھ غلط قسم کی دوستی لگانا چاہتا ہے۔ اس کی فرمائش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہوٹل میں کمرہ بک کروائے گا اور ایک دن رات وہاں گزاریں گے۔ مارتھا اس کی یہ فرمائش پوری نہیں کرتی تھی''۔

باپ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے جو باتیں سنائیں ان کا لبِ لباب یہ تھا کہ مقتولہ ولسن سے بالکل ہی بیزار ہو چکی تھی اور اس نے باپ کو بتایا تھا کہ ولسن اسے دھمکیاں دیتا ہے۔ باپ نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ولسن اسے یعنی باپ کو بھی دھمکیاں

دیتا تھا۔ باپ نے دو تین مرتبہ ولسن سے کہا کہ بہتر ہے وہ مارتھا سے منگنی توڑ لے لیکن وہ کہتا تھا کہ اس میں اس کی توہین ہے اور وہ مارتھا کو ایسا سبق سکھائے گا کہ باقی عمر یاد رکھے گی۔ مختصر یہ کہ دل میں مارتھا کی محبت کی جگہ دشمنی پیدا کر لی تھی۔

باپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک روز ولسن بڑے غصے میں آیا اور اسے کہا کہ مارتھا نے ایک مسلمان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا ہے، اسے سمجھائیں ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔

ہمارے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے باپ نے کہا کہ سچی بات ہے کہ ولسن اسے بھی برا لگنے لگا تھا اور وہ خود چاہتا تھا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی منگنی منسوخ ہو جائے۔ ہمارے کہنے پر اس نے زیادہ واضح کر کے کہا کہ ولسن کچھ اوچھی اور گھٹیا باتوں پر اتر آیا تھا۔ باپ کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولہ نے ایک مسلمان کے ساتھ دوستی کر لی ہے اور اس کے ساتھ ہوٹلوں میں بھی جاتی دیکھی گئی ہے اور باہر باغ میں اس کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ باپ نے اس کی کوئی خاص پرواہ نہیں کی تھی لیکن ولسن اسے کچھ زیادہ ہی پریشان کرنے لگا تھا۔

میں نے کہا کہ سنا ہے ولسن کا بڑا بھائی پولیس انسپکٹر ہے اور انبالہ میں ہے..... یہ سنتے ہی باپ نے کہا کہ اسے ولسن اس بھائی کا ڈراوا بھی دیتا رہتا تھا۔ ولسن کا خیال تھا کہ وہ کوئی سا بھی جرم کرے گا یا کسی پر ہاتھ اٹھائے گا تو اس کا بھائی اسے چھڑا لے گا۔ باپ نے یہ بھی بتایا کہ سب انسپکٹر شنکر داس کو بھی اس نے کہا کہ اسے ولسن پر شک ہے لیکن شنکر داس نے ولسن کو صرف ایک بار رسمی طور پر تھانے بلایا تھا۔ قتل کے تیسرے چوتھے روز ولسن کا یہ بھائی یہاں آیا تھا اور پتہ چلا کہ تھانے میں کچھ وقت گزار کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ولسن کو شنکر داس نے پوچھا تک نہیں۔

باپ نے ہمارے شک کی تائید کر دی۔ ہم نے اسے یہ یقین دلا دیا کہ اس کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوگی اور وہ ہر طرح محفوظ رہے گا اور اسے کوئی نئی بات معلوم ہو تو کسی بھی وقت ہمیں آ کر بتا دے۔ اس طرح اسے مطمئن کر کے باہر بھیج دیا اور ولسن کو اندر بلایا۔ وہ آیا تو ہم نے اسے بٹھا لیا۔

''مسٹر ولسن!''۔۔۔انسپکٹر کلارک نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر کہا۔۔۔ ''نہ اپنا

وقت ضائع کرو نہ ہمیں پریشان کرو، بڑے آرام سے کہہ دو کہ مقتولہ کو تم نے قتل کیا ہے"۔

"نہیں، نہیں!"— اس نے اٹھ کر بڑی تیزی سے کہا— "مجھ پر ایسا شک نہ کریں، میں مارتھا کو واپس اپنے مذہب میں لا رہا تھا"۔

"سنو ولسن!"— میں نے کہا— "بیٹھ جاؤ، ایسی خوش فہمی ذہن سے نکال دو کہ انبالہ سے تمہارا بھائی آ کر تمہیں چھڑا لے گا۔ یہ تھانہ نہیں، یہ وہ جگہ ہے جہاں پتھر بھی بول اٹھتے ہیں..... بول پڑو گے تو فائدے میں رہو گے اور اگر ہمیں بلوانا پڑا تو انتہائی سزا دلوائیں گے جس کو سزائے موت کہتے ہیں۔ تعاون کرو گے تو عمر قید بھی نہیں ہونے دیں گے۔ اب یہاں سے تم گھر نہیں جا سکو گے"۔

وہ رونے پر آ گیا، اقبال جرم کی طرف آتا ہی نہیں تھا۔ انسپکٹر کلارک نے اسے کہا کہ اس کے خلاف بڑی ٹھوس شہادت ہمارے پاس موجود ہے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ مقتولہ اس دنیا میں نہیں تو اسے وہ جو دھمکیاں دیتا رہا ہے وہ اس کے ساتھ قبر میں چلی گئی ہیں۔ بہت سے گواہ اور ٹھوس شہادت ثابت کرنے والے زندہ ہیں۔

یہ ایک لمبا اور صبر آزما عمل ہوتا ہے جس سے مشتبہ کو گزارا جاتا اور اقبال جرم تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ سارا عمل بیان کرنا ضروری نہیں ورنہ بات غیر دلچسپ حد تک طویل ہو جائے گی۔ ولسن نہیں مان رہا تھا۔ ہم نے ہر وہ بات اس کے سامنے رکھی جو مقتولہ کی دوست نے اور مقتولہ کے باپ نے ہمیں بتائی تھیں۔ ولسن ہر بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس کی زبان بری طرح ہکلا رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ بعض باتیں تو ایسی الجھی ہوئی تھیں جن کا کوئی مطلب ہی پلے نہیں پڑتا تھا۔

مختصر بات یہ کہ وہ اپنے انداز اور اوٹ پٹانگ باتوں اور حرکتوں سے اپنے خلاف شک پختہ کرتا چلا گیا۔

ہم دونوں انسپکٹروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے حوالات میں بند کر دیا جائے اور سوچنے کی مہلت دی جائے اور اگر پھر بھی یہ انکار پر قائم رہتا ہے تو دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ اسے ہم نے کہا کہ وہ ہمارا مہمان رہے گا اور سیل میں بیٹھ کر آرام سے سوچے اور اس کا جی چاہے ہمیں بتا دے اور اقبالی بیان دے دے۔ اگر تعاون نہیں کرے گا تو اسے اس عمل میں ڈال دیا جائے گا جس کی کہانیاں اس نے سنی ہوں گی اور اگر وہ یہاں مر بھی گیا

تو اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا۔ اس کی لاش غائب کر دی جائے گی۔

وہ تڑپتا، چیختا اور کچھ نہ کچھ بولتا رہا اور ہم اسے دھکیلتے گھسیٹتے ہوئے سیل میں بند کر آئے۔

میں نے مقتولہ کے باپ سے پوچھ گچھ سے پہلے ایئر ہیڈ کوارٹر فون کر دیا تھا کہ فلائٹ لیفٹیننٹ امجد کو ہمارے ہیڈ کوارٹر بھیج دیا جائے۔ وہ ایئر ہیڈ کوارٹر کے ہی ایک شعبے میں کام کرتا تھا۔ مقتولہ کے باپ اور ولسن سے فارغ ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ فلائٹ لیفٹیننٹ امجد ایک گھنٹے سے آیا بیٹھا ہے۔ ہم نے اسے تفتیش کے کمرے میں بلا لیا۔

بڑا خوبرو جوان تھا۔ پچیس سال سے کچھ اوپر عمر تھی۔ مجھے وہ اس لیے بھی اچھا لگا کہ اسی دوست نے مقتولہ کو مسلمان کیا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ کچھ ذاتی باتیں شروع کر دیں تاکہ وہ ہمارے ساتھ بے تکلف ہو جائے۔ وہ فائٹر پائلٹ تھا اور انڈین ایئر فورس کے ایک فائٹر سکواڈرن میں رہا تھا۔ اس وقت انڈین ایئر فورس رائل انڈین ایئر فورس کہلاتی تھی کیونکہ یہ انگریزوں کی ایئر فورس تھی۔ امجد فائٹر پائلٹ تھا لیکن ایک سال پہلے اسے نہ جانے کیا ہو گیا کہ جونہی جہاز زمین سے اٹھتا اور کچھ بلندی پر لے جاتا تو اس کا بلڈ پریشر گرنا شروع ہو جاتا تھا۔ چند مرتبہ تو بلڈ پریشر اتنا گر گیا کہ اسے چکر آنے لگے اور وہ ہوائی جہاز واپس اتار لایا اور ایک دو مرتبہ تو وہ لینڈنگ کے وقت کریش ہوتے ہوتے بچا۔

اس کا ڈاکٹری معائنہ ہوا، علاج بھی ہوا لیکن یہ نقص رفع نہ ہو سکا کہ ہوا میں بلند ہوتے ہی اس کا بلڈ پریشر گر جاتا تھا۔ نقص خطرناک تھا۔ وہ اثر و رسوخ والے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کی کوششوں سے امجد کو فلائنگ سے ہٹا کر ایئر ہیڈ کوارٹر کے ایک شعبے میں دفتر میں کام پر لگا دیا گیا۔

اس کے ساتھ باتیں ہوئیں تو ہم نے دیکھا کہ پُراعتماد انداز میں بولتا ہے اور کوئی الجھاؤ نہیں رکھتا۔ انسپکٹر کلارک سے وہ مرعوب نہیں ہوا کہ یہ انگریز ہے بلکہ اسے اپنے برابر سمجھ کر بات کرتا تھا۔ ہم اسے مقتولہ کی دوستی کی طرف لے آئے۔ اس نے بلا جھجک ساری بات بتا دی۔ یہ میں اپنی زبان میں سناؤں گا۔

اس نے بات ان الفاظ سے شروع کی کہ کسی ویکائی کے ساتھ دوستی گانٹھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جیب میں مال ہونا چاہئے۔ اسے مقتولہ کو بڑی اچھی لگتی تھی۔ پہلے پہل تو اس نے

اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ امجد کی دوستی ایک اور لڑکی کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بھی ویکائی تھی اور فلائٹ لیفٹیننٹ اس کا رینک تھا۔ اس لیفٹیننٹ ویکائی کی ٹرانسفر کہیں اور ہوگئی اور امجد اکیلا رہ گیا۔

امجد نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ عورتوں کی طرف ایسی توجہ نہیں دیا کرتا تھا جس طرح وہ لوگ دیتے ہیں جنہیں عورتوں کے شکاری کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنا کچھ وقار قائم رکھا ہوا تھا۔ ویسے ہی اس کی توجہ مقتولہ کی طرف ہوگئی۔ اس نے مقتولہ کے قریب ہونا شروع کر دیا، سلام و دعا ہوئی پھر کچھ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے اور دوستی ہوگئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مقتولہ ولسن سے بیزار ہوتی جا رہی تھی کہ کیونکہ ولسن اسے غلط طرف لے جا رہا تھا۔

امجد نے بتایا کہ اس نے دوستی تو کسی اور نیت سے لگائی تھی لیکن مقتولہ کو ویسا نہ پایا جیسا وہ سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مقتولہ فلرٹ قسم کی سوشل لڑکی ہوگی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہ دیکھی بلکہ ایک ایسی سنجیدگی دیکھی جو امجد کو کچھ اچھی لگی۔ مقتولہ نے امجد کو پیار محبت کے معاملے میں مایوس نہ کیا۔ وہ تو اپنا آپ امجد کے حوالے کر دیا کرتی تھی۔ امجد مقتولہ کے حسن اور اس کے شباب سے لطف اندوز ہوتا تھا لیکن ایک حد تک، یعنی پیار و محبت کی حد تک۔ مقتولہ امجد کو اس حد پر روک لیتی تھی جہاں سے بدکاری شروع ہوتی تھی۔ امجد نے مقتولہ کے اس کردار سے متاثر ہو کر کبھی ایسی فرمائش نہ کی جیسی اس کا منگیتر ولسن کرتا رہتا تھا۔ ایک روز مقتولہ نے امجد سے کہہ ہی دیا کہ ایسے دلی پیار اور محبت کو ناپاک نہ کیا جائے تو پیار میں لطف کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے اور پھر یہ محبت روح میں اتر جاتی ہے۔

امجد نے مقتولہ کی یہ بات دل و جان سے قبول کر لی لیکن امجد اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس میں ایسی پاکیزگی کہاں سے آ گئی ہے؟ وہ تو کچھ اور سمجھ کر اس کے قریب ہوا تھا۔ مقتولہ نے کہا کہ وہ چاہتی ہی یہی تھی کہ امجد اس سے یہ سوال کرے۔ مقتولہ نے اس کے جواب میں امجد کو اپنی منگنی کی بات سنائی اور کہا کہ وہ اس منگیتر ولسن سے ایسے ہی پیار کی توقع رکھتی تھی لیکن وہ شخص بدی کی طرف آ گیا اور فرمائش پوری نہ ہونے سے مجھ سے بگڑنے لگا تھا۔

مقتولہ نے تفصیل سے امجد کو ولسن کو رویہ بتایا اور کہا کہ اسے یعنی مقتولہ کو دلی صدمہ ہوا کہ ولسن اس کے پیار کو ناپاک کرنا چاہتا تھا۔

''میری پوری بات سنو گے امجد؟''۔۔۔ مقتولہ نے امجد سے کہا۔۔۔ ''تمہیں حیران نہیں ہونا چاہئے کہ میرے خیالات اور میرے احساسات میں یہ انقلاب کس طرح آ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے منگیتر نے میری ذات میں یہ انقلاب پیدا کیا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے سے یہ خیال مجھے پریشان کر رہا ہے کہ مرد نے خوبصورت عورت کو اپنی جسمانی تسکین کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ میں اپنی بات کروں گی۔ میں جس انگریز سکواڈرن لیڈر کی سٹینو اور پی اے ہوں وہ مجھے اپنی تفریح طبع کا ذریعہ بنائے رکھتا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میرے بھائی چھوٹے ہیں، انہیں تعلیم دلوانی ہے اور میرا باپ ایک سال بعد ریٹائر ہو جائے گا اور اس کی تنخواہ جب پنشن میں بدلے گی تو بہت کم ہی ہوگی۔ میں گھر کی آمدنی میں اضافہ چاہتی ہوں جو ہو گیا ہے......

''میں جدھر جاتی ہوں دوستی کی دعوتیں ملتی ہیں اور یہ لوگ میرے اردگرد مکھیوں کی طرح منڈلاتے اور بھنبھناتے ہیں۔ ولسن سے محبت ملی تھی، وہ بھی شکاری نکلا۔ تم بھی میری ویسی ہی دوستی کے خواہاں تھے جیسی دوسرے چاہتے ہیں۔ سوچ سوچ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ میں نے یقین کر لیا کہ مجھے وہ پیار اور وہ محبت کسی سے بھی نہیں ملے گی جو میرا دل اور میری روح چاہتی ہے......

''میں تمہیں ایک بات سنانا چاہتی ہوں، ہو سکتا ہے تم کہو گے کہ یہ لڑکی ذہنی طور پر نارمل ہے ہی نہیں۔ کچھ بھی کہہ لینا، میری بات سن لو۔ ہمارا گھر چھوٹی سی ایک آبادی میں ہے۔ میں مڈل کلاس کے لوگوں کی آبادی میں ہے۔ یہ مڈل کلاس کے لوگوں کی آبادی ہے۔ کچھ مکان دو منزلہ بھی ہیں اور وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ میں اتوار کا دن گھر گزارتی ہوں اور کبھی اپنے مکان کی چھت پر چلی جاتی ہوں۔ تین چار مرتبہ میں نے ایک مکان کی فصیل کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھا جو چار پانچ مکان پرے ایک لڑکے کو دیکھ رہی ہوتی ہے۔ لڑکا اپنے گھر کی فصیل کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے......

''دونوں اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور وقفے وقفے سے اپنی انگلیاں اپنے ہونٹوں پر لگاتے اور ایک دوسرے کو ہاتھ ہلاتے ہیں۔ اسے کوٹھوں کا پیار کہا جاتا ہے۔ اسے لوگ اچھا نہیں سمجھتے لیکن میں سوچا کرتی ہوں کہ لڑکی نے اپنا پردہ بھی رکھا ہوا ہے، اپنی عصمت کو بھی محفوظ رکھا ہوا ہے اور پیار و محبت بھی کر رہی ہے۔ مجھے معصوم سایہ

پیارا تنا اچھا لگتا ہے کہ کبھی تو میں تصوروں میں اپنے آپ کو اس لڑکی کی جگہ دیکھتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ لڑکی بھی اور وہ نوجوان بھی مسلمان ہیں۔ اگر ان میں شرم وحجاب نہ ہوتا اور اگر ان کے گھروں میں پابندیاں نہ ہوتیں تو دونوں اب تک باہر ملاقاتیں کر رہے ہوتے اور یہ لڑکی اپنی عصمت وآبرو سے کبھی کی دستبردار ہو چکی ہوتی اور دونوں نفسانی خواہشات میں اندھے ہو کر گناہوں کی دنیا میں بھٹک رہے ہوتے.....

''پھر میں نے دو مسلمان دلہنیں دیکھی تھیں۔ ان کے چہروں پر شرم وحجاب اور معصومیت دیکھی تو ایسا رشک پیدا ہوا کہ میں بھی ایسی ہی دلہن بنوں۔ یہ دو دلہنیں بھی مسلمان تھیں۔ وہ فیصل کے ساتھ لگی کھڑی لڑکی اور یہ دو دلہنیں میرے خیالات پر ایسی غالب آئیں کہ میرے اندر انقلاب پیدا ہونے لگا۔ میں جانتی ہوں کہ غلط قسم کی آزاد خیالی بعض مسلمان گھرانوں میں بھی پہنچ گئی ہے لیکن زیادہ تر گھروں میں عزت وآبرو اور عصمت کو سب سے زیادہ عزیز سمجھا جاتا ہے اور وہاں شرم وحجاب موجود ہے۔ اس طرح سوچتے سوچتے مجھے مسلمان اچھے لگنے لگے.....

''اب میرے منگیتر نے مجھے ایسا صدمہ دیا ہے کہ میں تمہارے مذہب کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہوں۔ یوں محسوس کرتی ہوں جیسے مجھے پناہ تمہارے مذہب میں ہی ملے گی۔ کیا تم میرے ان خیالات کی قدر کر سکتے ہو؟.....اگر مجھے دھوکے میں رکھنا ہے تو مجھے آج ہی بتا دو''۔

امجد نے مقتولہ کے یہ خیالات بڑی لمبی تفصیل سے سنائے تھے۔ میں نے تو بات بہت ہی مختصر کی لیکن مجھے پوری توقع ہے کہ آپ مقتولہ کے خیالات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

مارتھا روبینہ بن گئی تو.....

امجد امیر گھرانے کا چشم وچراغ تھا لیکن اس کے بیان کے مطابق اس کے گھر میں عزت اور وقار کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی اور مذہب کو اولیت حاصل تھی۔ امجد نے محسوس کر لیا کہ مقتولہ اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے اور اب اسے رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ امجد نے اسے قرآن کی کوئی آیت اور کوئی حدیث نہ

سنائی نہ اسے کوئی مولویانہ وعظ سنایا، اس کے ساتھ اپنا رویہ ایسا پیارا کر لیا جس سے متاثر ہو کر مقتولہ اس کی مرید ہو گئی۔ امجد اسے یہ تاثر دے رہا تھا کہ جو شرم وحجاب وہ چاہتی ہے وہ صرف مسلمان گھرانوں میں ہی مل سکتا ہے۔

میں بات کو اور زیادہ مختصر کرتا ہوں۔ امجد نے ایک ایسے مولوی کے ساتھ بات کی جو روایتی ملا نہیں تھا بلکہ روشن خیال مسلمان تھا اور کچھ زیادہ ہی پڑھا لکھا تھا اور دین اسلام کا مطالعہ تو اس نے بے پناہ کر رکھا تھا۔ اس قابل احترام شخص نے امجد سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو اس کے پاس لے آئے۔ مقتولہ امجد کے ساتھ گئی۔ دو تعلیم یافتہ اور معزز گواہ بلا لیے گئے۔ انہوں نے مقتولہ سے یہ پوچھ کر تسلی کر لی کہ اس پر کوئی جبر نہیں کیا گیا نہ اسے کوئی لالچ دیا گیا ہے۔ پھر اسے باقاعدہ حلقہ بگوش اسلام کر لیا گیا اور امجد نے اس کا نام روبینہ مریم رکھا۔

امجد اور روبینہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شادی کر لیں گے۔ امجد بہت ہی خوش تھا کہ اس نے بہت بڑی نیکی کی ہے۔ میری رائے کے مطابق امجد کی اصل نیکی یہ تھی کہ اس نے پرواہ ہی نہ کی کہ روبینہ شادی شدہ نہیں تھی لیکن کنواری نہیں تھی اور غیر مردوں سے ناجائز دوستی لگا چکی تھی اور امجد نے اسے اس بدی کے راستے سے ہٹا کر ایک پاکیزہ اور باعزت ازدواجی زندگی پیش کی تھی مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ دونوں شادی کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ روبینہ قتل ہو گئی۔

امجد نے ایک اور بات بتائی جو یہ تھی کہ ولسن نے دوبارا سے ٹیلی فون پر دھمکی دی تھی۔ امجد کے بیان کے مطابق ولسن نے اسے فون پر کہا تھا کہ مارتھا کی دوستی سے باز آجاؤ ورنہ تمہارے ماں باپ باقی عمر تمہیں روتے رہیں گے۔ امجد نے اسے کہا کہ آئندہ اس لڑکی کو مارتھا نہ کہنا وہ روبینہ ہے اور میرے سامنے آؤ پھر دیکھتے ہیں کس کے ماں باپ روئیں گے۔ تم مجھے نہ کہو بلکہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ اب روبینہ سے دور رہنا۔

امجد کا ارادہ یہ تھا کہ مقتولہ کے ساتھ شادی کر کے اسے دین اسلام کی تعلیم دے گا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اس شادی پر راضی کر لیا تھا بلکہ اس کا باپ خوش تھا کہ بیٹے نے ایک غیر مسلم لڑکی کو مسلمان کر لیا ہے۔

ولسن پر ہمیں جو شک تھا وہ مزید پختہ ہو گیا۔ امجد کو ہم نے فارغ کر دیا اور ولسن کو

حوالات سے نکالا نہیں بلکہ وہیں جا کر اسے کہا کہ وہ بول پڑے اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کے بچ نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں رہی کیونکہ مزید شہادتیں اس کے خلاف چلی آ رہی ہیں۔ ولسن ابھی تک اپنے انکار پر قائم تھا اور وہ روتا اور منتیں بھی کرتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے، اسے چھوڑ دیا جائے۔ ہم نے اسے حوالات میں ہی رہنے دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے پاس ایک کیس اور تھا، ہم نے باقی دن اس میں صرف کر دیا۔

اگلے روز روبینہ کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کچھ آگے بڑھائی اور ایئر ہیڈ کوارٹر کے اس شعبے میں بھی گئے جہاں روبینہ کام کرتی تھی۔ اس کے ڈائریکٹر سے ملے اور کچھ ضروری باتیں معلوم کیں۔ یہ انگریز سکواڈرن لیڈر روبینہ کے قتل پر بہت ہی افسوس کا اظہار کرتا تھا۔

اسی رات کا ذکر ہے کہ نو بجے کے کچھ بعد میں اپنے گھر تھا۔ ایک اے ایس آئی مجھے ملنے آیا۔ اس کا نام عبدالرشید تھا اور وہ سب انسپکٹر شنکر داس کے تھانے کا ایک اے ایس آئی تھا۔ اس کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ہم جب پہلے روز اس تھانے میں گئے تھے تو اسے صرف دیکھا تھا۔

یہاں عبدالرشید کی ایک اور بات کروں گا، یہ شخص مجھے اکثر یاد آیا کرتا ہے۔ وہ ہوشیار پور کا رہنے والا تھا۔ آزادی سے کچھ پہلے سب انسپکٹر ہو گیا تھا اور اب اسے پاکستان آنا تھا لیکن سکھوں کے ایک حملے میں باقاعدہ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ اس کی شہادت کی خبر مجھے پاکستان میں دو سال بعد ملی تھی۔ وہ اپنے گھر سب کو پاکستان لانے کے لیے گیا تھا۔ اس کے پاس بارہ بور کی دونالی بندوق تھی جس سے اس نے سکھوں کا خوب مقابلہ کیا تھا۔ اس کے خاندان کے کچھ افراد نکل آئے تھے لیکن عبدالرشید اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ وہیں شہید ہو گیا تھا۔

نئی دلی میں وہ شنکر داس کے تھانے میں اے ایس آئی تھا۔ رات نو بجے کے کچھ بعد میرے گھر آیا اور کہنے لگا کہ وہ مجھے صرف مسلمان سمجھ کر آیا ہے اور میری کچھ رہنمائی کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں اسے راز میں رکھوں کہ وہ مجھے گھر آ کر ملا تھا اور مجھے کچھ اشارہ دیا تھا۔

اس نے پہلی بات یہ بتائی کہ سب انسپکٹر شنکر داس روبینہ کے قتل کی تفتیش کسی اور طرف لے جانے کی کوشش میں تھا۔ اے ایس آئی نے کہا کہ یہ ہندو مسلمانوں کے خلاف

بڑا ہی سخت متعصب ہے۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ قتل کی یہ واردات فلائٹ لیفٹیننٹ امجد پر ثابت کی جائے یعنی روبینہ کو امجد نے قتل کیا ہے۔ یہ تو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ امجد کو شنکر داس نے شاملِ تفتیش کر کے تین دن تھانے میں بھی رکھا تھا اور ایئر فورس پولیس نے اسے رہائی دلوائی تھی۔

ہم نے جب امجد سے بیان لیا تھا تو اس سے پوچھا کہ شنکر داس نے اسے تین دن تھانے کیوں بٹھائے رکھا تھا۔ امجد نے بڑے شگفتہ انداز میں جواب دیا تھا کہ یہ ہندو تھانیدار اسے گواہ نہیں بلکہ مشتبہ قرار دے رہا تھا اور اس طرح بات کرتا تھا جیسے قاتل امجد ہو۔ اب اے ایس آئی اس کی تصدیق کر رہا تھا۔

میں اے ایس آئی عبدالرشید کی عظمت کو تسلیم کرتا ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ ہر محکمے میں خوشامد بہت چلتی ہے۔ یہ ہمارے وقتوں میں بھی چلتی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی چلتی تھی۔ عبدالرشید کو شنکر داس کا خوشامدی ہونا چاہئے تھا اور ہو گا بھی لیکن وہ یہ نہ بھولا کہ وہ مسلمان ہے اور میں بھی مسلمان ہوں اور اس واردات میں ایسی لڑکی قتل ہوئی ہے جو نومسلم تھی اس لیے اس نے اپنا فرض سمجھا کہ مجھے کچھ رہنمائی دے دے اور کوئی خطرہ ہے تو اس سے مجھے خبردار کر دے۔ وہ یہ فرض ایک مسلمان کی حیثیت سے ادا کر رہا تھا۔

اس نے بتایا کہ شنکر داس نے اس جگہ جہاں لاش پڑی پائی گئی تھی، اردگرد کچھ بھی نہ دیکھا۔ موقعۂ واردات سے زمین کوئی نہ کوئی اشارہ یا سراغ دے ہی دیا کرتی ہے۔ عبدالرشید شنکر داس کے ساتھ گیا تھا۔ عبدالرشید نے اپنی دلچسپی کے لیے اس جگہ کے اردگرد زمین دیکھی تھی۔

یہ اس نے اس لیے دیکھی تھی کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ لاش کا خون خشک ہو چکا ہے اور بوری کے ساتھ خون ہے ہی نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ قتل کہیں اور کیا گیا اور بہت دیر بعد لاش یہاں لا کر پھینکی گئی۔ عبدالرشید کو خیال آیا کہ لاش کوئی آدمی سر پر اٹھا کر تو نہیں لایا ہو گا، ریڑھا تانگہ استعمال کیا گیا ہو گا یا گاڑی پر لاش لائی گئی ہو گی۔

عبدالرشید نے مجھے بتایا کہ وہ زمین دھول والی تھی۔ گھاس کی ایک پتی بھی نہیں تھی۔ صبح تماشائی اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے تمام کھرے مٹا ڈالے۔ عبدالرشید ایک ماہر سراغ رساں کی طرح ذرا دور دور گھوما پھرا اور اسے ایک چیز نظر آ گئی۔ یہ چیز تھی ایک موٹر سائیکل

کے ٹائروں کے نشان۔ ریس کورس کے بالکل قریب سے پکی سڑک گزرتی تھی۔ عبدالرشید نے دیکھا کہ ان ٹائروں کے نشان پکی سڑک سے اس طرف گئے جدھر لاش پھینکی گئی تھی۔ آگے لوگوں نے یہ نشان مٹا ڈالے۔ عبدالرشید نے کچھ دور جا کے دیکھا تو موٹر سائیکل کے نشان پھر نظر آئے۔ اب وہ گھوم کر واپس سڑک پر چلے گئے۔ ٹائروں کے نشان بڑے صاف تھے۔ جہاں موٹر سائیکل پکی سڑک پر گیا وہاں سڑک پر کچھ خون بکھرا ہوا تھا اور کچھ ٹوٹے ہوئے سے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ موٹر سائیکل سوار صبح تماشائیوں کو دیکھ کر ادھر گیا ہو اور لاش دیکھ کر گھوم پھر کر سڑک پر آ گیا ہو لیکن یہ خون کیسا تھا اور یہ چھوٹے ٹکڑے کیسے تھے؟.....

سڑک کے دوسری طرف کچھ دکانیں تھیں۔ عبدالرشید نے ان دکانداروں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ رات ایک موٹر سائیکل کی ٹکر ایک فوجی ٹرک کے ساتھ ہوگئی تھی اور فوجی ٹوٹے ہوئے موٹر سائیکل کو اور اس کے سوار کو ٹرک میں ڈال کر ہسپتال لے گئے تھے۔ عبدالرشید نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ یہ ایکسیڈنٹ رات کو تین بجے کے ذرا بعد ہوا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ موٹر سائیکل سوار رات تین بجے ادھر آیا تھا۔ یہ بات شک پیدا کرتی تھی۔

ٹائروں کے نشان دیکھ کر آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ موٹر سائیکل کے ٹائروں کے نشان ہیں اور یہ کار کے ٹائروں کے نشان۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ٹائروں کے یہ نشان فلاں خاص موٹر سائیکل کے ہیں یا فلاں کار کے۔ عبدالرشید نے جن ٹائروں کے نشان دیکھے تھے ان میں ایک خاص بات تھی۔ ایک یہ کہ ایک ٹائر دوسرے کی نسبت زیادہ گھسا ہوا تھا اور اس میں شاید ایک جگہ ٹکڑا لگا ہوا تھا یا وہاں سے ٹائر پھٹا ہوا تھا۔ اس جگہ کا نشان زمین پر دیکھا گیا تھا۔ ایک چکر پورا کر کے یہ نشان زمین پر لگتا گیا اور اس سے خیال آیا کہ یہ ایک خاص موٹر سائیکل کے نشانات ہیں اور اس موٹر سائیکل والے کو پکڑا جا سکتا ہے۔

مجھے فوری طور پر ولسن کا خیال آیا۔ مقتولہ کی دوست لڑکیوں نے بتایا کہ ولسن موٹر سائیکل پر آتا اور مقتولہ کو پیچھے بٹھا کر لے جایا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں جرم کا ارتکاب اس طرح بنا کر ولسن نے مقتولہ کو کہیں اور قتل کیا پھر لاش دوہری کر کے بوری میں بند کی اور رات کسی وقت موٹر سائیکل کے پیچھے باندھ کر یہاں لایا اور یہاں پھینک کر چلا گیا۔

عبدالرشید کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سراغ رسانی میں خاص مہارت رکھتا

ہے۔ میں نے اسے اپنا ٹک بتایا کہ یہ واردات ولسن نے کی ہے اور اس کے پاس موٹر سائیکل بھی ہے لیکن عبدالرشید کہتا تھا کہ جہاں موٹر سائیکل سڑک پر چڑھا وہاں ایکسیڈنٹ ہوگیا اور شہادت یہ ملی کہ ایک موٹر سائیکل ایک فوجی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ یہ وہی موٹر سائیکل تھا جس پر لاش لائی گئی تھی یا یہ کوئی اور تھا۔ عبدالرشید کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر کے ہم اس بات پر پہنچے کہ ولسن کا موٹر سائیکل دیکھ لیا جائے۔ ٹائر کا نشان ایسا تھا جو موٹر سائیکل کی بڑی واضح نشاندہی کرتا تھا۔

عبدالرشید کے ساتھ کچھ اور باتیں ہوئیں اور اسے میں نے بصد شکریہ رخصت کر دیا۔ اگلی صبح میں نے انسپکٹر کلارک کو یہ ساری بات بتائی اور کہا کہ عبدالرشید کا کیس میں ذکر نہ آئے۔ انسپکٹر کلارک نے شنکر داس کو انگریزی زبان کی گالی دے کر کہا کہ وہ اسے سب انسپکٹر نہیں رہنے دے گا۔ واردات کو کم و بیش بیس دن گزر گئے تھے۔ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا کہ ٹائروں کے نشان اس جگہ موجود ہوں گے۔ ہم نے ولسن کو حوالات سے نکالا اور اس سے پوچھا کہ اس کا موٹر سائیکل کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ موٹر سائیکل اسے کمپنی نے دے رکھا ہے جو اس کے گھر ہے، ایسا نہ ہو کہ کمپنی نے اپنا آدمی بھیج کر موٹر سائیکل منگوا لیا ہو۔

ہم ولسن کو جیپ میں بٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔ اسے ہم نے ہتھکڑی نہیں لگائی تھی۔ دو کانسٹیبل ساتھ تھے۔ اس کے گھر جا کر دو پڑوسیوں کو ساتھ لیا اور انہیں بتایا کہ ولسن کے گھر کی تلاشی لی جائے گی اور وہ اس کے گواہ ہوں گے۔

ولسن نے ہمیں اندر جا کر موٹر سائیکل دکھایا۔ میں نے اور انسپکٹر کلارک نے سب سے پہلے موٹر سائیکل کے ٹائر دیکھے جو بالکل نئے تھے۔ ولسن سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ آٹھ دس روز پہلے اس نے یہ نئے ٹائر کمپنی سے تبدیل کروائے ہیں کیونکہ پہلے دونوں ٹائر بہت ہی گھس گئے تھے۔ ہم دونوں انسپکٹر یہ بات سن کر خوش ہوئے کہ ان ہی گھسے ہوئے ٹائروں کے نشان ریس کورس کے باہر دیکھے گئے تھے اور ولسن ہی ہمارا ملزم ہے۔

ولسن سے پوچھا کہ گھسے ہوئے ٹائر کہاں ہیں۔ اتفاق دیکھیں کہ گھسے ہوئے ٹائر ولسن نے ابھی گھر میں پھینک رکھے تھے اور کہیں باہر نہیں پھینک آیا تھا۔ اس نے کوڑا کباڑ کے ایک سٹور سے دونوں ٹائر نکال کر ہمیں دکھائے۔ میں نے اور انسپکٹر کلارک نے دونوں

ٹائروں کو بڑی ہی غور سے دیکھا۔ باہر بھی ہاتھ پھیرے اور اندر بھی لیکن وہاں کسی ٹکڑے کے نشان نہیں تھے۔ ان ٹائروں کے نشان بالکل صاف ہوتے تھے۔ بہر حال گواہوں کو دکھا کر ہم نے یہ دونوں ٹائر اپنے قبضے میں لے لیے۔

انسپکٹر کلارک نے مجھے کہا کہ واردات میں پستول استعمال ہوا تھا اس لئے اس گھر کی تلاشی لے لینی چاہئے۔ میں اس کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے تلاشی کا آغاز کرنے لگا۔ ولسن نے ہاتھ جوڑ کر مجھے کہا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کی اتنی بے عزتی نہ کی جائے۔ میں رک گیا اور اس سے پوچھا کہ اس کے پاس اعشاریہ 22 کا پستول ہے؟

''ہے جناب!'' — ولسن نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا — ''میں آپ کو پسٹل دکھا دوں گا اور اس کا لائسنس بھی دکھاؤں گا''۔

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا اور ایک اٹیچی کھول کر اس میں سے پستول نکال دیا۔ میں نے پستول کی نالی دیکھی۔ اس میں تیل لگا ہوا تھا۔ ہم نے یہ پستول بھی قبضے میں لے لیا۔ موٹر سائیکل کے ٹائروں اور پستول کی برآمدگی کی تحریر لکھی اور دونوں گواہوں کے اور ولسن کے اس پر دستخط کروا لیے۔

ایک اور موٹر سائیکل

ولسن کو ہم واپس لے آئے اور پھر حوالات میں بند کر دیا۔ یہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ پستول اس لیے برآمد کیا تھا کہ مقتولہ کے سر میں اعشاریہ 22 کی گولی ماری گئی تھی۔ مسئلہ اب ٹائروں کا رہ گیا تھا۔ یہ ٹائر اگر اے ایس آئی عبدالرشید دیکھ لیتا تو اچھا تھا کیونکہ زمین پر نشان اس نے دیکھے تھے لیکن ہم عبدالرشید کو سب کے سامنے بلانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ انسپکٹر کلارک کو بتایا کہ عبدالرشید کی ضرورت نہیں۔ اس نے مجھے کاغذ پر وہ نشان بنا دیئے تھے جو اس نے زمین پر دیکھے تھے۔ ولسن کے موٹر سائیکل کے ٹائر ایسا نشان نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

ہم نے پستول ایگزیمنر کے پاس بھیج دیا کہ وہ دیکھ کر رپورٹ دے کہ اس میں سے گولی اگر فائر ہوئی ہے تو کتنے دن پہلے ہوئی ہے۔ اس کے بعد میں پھر انسپکٹر کلارک کے ساتھ عبدالرشید کی بتائی ہوئی ساری باتوں کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے لگا۔ میں کہتا تھا

کہ جو موٹر سائیکل وہاں گیا تھا اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ انسپکٹر کلارک نے کہا کہ یہ وہاں چل کر دیکھتے ہیں اور سڑک کی دوسری طرف جو دکانیں ہیں ان دکانداروں سے پوچھتے ہیں۔ یہ تو ہمیں احساس تھا کہ رات کے وقت دکانیں بند تھیں لیکن کوئی آدمی ایسا تھا جس نے عبدالرشید کو بتایا تھا کہ رات یہاں ایک موٹر سائیکل اور فوجی ٹرک کی ٹکر ہو گئی تھی۔

یہ تو ہمارے دماغوں کا بڑا سخت امتحان تھا۔ ہم اپنے تجربے اور ذہانت کو یوں زور دے کر استعمال کرنے لگے جس طرح خشک لیموں اس توقع پر نچوڑا جاتا ہے کہ شاید ایک آدھ قطرہ نکل آئے۔ میں یہ بھی آپ کو بتاتا ہوں کہ سراغ رساں دماغ کوئی نہ کوئی اشارہ پا ہی لیتا ہے یا آخر میں یہی سراغ لگا لیتا ہے کہ اب کوئی سراغ نہیں ملے گا۔

میں اور انسپکٹر کلارک اس جگہ پہنچے جہاں ٹرک اور موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ یہ جگہ ہم نے پہلے بھی دیکھی تھی جب ہم وہ جگہ دیکھنے آئے تھے جہاں بوری میں بند لاش پڑی پائی گئی تھی۔

ہم سڑک کے پار دکانوں کے پاس چلے گئے۔ ہم پولیس کی وردی میں ہوتے تو ہمارا زیادہ رعب جمتا لیکن سی آئی اے کے پولیس آفیسر اور دیگر عملہ پرائیویٹ کپڑوں میں رہتے تھے لیکن اس ایک انگریز کو ساتھ دیکھ کر لوگ ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔

دکانیں زیادہ نہیں تھیں کیونکہ وہ کم آبادی والا علاقہ تھا، چند ایک دکانیں تھیں اور یہ بھی بڑی عام سی قسم کی۔ ہم نے دکانداروں کو اکٹھا کر کے یاد دلایا کہ بیس روز پہلے ریس کورس سے بوری بند لاش ملی تھی اور اسی رات ایک موٹر سائیکل اور فوجی ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ہم سی آئی ڈی کے پولیس انسپکٹر ہیں۔ عام لوگ سی آئی اے کو نہیں سمجھتے تھے وہ سی آئی ڈی کو جانتے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر دکاندار سامنے آیا۔ اس کی پان سگریٹ وغیرہ کی دکان تھی جس کے پچھواڑے میں اس کا چھوٹا سا مکان تھا لیکن رات وہ اپنی دکان کے سامنے چارپائی ڈال کر سویا کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ رات تین ساڑھے تین بجے کا وقت تھا جب وہ پیشاب کے لیے اٹھا۔ ایک موٹر سائیکل اس طرف سے بڑا ہی تیز آیا جدھر بوری بند لاش اگلی صبح ملی تھی۔

موٹر سائیکل جوں ہی سڑک پر چڑھا سڑک پر ایک فوجی ٹرک خاصی تیز رفتار سے آ رہا تھا۔ ادھر موٹر سائیکل مڑا ادھر ٹرک پہنچ گیا اور موٹر سائیکل سامنے سے ٹرک سے ٹکرایا اور

ٹرک نے بڑی زور سے بریک لگائی اور رک گیا۔

یہ دکاندار دوڑا گیا۔ ایک تو چاندنی رات تھی اور دوسرے وہیں اوپر کھمبے سے بلب جل رہا تھا۔ وہ فوجی اچھے لوگ تھے۔ موٹر سائیکل والا بے ہوش ہوگیا تھا اور وہ بُری طرح زخمی ہوا تھا۔ فوجیوں نے اسے اٹھا کر ٹرک میں ڈالا اور اس کا ٹوٹا پھوٹا موٹر سائیکل بھی ٹرک میں رکھ لیا اور اس دکاندار سے پوچھا کہ یہاں کوئی سول ہسپتال کتنی دور ہے۔ اس دکاندار نے انہیں سول یعنی سرکاری ہسپتال کا راستہ سمجھا دیا اور ٹرک چلا گیا۔

یہ فوجی واقعی اچھے لوگ تھے ورنہ جنگِ عظیم کے دوران فوجی گاڑیوں کے ڈرائیور سڑکوں پر بڑی بدتمیزیاں کرتے اور ٹریفک کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ ہائی وے پر جاتی مسافر بسوں کو سائیڈیں مار مار کر سڑک سے اتار دیتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ معلوم نہیں ان فوجیوں کو کس طرح اس شخص پر رحم آگیا اور اسے ہسپتال لے گئے۔

اگر موٹر سائیکل والا شدید زخمی تھا اور بے ہوش تھا تو اسے ہسپتال والوں نے داخل کر لیا ہوگا اور اس صورت میں اس کا نام اور پتہ بھی لکھ لیا ہوگا۔ ہم ہسپتال جا کر ایم ایس سے ملے، اپنا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ بیس اکیس روز پہلے رات کے وقت ایک موٹر سائیکل سوار کو فوجی یہاں لائے تھے اور وہ شدید زخمی تھا ہمیں اس کا ریکارڈ دیکھنا ہے۔

اس ہندو ایم ایس نے جب سی آئی اے کا نام سنا اور جب ایک انگریز انسپکٹر کو دیکھا تو اسے چابی لگ گئی اور اس نے اسی وقت متعلقہ آدمیوں کو بلایا، انہیں بتایا کہ کیا درکار ہے اور وہ ابھی ریکارڈ لائیں۔ اس دور میں ویسے بھی سرکاری اہلکار اپنے کام میں کوتاہی نہیں کرتے تھے لیکن یہ معاملہ پولیس کا تھا اس لئے سب نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور رجسٹر ہمارے سامنے آگیا۔

ایمرجنسی کا بھی ایک ڈاکٹر آگیا۔ اس سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس رات ایمرجنسی میں اسی کی ڈیوٹی تھی اور اسے یاد ہے کہ فوجی ایک موٹر سائیکل سوار کو بے ہوشی اور شدید زخمی حالت میں لائے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اس دور میں بیماریوں کی حالت آج والی نہیں تھی کہ مریض کو ایمرجنسی میں لے جاؤ تو اتنا رش ہوتا ہے کہ جگہ نہیں ملتی۔ اس دور میں یہ بات نہیں تھی۔ ایمرجنسی میں اور وارڈوں میں زیادہ تر بیڈ خالی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں صحت کا معیار خاصا اچھا تھا۔

مختصر بات یہ ہے کہ موٹر سائیکل والے زخمی کے گھر کا ایڈریس مل گیا اور یہ بھی پتہ چلا کہ اسے ڈسچارج ہوئے صرف پانچ دن ہوئے ہیں۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایک بازو کی کہنی سے ذرا نیچے ہڈی فریکچر ہوگئی تھی۔ اس کی ٹانگ پر اور بازو پر بھی پلستر چڑھا دیئے گئے اور گھر بھیج دیا گیا تھا۔ اسے ایک مہینے بعد ہسپتال آکر پلستر اتروانا تھا۔

ڈائری میں اس زخمی کا نام راما سوامی لکھا ہوا ہے اور وہ دلی کا ہی رہنے والا تھا۔ پرانی دلی کے پاس ایک آبادی پہاڑ گنج تھی، راما سوامی اس آبادی میں رہتا تھا۔ میں اور انسپکٹر کلارک ہسپتال سے اس علاقے کے تھانے میں گئے اور وہاں کے سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ ہمیں اس ایڈریس پر پہنچا دے۔ اس ایڈریس پر تو ہم خود بھی اِدھر اُدھر سے پوچھ کر پہنچ سکتے تھے لیکن تھانوں کے اکثر کانسٹیبل محلوں سے واقف ہوتے تھے اس لیے ہم نے وقت بچانے کی خاطر تھانے سے مدد حاصل کرنا بہتر سمجھا۔

اس سب انسپکٹر نے جب یہ نام سنا تو وہ سوچ میں پڑ گیا اور ذہن پر زور دینے لگا، پھر اس نے ایک رجسٹر کھولا اور بہت سے لکھے ہوئے ناموں میں یہ نام تلاش کرنے لگا۔

''یہ ہے آپ کا راما سوامی!''— اس نے کہا— ''غلط قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہے، ایئر ہیڈ کوارٹر میں کلرک ہے اور اس پر تخریب کاری کا شک ہے۔ لوگوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کرتا رہتا ہے اور کانگرسی ورکر ہے''۔

تھانے کے ریکارڈ پر بھی اس کا یہی ایڈریس لکھا تھا جو ہمیں ہسپتال سے ملا تھا۔ تھانے میں اس کے ریکارڈ کا مطلب یہ تھا کہ وہ پولیس کی زیرِ نگرانی تھا۔ سب انسپکٹر نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا کہ ہمیں راما سوامی کے گھر پہنچا دے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ وہ بڑی بری حالت میں گھر پڑا ہے۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو پلستر میں ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کی یہ بات سن کر میں سمجھ گیا کہ اس راما سوامی کی روز بروز رپورٹ مخبر تھانے پہنچاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ شخص سیاسی مشتبہ تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل ہمارے ساتھ گیا اور ہمیں راما سوامی کے گھر تک پہنچا دیا۔ دروازے پر دستک دی تو ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ راما سوامی کو دیکھنے آئے ہیں۔ تیرہ چودہ سالہ عمر کے اس لڑکے نے یوں نہ کہا کہ وہ راما سوامی کو اطلاع دیتا ہے یا یہ کہ آپ اندر آجائیں بلکہ وہ اندر کو چل پڑا۔ ہم تینوں اس کے پیچھے اندر گئے۔ اندر عورتیں

تھیں جو ہمیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔ ہم نے ان کی طرف توجہ نہ دی اور لڑکا جس کمرے میں داخل ہوا ہم بھی اس کمرے میں چلے گئے۔

یہ ایک صاف ستھرا اور اچھی قسم کا مکان تھا ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہاں سامنے پلنگ پر ایک جواں سال آدمی لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ زخمی ہے اس لیے زیادہ حرکت نہ کرے اور کسی تکلف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی وہ گھبرائے۔ گھبراہٹ تو فوراً اس کے چہرے پر آ گئی تھی اور وہ آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے ہمارا تعارف کرایا۔ راما سوامی نے لڑکے کو آواز دے کر کہا کہ وہ فوراً کرسیاں لائے۔ کرسیاں آئیں اور ہم بیٹھ گئے۔

راما سوامی کا ایک بازو پلستر میں جکڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ٹانگوں سے چادر ہٹائی تو ٹانگ بھی پلستر میں جکڑی نظر آئی۔ میں نے پوچھا کہ یہ زخم کیسے آئے تھے۔ اس نے کہا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ پھر میں نے پوچھا کہ ایکسیڈنٹ کب اور کہاں ہوا تھا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ آنکھیں دائیں بائیں کرنے لگا جیسے صحیح جواب دینے سے گریز کر رہا ہو۔ ہوا بھی ایسے ہی کہ اس نے جگہ کوئی اور بتائی اور وقت کے متعلق بتایا کہ اسے یاد نہیں۔

''وقت مجھے یاد ہے''۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ ''رات تین بجے کا وقت تھا اور غالباً تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ ایکسیڈنٹ کسی اور جگہ ہوا تھا۔ میں وہ جگہ بھی بتا سکتا ہوں۔ تم تو بے ہوش ہو گئے تھے اور سامنے والے دکانداروں میں سے دو تین پہنچ گئے اور انہوں نے تمہارا چہرہ بڑی اچھی طرح دیکھا تھا اور اب بھی تمہیں پہچان سکتے ہیں''۔

اب اس کے چہرے پر جو تبدیلی آئی وہ میں اکثر اپنی کہانیوں میں بیان کرتا رہتا ہوں۔ یہ تبدیلی اس وقت آتی ہے جب ملزم یا مشتبہ جان لیتا ہے کہ سب پردے اٹھ گئے اور اب وہ پکڑا گیا ہے۔

''اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے راما سوامی!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کہہ دو کہ تمہارے سر کو اتنی شدید چوٹ آئی ہے کہ تمہاری یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے لیکن ہم ہسپتال سے ہو آئے ہیں اور جن ڈاکٹروں نے تمہارا علاج کیا ہے ان سے پوری رپورٹ

لے آئے ہیں۔ تمہارا دماغ بالکل صحیح حالت میں ہے''۔

''آخر بات کیا ہے!''۔۔۔ اس نے ذرا کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔۔۔ ''ایکسیڈنٹ میری غلطی سے تو نہیں ہوا تھا۔ آپ کیسی انکوائری کر رہے ہیں؟''

ہمیں دراصل دلچسپی اس کے موٹر سائیکل کے ٹائروں کے ساتھ تھی۔ اگر ٹائر صحیح اور بہتر حالت میں تھے تو اس شخص کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے اس کے ٹائر دیکھ لیے جائیں۔ اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر اس سے پوچھا کہ اس کا موٹر سائیکل کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ موٹر سائیکل کو بہت ہی نقصان پہنچا ہے اور گھر میں پڑا ہے۔ میں نے کہا کہ میں موٹر سائیکل دیکھنا چاہتا ہوں۔

وہ خود اٹھنے لگا تو میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ پر جبر نہ کرے، لڑکے کو بتا دے کہ ہمیں موٹر سائیکل تک لے جائے۔

اس نے لڑکے کو آواز دے کر بلا لیا کہ ہمیں موٹر سائیکل دکھا دے۔ ہم لڑکے کے ساتھ گئے تو سامنے ایک برآمدے کے کونے میں دیوار کے ساتھ اس زمانے کا بڑا موٹر سائیکل TRIUMPH کھڑا تھا۔ واقعی اسے بہت نقصان پہنچا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ٹائر دیکھے۔ پچھلا ٹائر تو ذرا اچھی حالت میں تھا لیکن اگلا ٹائر زیادہ گھس گیا تھا۔ اس پر ہاتھ پھیرا تو اس جگہ ہاتھ رک گیا جہاں سے ٹائر ایک سائیڈ سے ذرا پھٹا ہوا تھا اور باہر سے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ اس کے اندر ٹائر کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ ذرا سا بھی شک نہ رہا کہ اے ایس آئی عبدالرشید نے جو نشان ریس کورس کے باہر دیکھا تھا، یہ اسی ٹائر کا ہی نشان تھا۔ یہ نشان ٹائر کے ذرا بائیں طرف تھا۔

قاتل کوئی اور ہی نکلا

''راما سوامی!''۔۔۔ راما سوامی کے کمرے میں جا کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔۔۔ ''ہم تم پر کوئی سنگین الزام عائد نہیں کریں گے۔ ہمارے دو تین سوالوں کا جواب دے کر ہمیں مطمئن کر دو اور ہم تمہارا شکریہ ادا کر کے چلے جائیں گے..... پہلا سوال یہ ہے کہ تم نے ایکسیڈنٹ کی جگہ غلط کیوں بتائی تھی اور دوسرا سوال کہ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ وقت کا کچھ پتہ نہیں؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ تم رات کے اس وقت ریس کورس کے اس طرف

یوں گئے تھے؟ تم ریس کورس کے جنگلے کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک گئے اور وہاں سے موٹر سائیکل گھما کر واپس سڑک پر آئے اور ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا..... ہمیں تسلی بخش جواب دے کر ہمیں رخصت کرو''۔

''یہ صحیح ہے کہ میرے سر کو چوٹ آئی تھی اور ہوش میں آنے کے کچھ دیر بعد تک مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا''۔۔۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''نہ جگہ کا خیال رہا نہ وقت کا۔ اس کے بعد میرا دماغ صحیح کام کرنے لگا تھا لیکن جگہ اور وقت میرے دماغ میں سے شاید نکل گئے تھے''۔

اس کی ہکلاہٹ اور پھر سوچ سوچ کر الفاظ نکالنا اور کوئی لفظ نکال کر پھر نگل لینا اور پھر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا یہ جھوٹ بولنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ اس سے کوئی بات بن نہیں رہی تھی۔ اس نے پہلی بار پولیس انسپکٹر دیکھے تھے لیکن ہم نے سینکڑوں مرتبہ اس جیسے مشتبہ اور ملزم اپنے ہاتھوں سے گزارے تھے۔

میرے ذہن میں یہ ایک نیا معمہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس شخص کا مقتولہ روبینہ کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ہم اتنی زیادہ تفتیش کر چکے تھے اور تفتیش بھی ان افراد سے کی تھی جن کا براہِ راست بڑا ہی قریبی تعلق مقتولہ کے ساتھ تھا۔ ان میں سے کسی نے راما سوامی کا اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ ایک خیال یہ آیا کہ اس کا دوستانہ ولسن کے ساتھ ہو گا اور ولسن کے کہنے پر اس نے روبینہ کو قتل کیا ہو گا۔

یہ تو تھانے سے پتہ چل گیا تھا کہ راما سوامی تخریبی قسم کا کانگرسی ہندو ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے جانی دشمن تھے جیسے اب بھی ہیں۔ ولسن نے اسے بتایا ہو گا کہ ایک عیسائی لڑکی مسلمان ہو گئی ہے اور اسے اپنے مذہب میں لانے کی وہ پوری کوشش کر چکا ہے۔ راما سوامی جیسے لوگ عقل سے نہیں جذبات کے زور پر سوچا کرتے ہیں۔ اس نے یہی فیصلہ کیا ہو گا کہ اس لڑکی کو مار ہی ڈالا جائے۔

راما سوامی ہمارے کسی ایک سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا بلکہ اس کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی اور یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ بولنا چاہتا تھا تو زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ میں اس کی موجودگی میں انسپکٹر کلارک کے ساتھ کوئی بات اور صلاح مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے طور پر اور میں اپنے طور پر سوچ رہے تھے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو۔

میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ روبینہ کے قتل میں ملوث نہ ہو لیکن اس نے کوئی نہ کوئی جرم ضرور کیا تھا جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر کلارک سے کہا کہ اس کے گھر کی تلاشی لے لیتے ہیں۔ تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل ابھی وہیں تھا اور اس نے بھی راما سوامی سے کہا تھا کہ وہ صحیح بات بتا دے اور اسے کچھ فائدہ مل جائے گا لیکن اب وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا بلکہ آنکھیں پھاڑے ہر کسی کی طرف دیکھتا اور اس کے چہرے کا رنگ لاش جیسا ہو گیا تھا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ باہر جا کر کوئی دو آدمی تلاشی کے گواہوں کے طور پر لے آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل باہر نکلا تو راما سوامی ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر ہماری منتیں کرنے لگا کہ خانہ تلاشی نہ ہو اور اگر کرنی ہے تو باہر کے آدمی نہ بلائے جائیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ہمیں پریشان کر رہا ہے اور ہم اس کی عزت و آبرو اور اس کی تکلیف کا ذرا سا بھی لحاظ نہیں کریں گے۔

ہیڈ کانسٹیبل دو آدمیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ ہم نے راما سوامی کو اٹھایا۔ وہ لاٹھی کے سہارے چل سکتا تھا۔ اسے کہا کہ کوئی مشکوک اور غیر قانونی چیز گھر میں ہے تو خود ہی برآمد کروا دے ورنہ ہم ایک ایک ٹرنک اور سوٹ کیس میں سے ہر چیز نکال کر باہر پھینکیں گے اور بڑی ہی باریکی سے تلاشی لیں گے اور ہمارا طریقہ توہین آمیز ہو گا۔ اسے تو چپ لگ گئی تھی اور وہ کسی بات کا جواب دیتا ہی نہیں تھا۔

انسپکٹر کلارک نے بڑے غصے سے کہا کہ اس سے مت پوچھو اور تلاشی لو۔ وہ خود بھی میرے ساتھ ہو گیا اور ہم دونوں نے تلاشی لینی شروع کر دی۔

ٹرنک، اٹیچی کیس وغیرہ کھول کر دیکھے اور ایک لوہے کی الماری جو مقفل تھی، کھلوائی۔ اس میں پمفلٹ اور کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ پمفلٹ دیکھے تو یہ پانچ چھ سو تھے۔ اس کا عنوان تھا۔۔۔ ''بھارت مارتا آزاد کیسے ہو''۔۔۔ میں نے اس کی ورق گردانی کر کے کسی کسی صفحے پر دو چار فقرے پڑھے تو وہ ایک اشتعال انگیز تحریر تھی جس میں لوگوں کو بھڑکایا گیا تھا کہ انگریزوں کو قتل کیے بغیر بھارت ماتا آزاد نہیں ہو سکتی۔ اسی الماری میں سے ایک اعشاریہ 22 پستول برآمد ہوا اور ایک ریوالور اعشاریہ 38 نکلا اور چار لمبے خنجر برآمد ہوئے۔ سائز اور ساخت کے لحاظ سے یہ خنجر بھی غیر قانونی تھے۔ میں نے گواہوں کے

سامنے راما سوامی سے پوچھا کہ اس کے پاس اس پستول اور ریوالور کے لائسنس ہیں؟ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا نہیں۔

ایک سٹور سے اکیس برچھیاں برآمد ہوئیں جن کی انیاں بڑی ہی تیز کی ہوئی تھیں۔ آٹھ دس لاٹھیاں بھی ملیں جن کے نیچے سیسہ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے بڑی ہی باریکی سے اس گھر کی تلاشی لی۔ یہ تو بڑا ہی خطرناک گھر تھا۔ اتنے میں راما سوامی کا باپ آ گیا۔ پہلے وہ گھر نہیں تھا۔ اس نے گھر کی حالت دیکھی اور برآمد کیا ہوا اسلحہ، برچھیاں اور لاٹھیاں دیکھیں تو راما سوامی کو لعن طعن شروع کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے عرصے سے منع کر رہا تھا کہ ان حرکتوں سے باز آ جاؤ لیکن یہ نہیں مانا۔

میں جان گیا کہ راما سوامی کس ٹائپ کا آدمی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ ہندوؤں نے 1946ء میں خانہ جنگی کا اہتمام کر لیا تھا۔ اس کی ہدایت کاری مہاتما گاندھی نے کی تھی۔ ان ہندوؤں کا ارادہ یہ تھا کہ مسلمان پاکستان کے مطالبے سے دست بردار نہ ہوئے تو ان کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑی جائے گی۔ ہندوؤں نے اپنے گھروں میں لاٹھیاں اور برچھیاں اور تلواریں رکھ لی تھیں۔ راما سوامی جیسے کچھ جوان خود ہی لیڈر بن گئے تھے اور انہوں نے گھروں میں برچھیاں اور لاٹھیاں ذخیرہ کر لی تھیں۔

میں جب مشیر نامہ یعنی برآمدگی کی تحریر لکھ رہا تھا تو ہیڈ کانسٹیبل وہ پمفلٹ پڑھنے لگا جو سینکڑوں کی تعداد میں برآمد ہوا تھا۔ اس نے ایک صفحہ میرے آگے کیا۔ میں نے لکھنا چھوڑ کر وہ صفحہ دیکھا تو اس میں سبھاش چندر بوس کا نام تھا اور لوگوں کو تلقین کی گئی تھی کہ سبھاش چندر بوس کی پیروی کریں۔

اگر آپ ''حکایت'' باقاعدگی سے پڑھ رہے ہیں تو آپ نے ـــــ ''مسافر اور منزل'' ـــــ کے عنوان سے ایک فوجی کی آپ بیتی یا سچی کہانی قسط وار پڑھی ہو گی۔ اس میں ہندوستانیوں کی ایک فوج ـــــ ''انڈین نیشنل آرمی'' (آئی این اے) ...... کے نام سے سبھاش چندر بوس نے بنائی تھی۔ انگریزوں کی انڈین آرمی کے فوجی کچھ تعداد میں بھگوڑے ہو کر اس فوج میں جا ملے تھے اور اس فوج کو جاپانی تیار کر رہے تھے۔ میں پوری تفصیلات میں نہیں جا رہا، تفصیل آپ ''مسافر اور منزل'' میں پڑھ لیں ورنہ میری کہانی بہت طویل ہو جائے گی۔ میں یہی بتا دیتا ہوں کہ راما سوامی جاپانیوں اور سبھاش چندر بوس کی بنائی ہوئی

فوج کا کارندہ تھا اور اس کے لیے جاسوسی بھی کرتا تھا۔

میں نے مشیر نامہ یعنی برآمدگیوں کا کاغذ تحریر کر لیا، اس پر گواہوں کے اور راما سوامی کے دستخط کروائے اور راما سوامی کو باقاعدہ گرفتار کر کے جیپ میں ڈالا اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔

''راما سوامی!'' ـــــ میں نے اسے کہا ـــــ ''تم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں کوئی مہلت نہیں دیں گے۔ اقبال جرم کر لو ورنہ آج ہی ڈاکٹر کو بلوا کر تمہارے یہ پلستر کٹوا کر اتار دیئے جائیں گے اور تمہارے زخم خراب ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں، آخر تمہاری ٹانگ کاٹنی پڑے گی اور بازو بھی شاید کٹ جائے۔ کوئی بھی قانون ہمیں پکڑ نہیں سکتا۔ اپنا انجام سوچ لو''۔

''اس سے کیوں پوچھتے ہو'' ـــــ انسپکٹر کلارک نے بڑے غصے سے کہا ـــــ ''میں ابھی فون کر کے سرجن کو بلاتا ہوں کہ اس کا پلستر کاٹ دے''۔

راما سوامی آخر ہندو تھا۔ اس کی روایتی بزدلی اس پر غالب آ گئی۔ اس نے جو مشن بنا رکھا تھا وہ محض جذباتی تھا اور اس کے پیچھے نہ عقل کام کر رہی تھی نہ کوئی پلان تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا اس کی جسمانی حالت پر رحم کیا جائے اور وہ سب کچھ بتا دے گا۔

اس نے بڑا ہی لمبا بیان دیا تھا جو مختصراً یوں تھا کہ وہ جاپانیوں کا باقاعدہ جاسوس تو نہیں تھا لیکن ایک جاسوس کے ساتھ اس کا رابطہ تھا جسے وہ معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔ اس کی زیادہ تر زمین دوز سرگرمیاں سبھاش چندر بوس کی آئی این اے کے لیے تھیں۔ نوجوانوں کو وہ اس فوج کے لیے تیار کرتا رہتا تھا اور کوئی اکیلا دوکیلا فوجی مل جائے تو اسے بھی قائل کرتا تھا کہ فوج سے بھاگ کر آئی این اے میں شامل ہو جائے۔ اس نے ان سرگرمیوں کی تفصیل بتائی۔ انسپکٹر کلارک نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے جاسوس ساتھی کو جو معلومات دیتا تھا وہ کہاں سے حاصل کرتا تھا۔

اس نے بتایا کہ ایک تو وہ خود ایئر ہیڈ کوارٹر میں تھا اور وہاں سے کوئی نہ کوئی راز کی بات مل جاتی تھی اور پھر بار تھا جس کے ساتھ اس کا بڑا گہرا رابطہ رہتا تھا۔ وہ بڑے اہم اور نازک شعبے کے ڈائریکٹر کی سٹینو تھی اس لئے اسے بڑی قیمتی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں جو وہ

راما سوامی کو بتا دیتی تھی۔ اس کی بھی تفصیلات سنائیں۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ راما سوامی جاپانیوں کا اور سبھاش چندر بوس کا باقاعدہ جاسوس تھا اور ہندوستان میں جاپانیوں کے ففتھ کالم کا کام کر رہا تھا۔

''باقی باتیں پھر سنیں گے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''روبینہ (مارتھا) کے قتل کی بات بتا دو۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس کے قتل میں ملوث ہو۔ اسے کیوں اور کس طرح قتل کیا گیا تھا''۔

اس نے سنایا کہ مارتھا نے ایک تو اپنا مذہب چھوڑا اور مسلمان ہو گئی اور پھر اس نے راما سوامی کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ اب وہ اس کے لیے جاسوسی کا ذرا سا بھی کام نہیں کرے گی۔ راما سوامی نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہی۔ اس نے کہا کہ وہ جب عیسائیت میں تھی تو اور بات تھی لیکن اب وہ مسلمان ہو گئی ہے اس لئے کوئی ایسی ویسی بات یا حرکت نہیں کرے گی۔

راما سوامی کو ایک غصہ تو یہ تھا کہ روبینہ نے جاسوسی سے انکار کر دیا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ مسلمان ہو گئی تھی اور تیسرا یہ کہ اس نے روبینہ کو خاصا روپیہ پیسہ دیا تھا جو جاسوسی کی اُجرت تھی اور سب سے بڑا باعث قتل کا یہ بنا کہ راما سوامی کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ روبینہ کسی بھی وقت اسے پکڑوا دے گی۔

اس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ بات کی۔ دوستوں نے قتل کا مشورہ دیا جو انہوں نے طے کر لیا۔ راما سوامی کو معلوم تھا کہ روبینہ ہفتے کی شام گھر آیا کرتی ہے اور اتوار کی شام واپس چلی جاتی ہے۔ قتل کی شام راما سوامی ایک جگہ روبینہ کے انتظار میں کھڑا رہا۔ روبینہ گھر سے نکلی اور جب سڑک پر تانگے کے انتظار میں رکی تو راما سوامی اس کے پاس آیا اور بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے روبینہ کو دھوکا یہ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ اس کے دو دوستوں کی موجودگی میں حلفیہ وعدہ دے کہ وہ اس کا راز فاش نہیں کرے گی۔ روبینہ اس کی باتوں میں آ گئی اور اس کے ساتھ ایک ایسے دوست کے گھر چلی گئی جو دو کمروں کے ایک مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ وہاں ایک اور دوست بھی آیا بیٹھا تھا۔ اعشاریہ 22 پستول راما سوامی کی جیب میں تھا۔

تینوں دوستوں نے آخری بار باری باری روبینہ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ

انہیں پہلے کی طرح انفارمیشن دیتی رہا کرے لیکن روبینہ نے صاف انکار کر دیا۔ راما سوامی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے پستول نکالا اور روبینہ کی ایک کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی۔

تینوں دوست روبینہ کے سر پر کپڑے لپیٹ لپیٹ کر خون روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ اس لئے کہ گھر میں خون کے نشانات نہ رہیں۔ یہ تو انہوں نے طے کر لیا تھا کہ لاش بوری میں باندھ کر پھینک آئیں گے۔ انہوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ لاش ریس کورس کے باہر فلاں جگہ پھینکی جائے گی۔

روبینہ تو جلدی مر گئی تھی لیکن خون کچھ دیر بہتا رہا۔ آخر انہوں نے لاش کو دوہرا کیا اور ایک بوری میں ڈال کر بوری کا منہ بند کر دیا۔

رات تین بجے سے کچھ پہلے دوستوں نے مل کر بوری راما سوامی کے موٹر سائیکل کے پیچھے باندھی اور راما سوامی نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور ریس کورس کی اس جگہ جا پہنچا جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ وہ جگہ ویران تھی اس لیے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ راما سوامی نے بوری لکڑی والے جنگلے کے اندر پھینکی اور موٹر سائیکل گھما کر واپس سڑک پر چڑھا ہی تھا کہ ایک فوجی ٹرک موڑ مڑا۔ وہاں سے سڑک مڑتی تھی۔ ٹکر ایسی ہوئی کہ راما سوامی کو ہسپتال میں جا کر ہوش آئی اور اس نے اپنی ایک ٹانگ اور ایک بازو پلستروں میں بندھا دیکھا۔ جسم پر ایک دو چوٹیں اور معمولی سا ایک زخم بھی تھا جس پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔

ہوش میں آ کر اس نے ڈاکٹروں کے پوچھنے پر اپنے گھر کا ایڈریس دیا اور اس کا باپ اور دیگر افراد اسے ہسپتال دیکھنے آئے۔ پانچ دن پہلے اسے ڈسچارج کیا گیا تھا۔

اس کا بیان اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ رات آ گئی اور اگر مجھے یاد ہے تو ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان وقت ہو گیا تھا۔ ہم اپنی اگلی کارروائی صبح تک ملتوی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ راما سوامی نے قتل والے گھر کا ایڈریس بتایا، اسے ساتھ لیا، ضروری عملہ بھی ساتھ لیا اور اسی وقت اس گھر پر چھاپہ مارا۔ وہاں دو دوست تو وہ تھے جو قتل میں شامل تھے اور ایک اور دوست بھی وہاں موجود تھا۔ ان سب کو گرفتار کیا اور ہیڈ کوارٹر لے گئے۔

انہوں نے بڑے آرام سے بیان دے دیا۔ دراصل راما سوامی نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ پردہ اٹھا چکا ہے اور اب وہ جرم سے انکار کریں گے تو انہیں سوائے تشدد کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

پھر راما سوامی کی نشاندہی پر اس کا وہ جاسوس دوست بھی پکڑ لیا گیا جسے وہ اپنی حاصل کی ہوئی اور روبینہ سے لی ہوئی انفارمیشن دیا کرتا تھا۔ اس جاسوس دوست کے گھر سے کچھ اہم چیزیں برآمد ہوئیں تو اس نے اپنے دو اور ساتھیوں کی نشاندہی کر دی۔

جاسوسی کا معاملہ اور کیس الگ تھا، میں آپ کو روبینہ کے قتل کی کہانی سنا رہا ہوں۔

راما سوامی نے اپنا اقبالی بیان مجسٹریٹ سے قلمبند کروا دیا تھا اور اس کے دو دوستوں نے جو اس قتل میں شامل تھے، مجسٹریٹ کو بیان دے دیا۔ کیس جب سیشن کورٹ کے سپرد ہوا اور سماعت شروع ہوئی تو تینوں اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو گئے۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ ہم نے شہادت میں کوئی کسر اور خامی نہیں چھوڑی تھی۔ صرف اقبالی بیان پر ہی بھروسہ نہیں رکھا تھا۔

راما سوامی کو آخر سزائے موت سنائی گئی اور اس کے دونوں دوستوں کو عمر قید دی گئی۔ تینوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں جو مسترد کر دی گئیں اور ایک روز راما سوامی کو پھانسی دے دی گئی۔

سب انسپکٹر شنکر داس کے خلاف ہماری رپورٹ پر محکمانہ کارروائی ہوئی اور اسے سب انسپکٹری کے عہدے سے گرا کر اے ایس آئی بنا دیا گیا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ وہ تین سال سب انسپکٹر نہیں بن سکتا۔

بٹن، بزرگ اور بدکار بیوی

یہ واردات پاکستانی علاقے کی ہے لیکن اس وقت کی ہے جب ابھی پاکستان کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا اس واسطے میں اصل جگہ کا نام اور اس واردات سے تعلق رکھنے والے افراد کے صحیح نام نہیں لکھوں گا۔ یہ احتیاط بہت ہی ضروری ہوتی ہے تاکہ کسی کی رسوائی نہ ہو۔

رات کے دو بج چکے تھے جب مجھ کو گھر میں گہری نیند سے جگایا گیا۔ تھانے میں سے ایک کانسٹیبل یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ قتل کی ایک رپورٹ آئی ہے۔ میں نے پوچھا کون ہے، کانسٹیبل نے کہا کہ ٹھیکیدار ہے۔ اس نے ٹھیکیدار کا نام لیا۔ یہ ایک قصبہ تھا اور اس ٹھیکیدار کو سب لوگ جانتے تھے۔ اس کو صرف ٹھیکیدار کہہ دینا کافی ہوتا تھا۔ نام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ میں بھی اس کو جانتا تھا۔ کانسٹیبل کو اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ ٹھیکیدار کی بیوی قتل ہو گئی تھی۔

یہ ٹھیکیدار تو قصبے کی ایک بڑی شخصیت تھا، اگر اس کی بجائے کوئی بہت ہی معمولی اور غریب آدمی آ جاتا تو بھی میں اس کو نہیں ٹال سکتا تھا اس واسطے کہ تھانے میں آنے والی کسی بھی رپورٹ کو ٹالنا انگریزوں کی نگاہ میں بہت بڑی کوتاہی اور ایک جرم تھا۔ میں بڑی جلدی سے تیار ہوا اور کانسٹیبل کے ساتھ تھانے پہنچا۔ تھانہ میرے گھر کے بہت قریب تھا۔ میرا فوراً پہنچنا اس واسطے بھی ضروری تھا کہ یہ قتل کی واردات تھی۔ جس طرح اسلام میں ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل کہا جاتا ہے ایسے ہی انگریزوں کے قانون میں قتل کو یوں سمجھا جاتا تھا جیسے زمین و آسمان ہل گئے ہوں۔ اس کے علاوہ میرا تجربہ یہ تھا کہ قتل کی جائے وقوعہ پر جتنی جلدی پہنچا جائے اتنا ہی فائدے مند ہوتا ہے۔ کوئی کھرا کھوج مل جاتا ہے یا کوئی چیز نظر آ جاتی ہے جس کو عام لوگ اہمیت نہیں دیتے لیکن تفتیشی افسر کے واسطے وہ

بڑی کارآمد چیز ہوتی ہے۔

ٹھیکیدار میرے دفتر میں افسردہ بیٹھا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر اٹھا اور ہاتھ ملایا۔ میں نے پوچھا کون قتل ہوگیا، ٹھیکیدار صاحب!

''میری بیوی''۔۔۔اس نے جواب دیا۔

''ڈکیتی کی واردات تو نہیں ہوئی؟''۔۔۔یہ میں نے اس واسطے پوچھا کہ رات کے اس وقت قتل کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ ڈاکہ پڑا اور مزاحمت کرنے پر ڈاکوؤں نے گھر کے کسی فرد کو مار ڈالا۔

اس نے قریبی بڑے شہر کا نام لے کر بتایا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے واپس آیا ہے۔ اس وقت ایک ریل گاڑی گزرا کرتی تھی۔ وہ اس پر واپس آیا تھا۔ گھر تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بیٹھک (ڈرائنگ روم) کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا ہے۔ وہ حیران ہوا کہ یہ دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے۔ یہ دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اس سے ذرا آگے حویلی کا بڑا دروازہ تھا۔ ٹھیکیدار نے اس بڑے دروازے پر دستک دینی تھی لیکن بیٹھک کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس میں داخل ہوگیا۔ اس کے آگے ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں گیا تو اس سے آگے ٹھیکیدار کا بیڈ روم تھا۔ اس کی بتی جل رہی تھی۔ اتنی رات گئے بتی نہیں جلنی چاہئے تھی۔ وہ بیڈ روم میں گیا تو دیکھا کہ اس کی بیوی کمر سے نیچے ننگی پلنگ پر پڑی تھی اور اس کا جسم ذرا سی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔

اس نے بیوی کو آواز دی تو بھی وہ نہ ہلی اور نہ بولی۔ قریب جا کر دیکھا تو ٹھیکیدار کو معلوم ہوا کہ وہ تو مر گئی ہے۔ اس کا منہ کھلا ہوا اور آنکھیں بھی کھلی اور ٹھہری ہوئی تھیں۔ ٹھیکیدار ساری واردات سمجھ گیا۔ اس کی بیوی کے ساتھ کسی نے زیادتی کی تھی اور اس کو مار کر چلا گیا۔ بیٹھک کا کھلا ہوا دروازہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ قاتل باہر سے آیا تھا۔

حویلی کے صحن کی طرف یعنی اندرونی طرف کھلنے والے دروازے کی اندر سے چٹخنی چڑھی ہوئی تھی اور کھڑکی کی چٹخنیاں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ پتہ لگتا تھا کہ اندر کی طرف سے کوئی بیڈ روم میں نہیں آیا۔ ایک دروازہ پہلو والی چھوٹی گلی میں کھلتا تھا۔ یہ بھی اندر سے بند تھا۔ قاتل بڑی گلی کی طرف سے بیٹھک کے دروازے سے داخل ہوا اور ساتھ والے کمرے سے گزر کر بیڈ روم تک پہنچا۔ اس سے پتہ لگتا تھا کہ ملزم ان کمروں سے اور

اس راستے سے واقف تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے ایف آئی آر لکھی اور یہ سوچ کر اس کے ساتھ چل پڑا کہ ضروری باتیں اس سے راستے میں پوچھوں گا۔ اپنے ساتھ عملے کے دو چار آدمی لینے تھے وہ لے لئے۔ تھانے سے نکلتے ہی میں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ کسی کے ساتھ اس کی دشمنی ہوگی۔ اس نے یہ جواب دے کر مجھ کو مایوس کر دیا کہ دشمنی کسی کے بھی ساتھ نہیں تھی۔

یہ سن لیں کہ یہ ٹھیکیدار کس پائے کا آدمی تھا۔ جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ فوجوں اور محاذوں کے واسطے اتنا زیادہ سامان ضرورت پڑتا تھا کہ ٹھیکیداریاں بہت ہی زیادہ ہوگئی تھیں۔ مثلاً گولہ بارود آگے بھیجنے کے واسطے لکڑی کے بکس، ایک ایک دن میں ہزاروں کی تعداد میں درکار ہوتے تھے۔ کئی لوگوں نے یہ بکس بنانے اور سپلائی کرنے کے ٹھیکے لے لئے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سا سامان فوجوں کے واسطے سپلائی ہوتا تھا۔ لوگوں کے تو دن پھر گئے تھے۔

یہ ٹھیکیدار جنگ سے پہلے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن آدمی بہت ہی ہوشیار اور موقع پرست تھا۔ اس نے فوراً ٹھیکے حاصل کر لئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تو جیسے آسمان پر چڑھ گیا ہو۔ اس کا کام اتنا زیادہ ہوگیا کہ قصبے میں ہی اس نے ایک قسم کا کارخانہ کھول لیا اور کئی بے روزگار لوگوں کا روزگار لگ گیا۔ دولت تو اس طرح برسنے لگی جس طرح مینہ برستا ہے۔ درمیانہ سا مکان ایک کشادہ اور عالیشان حویلی بن گیا۔

اس شخص نے صحیح مسلمانوں والا کام یہ کیا کہ عمر اس کی پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہو گئی تھی، اولاد جوان تھی اور اس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس لڑکی کی عمر بائیس سال تھی اور وہ خود دو تین سال بعد ساٹھ سال کا ہونے والا تھا۔ اس کی یہ نوجوان بیوی قتل ہوگئی تھی۔ میں اس کی یہ باتیں غور سے سنتا جا رہا تھا اور یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ قتل کا باعث کیا ہوسکتا ہے اور قاتل کون ہے۔ اس نے یہ بتایا کہ دوسری بیوی نوجوان ہے تو مجھ کو خیال آیا کہ اس لڑکی کو پہلی بیوی نے قتل کروایا ہوگا لیکن ٹھیکیدار نے بتایا کہ پہلی یعنی پرانی بیوی ایک سال پہلے مر گئی تھی۔ ٹھیکیدار نے دوسری شادی پہلی بیوی کی موجودگی میں کی تھی۔ اس کو طلاق نہیں دی تھی۔ دوسری شادی کے بعد پرانی بیوی ایک سال زندہ رہی۔

پھر ٹھیکیدار نے بتایا کہ اس کے تین بیٹے ہیں۔ بڑے کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی،

اس سے چھوٹا بیٹا تئیس چوبیس سال کا تھا اور اس کے بعد ایک اور بیٹا تھا جس کی عمر سولہ سترہ سال ہوگئی تھی۔

شلوار اُتری ہوئی

اتنے میں اس کا گھر آ گیا جو ایک کشادہ گلی میں تھا۔ وہ مجھ کو بیٹھک کے اس دروازے سے اندر لے گیا جو اس نے بتایا تھا کہ رات کو کھلا ہوا تھا۔ اس بیٹھک کے آگے جو کمرہ تھا اس میں ٹرنک اور ایک دو فرنیچر کی چیزیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کے آگے بیڈ روم تھا۔ لاش کے اوپر چادر پڑی ہوئی تھی۔ پلنگ خاصا چوڑا اور بہت خوبصورت تھا۔ خوبصورتی یہ تھی کہ اس کا تکیہ لکڑی کا بنا ہوا نہایت اچھا تھا اور اس پر چتر کاری کی ہوئی تھی۔ مقتولہ کی شلوار اس تکیے کے ساتھ لٹک رہی تھی جس طرح اس نے خود یہاں لٹکائی ہو۔

میں نے سب سے پہلے پلنگ کے نیچے اور فرش پر نظر دوڑائی۔ میری نظر ایک سراغ رساں کی نظر تھی جو زمین کے نیچے بھی چلی جاتی تھی۔ پلنگ کے قریب چھوٹا سا ایک کاغذ تہہ کیا ہوا پڑا تھا جو ٹھیکیدار کو اور گھر کے کسی فرد کو نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے یہ کاغذ اٹھایا اور اس کی تہیں کھولیں۔

میں نے ٹھیکیدار کو یہ کاغذ دکھا کر پوچھا کہ یہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ٹھیکیدار نے کاغذ دیکھ کر بتایا کہ اس کا ایک منشی ہے یا اس کو مینجر کہہ لیں، وہ گھر میں آتا جاتا رہتا ہے اور یہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹ ہے۔ یہ بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ بڑا شریف اور دیانتدار آدمی ہے۔ ٹھیکیدار نے اس کاغذ کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن میں نے کاغذ اس سے لے کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیا اور اس طرح جیب میں ڈال لیا کہ ٹھیکیدار نہ دیکھ سکے۔ ہوسکتا تھا یہ کاغذ کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن میں ایسی کوئی چیز نظر انداز یا ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سراغ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ملا کرتے ہیں۔

اس وقت ٹھیکیدار کے تینوں بیٹے کمرے میں موجود تھے۔ میں جب لاش سے چادر ہٹانے لگا تو تینوں باہر نکل گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ لاش آدھی ننگی ہے۔ میں نے چادر ہٹا کر لاش کی حالت دیکھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ مقتولہ کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ پھر میں نے لاش کی گردن دیکھی۔ وہاں صاف نشان گلا گھونٹنے کے نظر آ رہے تھے۔ خون کا

ایک قطرہ بھی نظر نہیں آتا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جسم پر کوئی زخم نہیں۔

میں نے جسم کو ہر طرف سے اچھی طرح دیکھا۔ چوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ میں جب لاش کو کروٹ پر کر کے معائنہ کر رہا تھا تو مجھ کو جرسی کا ایک موٹا بٹن پلنگ پر نظر آیا جو میں نے اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا تاکہ ٹھیکیدار یا اس کا کوئی بیٹا دیکھ نہ سکے۔ وہاں کوئی بیٹا تو تھا نہیں، وہ کمرے سے نکل گئے تھے۔ ٹھیکیدار نہیں دیکھ سکا تھا کہ میں نے پلنگ سے بٹن اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا ہے۔ یہ بٹن یقیناً کسی کی جرسی سے ٹوٹ کر گرا تھا۔ یہ چوڑا نہیں بلکہ گنبد نما بٹن تھا اور خاصا خوبصورت تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ بڑی اچھی قسم کی جرسی کا بٹن ہے۔

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ مقتولہ کی آبرو ریزی جبری طور پر ہوئی ہے یا مقتولہ کی رضامندی سے۔ مقتولہ کے جسم پر صرف قمیض تھی۔ یہ قمیض کہیں سے بھی پھٹی ہوئی یا کھینچی ہوئی نہیں تھی۔ تشدد کا اور مزاحمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔

اس طرح کی تفتیشی کہانیوں میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ مزاحمت اور تشدد میں عورت کی چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور یہ ٹکڑے جائے وقوعہ پر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ میں نے لاش کے بازو دیکھے۔ دونوں بازوؤں میں سونے کا ایک ایک کڑا تھا اور اس کے ساتھ کانچ کی چوڑیاں بھی تھیں لیکن کوئی ایک بھی چوڑی ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ بستر پر اچھی طرح دیکھا، فرش پر بھی دیکھا، چوڑی کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آیا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے اور یہ میرا تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے کہ مرد جب کسی عورت کو قابو کرنا چاہتا ہے تو اس کی کلائی یا بازو پکڑ کر مروڑتا ہے یا عورت مزاحمت کرتی ہے تو اس کھینچا تانی اور دھینگا مشتی میں چوڑیوں کا ٹوٹنا لازمی ہوتا ہے۔ یہاں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ شلوار تکیے کے ساتھ اس طرح لٹکی ہوئی تھی جیسے خود لٹکائی گئی ہو۔ معاملہ زبردستی کا ہوتا تو شلوار پھٹی ہوئی ہوتی یا پلنگ پر یا فرش پر پڑی ہوئی ہوتی۔

میرے واسطے سوچنے والی بات یہ تھی کہ بیٹھک کا دروازہ کس نے کھولا تھا کہ ملزم اندر آیا۔ میں نے اس وقت ان باتوں پر زیادہ غور نہ کیا اس واسطے کہ میں لاش کو اور اس کے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھنا تھا کہ کون کدھر سے آیا اور کدھر سے گیا۔

ایک بات فوراً میرے دماغ میں آ گئی۔ میں نے ٹھیکیدار کے تینوں بیٹوں کو دیکھ لیا تھا۔ تینوں جوان تھے۔ چھوٹے کی عمر اس نے سولہ سترہ بتائی تھی۔ وہ بھی جوانی میں داخل ہو

چکا تھا۔ میرے دماغ میں ان کے متعلق شک اور شبہ پیدا ہو گیا۔

لاش کو جب اچھی طرح دیکھ لیا تو اس کو پوسٹ مارٹم کے واسطے بھیجنے کا بندوبست کیا۔ ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا، اس کو لاش کے ساتھ بھیجنا تھا۔ اس کو بلا کر الگ سمجھا دیا کہ ایک تو لاش کا پوسٹ مارٹم ہو گا اور ٹھیکیدار کے تینوں بیٹے ساتھ جائیں گے اور ڈاکٹر کو بتانا ہے کہ ان کا ٹسٹ ضروری ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل سمجھتا تھا کہ میرا مطلب کیا ہے۔ میں نے تینوں بیٹوں کو بلایا اور ان کو کہا کہ وہ لاش کے ساتھ جائیں اور ڈاکٹر جو کچھ بھی کہے وہ اسی طرح کریں اور وہاں کسی قسم کا اعتراض یا کوئی اور ناگوار بات نہ ہو

اب میں کمرے کی ایک خاص بات بیان کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کمرہ بہت ہی سجا سجایا تھا اور پلنگ بالکل نیا تھا اور اس کے ساتھ اعلیٰ قسم کا سنگار میز تھا۔ سنگار میز کی دو درازیں تھیں اور دونوں کھولی ہوئی تھیں۔ زیورات کے دو ڈبے کھلے ہوئے میز پر رکھے ہوئے تھے اور ان میں جو زیورات تھے وہ میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ دروازوں کے اندر بھی ایک دو چیزیں پڑی تھیں۔ صاف پتہ لگتا تھا کہ دراز کی تلاشی لی گئی ہے۔ دوسری دراز کی اشیاء بھی اُلٹ پلٹ کی گئی تھیں۔ زنانہ پرس میز پر رکھا ہوا اور کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے اندر دیکھا تو اس میں پانچ نوٹ سو سو روپے کے کچھ دس روپے اور کچھ پانچ روپے کے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔

اتنے قیمتی زیورات اور اتنی رقم اس طرح چھوڑ کر جانے والا کوئی اندھا تو نہیں تھا یا آسمان سے اترا ہوا فرشتہ نہیں تھا۔ میں یہی کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈکیتی یا چوری کی نیت سے نہیں آیا تھا بلکہ وہ مقتولہ کو خراب کرنے آیا اور چلا گیا۔ قتل کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مقتولہ نے اس کو پہچان لیا ہو گا اور قاتل نے ضروری سمجھا کہ اس کو ختم کر دیا جائے لیکن میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا کہ مقتولہ اپنی یہ اشیاء کیا اسی طرح بے احتیاطی سے میز پر پھینک دینے کی عادی تھی؟

ٹھیکیدار نے کہا کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرتی تھی بلکہ سنگار میز کو بڑی احتیاط سے صاف ستھرا رکھتی تھی اور یہ ساری اشیاء دراز کے اندر رہتی تھیں۔ یہ تو مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ زیورات کے ڈبے کھول کر دیکھے گئے اور پھر درازوں کی تلاشی لی گئی۔ صرف ہار ہی دیکھا جائے تو بہت ہی قیمتی تھا۔ اس دور میں سو کے پانچ نوٹ آج کے سات آٹھ ہزار روپوں کے برابر ہوا کرتے تھے۔

یہاں پر مجھ کو شبہ ہوا کہ ملزم اس گھر کا ہی کوئی فرد ہے یا کوئی ایسا شخص جس کو اتنے قیمتی مال کا ذرا سا بھی لالچ نہیں تھا یعنی وہ کوئی ٹھیکیدار جیسا ہی دولت مند آدمی تھا۔ مجھ کو زیادہ شبہ ٹھیکیدار کے اپنے ہی کسی بیٹے پر تھا۔ یہ خیال رکھیں کہ مقتولہ ٹھیکیدار کے بیٹوں کی ماں نہیں تھی۔ وہ باہر کی ایک لڑکی تھی جس کو ٹھیکیدار نے خریدا ہی ہوا ہو گا۔

جنگِ عظیم کے زمانے میں ایسے کئی کیس ہوئے تھے۔ ایک تو لوگوں کو ٹھیکیداریاں مل گئیں اور پیسہ پانی کی طرح آنے لگا۔ فوج میں چونکہ افسروں کی ضرورت تھی اور فوجی مکھیوں کی طرح مر رہے تھے اس واسطے انگریزوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پڑھے لکھے صوبیداروں اور جمعداروں کو کمیشن دے کر کپتان اور میجر بنا دیا۔ مسلمانوں کی یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ پیسہ ہاتھ آ جائے یا اونچا رتبہ مل جائے تو مرد مومن سب سے پہلے پرانی بیوی سے بیزاری کا اظہار کرتا اور نئی نویلی نوجوان دلہن لاتا ہے۔ بعض والدین ایسے تھے جن کی آدھی آدھی درجن بیٹیاں تھیں اور مالی لحاظ سے صرف ایک بیٹی کو بیاہنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ ایسے والدین نے منہ مانگی رقمیں لے کر بیٹیاں دولت مند بوڑھوں کے ساتھ بیاہ دی تھیں۔ اس کے نتیجے میں ایک تو بدکاری یعنی ناجائز تعلقات بڑھ گئے اور پھر اس قسم کی سنگین وارداتیں بھی ہوئیں جن میں سے ایک آپ کو سنا رہا ہوں۔

ایسی وارداتیں بھی ہوئیں کہ باپ نے اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیا اس واسطے کہ بیٹے نے باپ کی نئی دلہن کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ جوان بیٹا باپ کی نئی اور نوجوان بیوی کو ساتھ لے کر گھر سے ہی بھاگ گیا۔ یہاں بھی مجھ کو کچھ ایسا ہی ڈرامہ نظر آ رہا تھا۔ ٹھیکیدار کی ایک بات نے میرے شک کو پختہ کر دیا تھا۔ یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

میں نے حویلی کو اندر سے دیکھنا اس واسطے ضروری سمجھا کہ اوپر سے کوئی شخص نیچے آ سکتا ہے یا نہیں۔ ٹھیکیدار مجھ کو اندر لے گیا۔ میں نے سب سے پہلے سیڑھیوں کی پوچھی۔ ٹھیکیدار نے آگے بڑھ کر ایک دروازے کی زنجیر اتار دی یہ سیڑھیوں کا دروازہ تھا۔ میں اوپر گیا۔ اوپر ایک منزل اور تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ لگا کہ اوپر سے اِدھر آنا ممکن نہیں۔ میں نیچے آ گیا۔

صحن میں دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ایک جوان تھی جو شکل و صورت، لباس اور ڈیل

ڈول سے اسی گھر کی فرد لگتی تھی۔ دوسری ادھیڑ عمر تھی جو نوکرانی معلوم ہوتی تھی یا محلے کی کوئی کم درجہ عورت تھی۔ محلے میں ابھی کسی کو پتہ نہیں لگا تھا کہ اس گھر میں قتل کی واردات ہوگئی ہے اور پولیس آئی ہوئی ہے۔ یہ اس واسطے کہ ابھی آدھی رات کے بعد تین بجے تھے۔ سارا قصبہ گہری نیند میں گم تھا۔

ٹھیکیدار نے جوان عورت کی طرف اشارہ کر کے مجھ کو کہا کہ یہ اس کی بہو ہے یعنی بڑے بیٹے کی بیوی۔ اس کے ایک ہی بیٹے کی ابھی شادی ہوئی تھی۔

یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ سیڑھیوں کا دروازہ نیچے کی طرف سے بند تھا پھر بھی میں نے پوچھا کہ یہ ہر رات بند کر دیا جاتا ہے یا کھلا رہتا ہے۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ اسے بند رکھا جاتا ہے اور زنجیر چڑھی رہتی ہے۔

لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا

میں نے ٹھیکیدار کو بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا اور اس کو کہا کہ وہ مجھ کو اپنی پہلی بیوی، بیٹوں اور پھر مقتولہ کے ساتھ شادی کی بابت کچھ بتائے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ پوری بات سنا دے تو پھر میں اس سے سوال و جواب کروں۔

یہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ ٹھیکیدار نے پہلی بیوی کی موجودگی میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ میرے سوالوں اور جرح سے یہ صورت سامنے آئی کہ قدرتی بات تھی کہ پہلی بیوی ناراض ہوئی لیکن اس کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ اس کو ایک نوجوان سوکن قبول کرنی پڑی۔ یہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ٹھیکیدار کے بیٹے کوئی دودھ پیتے بچے نہیں تھے کہ کچھ بھی محسوس نہ کر سکتے۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ تینوں بیٹے اس کے ساتھ ناراض ہو گئے اور پھر گھر میں یہ فضا بن گئی کہ کوئی انتہائی ضروری بات ہوتی تو کوئی بیٹا باپ کے ساتھ بات کر لیتا تھا ورنہ فضا میں کھچاؤ اور چپقلش بھری رہتی تھی۔

تینوں بیٹوں نے نئی ماں کو قبول نہیں کیا تھا اور اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ کوئی ایک بھی بیٹا اس لڑکی یعنی مقتولہ کے ساتھ بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کوئی کھانا کھانا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

ٹھیکیدار نے اس کا یہ علاج کیا تھا کہ اس نوکرانی کو جس کو میں نے صحن میں کھڑے

دیکھا تھا یہ کام سونپا تھا کہ وہ نئی بیوی کا پورا پورا خیال رکھے اور اسے کمرے میں کھانا دیا کرے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ نوکرانی نئی دلہن کی یعنی مقتولہ کی نوکرانی بن گئی تھی اور یہ ادھیڑ عمر عورت مقتولہ کا بہت ہی خیال رکھتی تھی۔

میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا کہ گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہوگا، یہ قدرتی بات تھی لیکن ٹھیکیدار نے کہا کہ اللہ کا کرم یہ رہا کہ لڑائی جھگڑا کبھی بھی نہیں ہوا۔ اس کا بیان یہ تھا کہ مقتولہ نے شروع سے ہی گھر کی مالکہ بننے کا دعویٰ کیا ہی نہیں، نہ کبھی اس نے گھر کے معاملات، باورچی خانے یا انتظامات میں دخل اندازی کی۔ وہ گھر میں ہر کسی کے ساتھ اچھے مراسم رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کا مزاج لڑنے جھگڑنے والا نہیں تھا بلکہ ہنسنے کھیلنے کی عادی تھی۔ ٹھیکیدار نے یہ بھی بتایا کہ وہ نوکرانی سے اور اپنی بہو سے الگ رپورٹ لیتا رہتا تھا۔ مقتولہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گذارتی یا اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جایا کرتی تھی اور شام سے پہلے واپس آجاتی تھی۔

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بیگم کے قاتل کو پکڑوں؟''— میں نے پوچھا۔

''یہ کیا سوال کیا ہے آپ!''— ٹھیکیدار نے کہا— ''میں تو کہتا ہوں کہ قاتل کو صبح ہونے تک پکڑیں اور اسے میرے حوالے کر دیں، میں اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ کر مار دوں گا؟''

''پھر یوں کریں''— میں نے کہا— ''اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو پھر ان بیٹوں کو بھی کچھ دیر کے لئے بیٹے سمجھنا چھوڑ دیں۔ اگر آپ نوکرانی سے اور اپنی بہو سے رپورٹیں لیتے رہتے تھے تو آپ نے یہ ضرور معلوم کیا ہوگا کہ آپ کے بیٹوں کا مقتولہ کے ساتھ رویہ کیا تھا۔ میرے دماغ میں کئی شکوک آرہے ہیں جو میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا''۔

''یہ بھی سن لیں''— اس نے کہا— ''میں جب گھر آیا اور بیوی کی لاش دیکھی اور لاش کو اس برہنہ حالت میں دیکھا تو اپنے بیٹوں کو جگایا اور ان کو اس کمرے میں لے آیا۔ میرا خدا گواہ ہے کہ اس وقت میں نے اپنے بیٹوں کو بھی دشمن سمجھا تھا۔ میں نے ان کو کہا کہ اگر تم میں سے کسی نے یا تم تینوں نے اس کو خراب کر کے قتل کیا ہے تو بتا دو، میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا اور اس کو دفن کر دوں گا۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو میں تمہارے

خلاف شک لکھوادوں گا اور پولیس تمہارے ساتھ جو اچھا برا سلوک کرے گی میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا..... تینوں بیٹوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے قتل ہی کرنا ہوتا تو اس وقت کر دیتے جب ہماری ماں زندہ تھی..... یہ تو میں نے دیکھا تھا کہ بیڈروم کا صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے پکا بند تھا اور کھڑکی کی چٹخنیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ پھر یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ بیٹھک کا باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ اگر میرے بیٹوں میں کسی نے یہ اردات کی ہوتی تو باہر والا دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی''۔

وہ اپنے بیٹوں پر شک کرتا یا نہ کرتا، مجھ کو ان پر شک تھا۔ اسی شک کی وجہ سے میں نے ان کو ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا تھا۔ ڈاکٹر نے لاش سے کچھ مواد لینا تھا اور کچھ مواد ان تینوں بیٹوں کا الگ الگ لے کر لاہور لیبارٹری کے واسطے بھیجنا تھا۔

ٹھیکیدار کے ساتھ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تھانے سے دوسرا ہیڈ کانسٹیبل آ گیا۔ میرے ساتھ جو ہیڈ کانسٹیبل تھا اس کو میں نے لاش کے پوسٹ مارٹم کے واسطے بھیج دیا تھا۔ اس کو کہا تھا کہ لاش ڈاکٹر کے سپرد کر کے تھانے جائے اور دوسرے ہیڈ کانسٹیبل کو کہے کہ انگلیوں کے نشان لینے والا سامان لے کر میرے پاس پہنچ جائے۔ میں نے سنگار میز دیکھا تھا جو بڑی اچھی چمکدار سطح والا تھا۔ اس پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات کی موجودگی ضروری تھی۔ دراز پر بھی انگلیوں کے نشانات ہونے چاہئیں تھے۔ مقتولہ کا پرس سخت چمڑے کا تھا، اس پر بھی نشانات کی موجودگی کا یقین تھا۔ زیورات کے ڈبوں پر مخمل کا کپڑا چڑھا ہوا تھا اس واسطے ان سے نشان لینے ممکن نہیں تھے۔ البتہ ٹین کی ایک چھوٹی صندوقچی تھی یا اسے بڑی ڈبیا کہہ لیں جس پر رنگ کیا ہوا تھا اور اس پر پھول بنائے ہوئے تھے۔ ایسی سطح انگلیوں کے نشان اپنے اندر محفوظ کرنے میں موزوں ہوتی ہے۔ ہر تھانے میں انگلیوں کے نشان منتقل اور محفوظ کر لینے کا پورا سامان ہوتا ہے۔ یہ میں اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر دیکھا تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ہیڈ کانسٹیبل سامان لے کر آ گیا تو میں نے اس کو وہ جگہیں اور اشیاء دکھائیں جن سے انگلیوں کے نشان (فنگر پرنٹ) لینے تھے۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور میں ٹھیکیدار کے ساتھ سوال و جواب کرنے لگا۔ اس کو کہا کہ وہ اپنے ہر بیٹے کی عادات، فطرت وغیرہ کی بابت صحیح رپورٹ دے۔

بڑے بیٹے کی بابت اس نے یہ رپورٹ دی کہ پکا مولوی ٹائپ آدمی ہے اور بے حد شریف۔ یہ خاص خیال رکھیں کہ کسی کو مولوی ٹائپ کہا جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ طبعاً شریف آدمی ہے۔ اکثر مولوی ٹائپ دیکھے گئے جو ظاہری طور پر شریف لگتے ہیں لیکن اندر سے فتنہ اور فساد پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس بیٹے کی بابت ٹھیکیدار نے کہا کہ وہ ہر طرح کی قسم کھانے کو تیار ہے کہ مذہب کے معاملے میں اور اخلاقیات کی بابت بہت ہی سخت ہے۔

اس سے چھوٹے بیٹے جس کی عمر تیئس چوبیس سال تھی، کی بابت ٹھیکیدار نے بتایا کہ اپنے بڑے بھائی کے بالکل الٹ ہے۔ آوارہ زندہ مزاج، کھلنڈرا، غیر ذمہ دار، فضول خرچ، پیسے کا دشمن اور فلموں کا شوقین۔ یہ رپورٹ سنی تو میں نے اپنی یہ رائے قائم کی کہ ایسے شہزادوں پر جنسیات اور بدکاری کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو ذہن میں مشتبہ رکھ لیا۔

اس سے چھوٹے بیٹے کی بابت ٹھیکیدار نے بتایا کہ اس کو وہ نارمل سمجھتا ہے۔ نہ مولوی ہے نہ آوارہ اور اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت نہیں۔ غصہ بہت کم اور خوش طبیعت لڑکا ہے۔

میں ٹھیکیدار کو کہتا تھا کہ وہ اپنی کوئی رائے دے اور اپنے کسی شک شبے کا اظہار کرے لیکن وہ نہ رائے دیتا نہ کسی پر شک کرتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کو کوئی خاص افسوس بھی نہیں تھا۔ اس کے پاس دولت تھی۔ وہ ایسی ایک اور لڑکی خرید کر گھر لا سکتا تھا۔ اس نے اس بات پر افسوس کا اظہار ضرور کیا کہ واردات اتنی شرمناک ہوئی ہے کہ لوگ سنیں گے تو ہر کوئی اپنی اپنی کہانی گھڑ لے گا اور اس کی بہت رسوائی ہوگی..... میں اس کو کہنے ہی لگا تھا کہ پہلے وہ کون سا نیک نام ہے جس نے اس عمر میں ایک نوعمر لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی لیکن مجھ کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل نہیں تھا اور کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔

اس گھر میں دوسری اہم فرد ٹھیکیدار کی بہو تھی۔ میں نے ٹھیکیدار کو یہ کہہ اندر بھیج دیا کہ اپنی بہو کو میرے پاس بھیج دے۔ مجھ کو ڈر تھا کہ یہ اپنی بہو کے کان میں اپنی کوئی ہدایت نہ ڈال دے لیکن وہ اندر گیا اور ایک منٹ میں اس کی بہو میرے پاس آ گئی۔ بڑی اچھی شکل و صورت کی جوان لڑکی تھی اور جب اس کے ساتھ باتیں ہوئیں تو میری طبیعت خوش ہو گئی اس واسطے کہ بڑے اعتماد اور وثوق سے بات کرتی تھی۔ یہ شک ہوتا ہی نہیں تھا کہ بات کو

گول کر رہی ہے یا غلط جواب دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ چھپائے کچھ بھی نہیں اور اس کا ایک بھی لفظ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا۔ اس کو یہ بھی کہا کہ وہ اس گھر کے ماحول کی بابت، مقتولہ کی بابت اور ٹھیکیدار کے بیٹوں کی بابت مجھ کو سب کچھ بتائے اور اس کے علاوہ کوئی اور بات جو وہ اہم اور ضروری سمجھتی ہے وہ بتائے۔

اس نے بات مقتولہ سے شروع کی اور پہلے لفظ یہ کہے کہ چال چلن کی ٹھیک نہیں تھی۔ شادی سے پہلے بھی اس کا چال چلن مشکوک تھا اور اچھی خاصی چالاک لڑکی تھی۔ اس کو ٹھیکیدار جیسے بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ شادی کر کے دکھ اور صدمہ ہونا چاہئے تھا لیکن عجیب بات یہ دیکھی کہ وہ بہت خوش تھی جیسے وہ اسی ٹھیکیدار کے ساتھ شادی کی خواہشمند تھی اور اللہ نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔ اس خاتون نے بتایا کہ لڑکی بڑی شوخ، بے حیا اور خوش رہنے والی تھی اور اس کی ہنسی مذاق میں فحاشی زیادہ ہوتی تھی۔ اس گھر میں ہر کسی کے ساتھ اس نے اچھے مراسم رکھے ہوئے تھے۔ ٹھیکیدار کی پہلی بیوی اس کے ساتھ بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ لڑکی اس کے ساتھ بھی خوش رہتی تھی۔ گھر کے کام کاج اور دیگر امور میں وہ دخل اندازی کرتی ہی نہیں تھی۔

ٹھیکیدار کی اس بہو نے کہا کہ مقتولہ کا خوش رہنا قابل فہم تھا۔ اس کے ماں باپ بھی اچھی شہرت کے لوگ نہیں تھے۔ اسی سے اندازہ کریں کہ انہوں نے نہ جانے کتنی رقم لے کر اپنی نوعمر لڑکی اتنی زیادہ عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دی تھی۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی کہ مقتولہ ٹھیکیدار سے پیسے بٹور کر اپنے ماں باپ کو دیتی رہتی تھی۔ ٹھیکیدار کی بہو نے کہا کہ یہ بات صرف وہی نہیں کہہ رہی بلکہ کسی سے بھی پوچھ لیں، یہی جواب ملے گا۔

''پھر اس نے اپنا کوئی درپردہ بندوبست کر رکھا ہوگا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اس کا کوئی دوست ہوگا جس کے ساتھ اس کی ملاقاتیں رہتی ہوں گی اور اس طرح یہ اپنے جذبات کی تسکین کرتی رہتی ہوگی''۔

یہ سن کر بہو نے کہا کہ اس لڑکی نے اپنی ایک الگ تھلگ دنیا بنا رکھی تھی۔ اس کے دو کمرے الگ تھے۔ ایک بیڈ روم اور ایک ساتھ والا کمرہ۔ آگے بیٹھک تھی جس میں سے بندہ سیدھا مقتولہ کے بیڈ روم تک پہنچ جاتا تھا۔ مقتولہ دونوں کمروں کے دروازے جو اندر

کی طرف کھلتے تھے پکے بند رکھتی تھی۔ یہ اس وقت کھلتے تھے جب وہ اندر حویلی میں آتی تھی اور گپ شپ لگاتی تھی۔

ٹھیکیدار کی اس بہو کے ساتھ مقتولہ کے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ بہو اس کو سچے دل سے اپنی دوست نہیں سمجھتی تھی، ظاہری طور پر اس کے ساتھ ٹھیک ٹھاک رہتی تھی لیکن زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی۔

''اب ایک نہایت اہم بات بتاؤ''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''تینوں بھائیوں میں کون مقتولہ کے ساتھ ذرا بے تکلف تھا؟''

''کوئی بھی نہیں''۔۔۔ بہو نے جواب دیا۔۔۔ ''میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گئی ہوں آپ کا بے تکلفی سے کیا مطلب ہے۔ میرا خاوند اور ان کا سب سے چھوٹا بھائی تو اس سے منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔ درمیانہ بھائی ذرا آزاد خیال اور زندہ دل ہے وہ کبھی اس کے ساتھ کھل کر بات کر لیا کرتا تھا لیکن میں اسے بے تکلفی نہیں کہوں گی۔ ان تینوں بھائیوں میں کوئی ایک بھی اس کے کمرے میں نہیں جاتا تھا۔ اگر کبھی جانے کی ضرورت پڑی تھی تو ایک دو منٹ بعد باہر آ گئے''۔

یہ نوٹ کریں کہ میں نے ٹھیکیدار کی بہو کے ساتھ بہت سی باتیں کی تھیں اور اتنے زیادہ سوال کئے تھے کہ خود مجھ کو یاد نہیں رہا تھا کہ کیا کچھ پوچھ چکا ہوں۔ یہاں نہایت ضروری باتیں تحریر کر رہا ہوں تاکہ آپ کو کہانی سمجھنے میں آسانی ہو۔

میں نے مقتولہ اور ٹھیکیدار کے بیٹوں کے آپس کے تعلقات کی بابت اتنا زیادہ کریدا تھا جیسے بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ کو شک تھا کہ مقتولہ نے ان بھائیوں میں سے کسی کو پھانس رکھا ہوگا۔

''میں آپ کو ایک بات بتاتی ہوں''۔۔۔ بہو نے کہا۔۔۔ ''یہ میں خود خیال رکھتی تھی بلکہ ایک قسم کا پہرہ دیتی تھی کہ ان بھائیوں میں سے کوئی بھی مقتولہ کے کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ میں سمجھی کہ لڑکی غلط خیالات رکھتی ہے اور اس کا چال چلن بھی صحیح نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکے آخر جوان ہیں، کوئی لڑکا اس کے قابو میں آ جائے۔ میں بہت حد تک یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ کوئی ایک بھی بھائی اس کی باتوں میں نہیں آیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تینوں بھائی مقتولہ کو اپنی ماں کی دشمن سمجھا کرتے تھے۔

میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اس چال چلن کی لڑکیاں جس چال چلن کی مقتولہ تھی، اپنی نوکرانیوں کو راز دان بنا لیتی ہیں اور ان کو پیغام رسانی کے واسطے استعمال کرتی ہیں۔ مجھ کو بتایا گیا تھا کہ گھر کی نوکرانی دراصل مقتولہ کی ذاتی نوکرانی بن گئی تھی اور زیادہ تر اس کے کمرے میں رہتی تھی۔ میں نے اس کی بابت ٹھیکیدار کی بہو سے پوچھا اور اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ نوکرانی اس کی راز دار ہوگی۔

بہو نے میرے اس خیال یا شک کی تائید کی اور کہا کہ مقتولہ کی در پردہ زندگی میں اس نوکرانی کا اچھا خاصا عمل دخل ہے۔ بہو نے ایک اور بات بھی بتائی۔ اس نے ایک جواں سال آدمی کا نام لیا جو ٹھیکیدار کا خاص ملازم تھا، وہ زیادہ تر مقتولہ کے پاس آیا کرتا تھا۔ نوکرانی نے ایک بار بہو کو بتایا کہ مقتولہ نے اس کو بڑی سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ جب یہ آدمی اس کے کمرے میں ہو تو وہ کمرے میں نہ آیا کرے۔

مقتولہ کی نوکرانی اور اندر کی باتیں

یہ ایک نیا شخص تھا جو بہو کی زبانی میرے سامنے آیا۔ میری مختصر سی ڈائری میں اس کا اصل نام لکھا ہوا ہے لیکن میں اس کی بجائے اس کا نام اقبال تحریر کروں گا۔ بہو نے بتایا کہ اس کی عمر چوبیس پچیس سال ہے اور یہ ٹھیکیدار کا خاص ملازم ہے۔ اس کا بالکل مختصر سا ذکر بلکہ اشارہ سا ٹھیکیدار نے بھی دیا تھا اور میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ یہ شخص اس واسطے میری نگاہ میں اہم ہو گیا کہ بہو کہتی تھی کہ یہ بھی مقتولہ کے زیادہ قریب تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہو نے اقبال کی شرافت اور دیانتداری کی بہت ہی تعریف کی۔ وہ کہتی تھی کہ بڑے ہی ستھرے اور پاکیزہ کردار کا نوجوان ہے۔

میں اس کا تھوڑا سا تعارف ضروری سمجھتا ہوں جو بہو نے مجھ کو بتایا تھا۔ ٹھیکیداری کے کام کی چھوٹی چھوٹی وصولیاں اور ادائیگیاں اقبال کے ہاتھوں ہوتی تھیں۔ مجھ کو یاد آیا کہ میری جیب میں کاغذ کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا پڑا ہے جو مجھ کو مقتولہ کے پلنگ کے قریب سے ملا تھا۔ اس پر کچھ نام اور ان کے آگے رقمیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کاغذ کا یہ ٹکڑا اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ گھر کا سارا انتظام اور اس کے اخراجات اور باورچی خانے کے اخراجات اقبال کے ہاتھ میں تھے۔ ٹھیکیدار کو اور خود بہو کو بیٹوں پر اتنا اعتبار نہیں تھا جتنا

اقبال پر تھا۔ بہو نے ان لفظوں میں تعریف کی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ہزاروں کی رقم دے دو خواہ چند آنے دے دو، یہ ایک ایک پائی کا حساب دیتا ہے اور چند روپے جو ٹھیکیدار کو بھی یاد نہ ہوں اور پھر گھر میں بھی ان کا کسی کو خیال نہ ہو، اقبال بتا دیتا ہے کہ فلاں جگہ خرچ ہوئے یا خرچ نہیں ہوئے اور یہ واپس لے لیں۔

یہ شخص اقبال چونکہ باہر کا آدمی تھا اور اس کی حیثیت ایک ملازم کی تھی اور اس کا گھر میں عمل دخل بہت زیادہ تھا اس واسطے میں نے ضرورت محسوس کی کہ اس کی بابت ساری معلومات لے لوں۔ بہو نے اس شخص کی بیک گراؤنڈ یہ سنائی کہ اس نے میٹرک پاس کی تو ایک ہندو آڑھتی کے پاس منشی لگ گیا۔ اس کا باپ آرے کی مشین پر کام کرتا تھا۔ یہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور دو بہنیں تھیں۔ جب ٹھیکیدار کا کام خوب چل پڑا تو اس نے آرے کی دو مشینیں لگوا لیں۔ اقبال کا باپ کسی اور کی مشین پر کام کرتا تھا۔ ٹھیکیدار نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اور تنخواہ زیادہ پیش کر کے اپنی مشین پر لگا لیا۔ ایک سال بعد نہ جانے کیسے یہ حادثہ ہو گیا کہ اقبال کے باپ کا بازو آرے میں آ گیا اور کہنی کے قریب سے ہڈی بالکل کٹ گئی۔ بدقسمتی یہ کہ یہ دایاں بازو تھا۔ ہڈی کٹی بھی ایسی کہ جڑ نہیں سکتی تھی اس واسطے ہسپتال میں وہاں سے بازو کاٹ دیا گیا۔

اقبال کی دو بہنیں تھیں جن کی شادی کے واسطے جہیز، زیورات اور کپڑے وغیرہ بنانے تھے لیکن باپ بے کار ہو گیا اور اقبال کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ ٹھیکیدار اقبال کو آڑھتی کی نوکری سے ہٹا کر اپنے پاس لے آیا۔ اقبال نے بہت جلدی یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ پوری طرح دیانتدار اور محنتی آدمی ہے۔ ٹھیکیدار نے اس کی تنخواہ خاصی زیادہ مقرر کر دی اور اس کو ایک طرح کا منیجر بنا دیا۔ ورکروں اور دیگر مزدوروں وغیرہ پر وہی نظر رکھتا تھا اور ان کی تنخواہیں اور دیہاڑیاں وہی ادا کرتا تھا۔ پھر ٹھیکیدار نے اس کی دیانت داری کو دیکھتے ہوئے اس کو گھر کے انتظامات بھی دے دیئے اور یہ شخص ایک طرح کا گھر کا فرد بن گیا۔

ٹھیکیدار نے اقبال کو اس قدر قابل اعتماد سمجھا کہ اس کو مقتولہ کا جیسے باڈی گارڈ بنا دیا ہو۔ بہو نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا کہ ٹھیکیدار نے دراصل اقبال کو جاسوسی کے واسطے مقتولہ کے ساتھ لگا دیا تھا اور مقتولہ کو کہا تھا کہ اس کو وہ اپنا ذاتی ملازم سمجھے۔ یہ وجہ تھی کہ اقبال مقتولہ کے پاس دن میں ایک آدھ مرتبہ ضرور آتا اور خاصی دیر کمرے میں رہتا تھا۔ بہو کا

خیال یہ تھا کہ ٹھیکیدار دراصل معلوم کرتا رہتا تھا کہ مقتولہ گھر رہتی ہے یا جاتی ہے تو کہاں جاتی ہے اور گھر میں اس کا رویہ کیا ہے۔ اقبال ٹھیکیدار کو پوری رپورٹ دیتا تھا۔

ٹھیکیدار کی بہو کے ساتھ میری اتنی زیادہ باتیں ہو چکی تھیں کہ ہم میں بے تکلفی ہو گئی تھی۔ مجھ کو اس بہو کی بابت یہ اطمینان مل گیا تھا کہ کھل کر بات کرتی تھی اور عقل سے کام لیتی تھی۔ کوئی فضول بات اس کے منہ سے نہیں نکلی۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ میری ہر بات اور میرا ہر سوال تہہ تک سمجھ لیتی تھی۔ مثلاً میں نے کہا کہ اس کا خیال ہے کہ اقبال بھی آخر تیس چوبیس سال کا جوان لڑکا ہے، مقتولہ نے اس کے ساتھ دوسری قسم کی دوستی لگائی ہوگی۔

بہو میری بات فوراً سمجھ گئی۔ اس نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس واسطے نہیں ہو سکتا تھا کہ اقبال صرف دیانتدار ہی نہیں تھا بلکہ پکا نمازی بھی تھا اور وہ ٹھیکیدار کا اتنا زیادہ احسان مند تھا کہ اس کے ساتھ بے وفائی اور دھوکہ دہی نہیں کر سکتا تھا۔ بہو نے یہ بھی بتایا کہ تین ساڑھے تین مہینے پہلے اقبال کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کو دو چار مرتبہ اس گھر میں لایا تھا۔ وہ بہو سے بھی ملی اور مقتولہ کے پاس بھی بیٹھی رہی تھی۔

بہو نے اقبال کا ذکر اس واسطے نہیں کیا تھا کہ اس کو کوئی شک شبہ نہیں تھا کہ اس واردات میں اس کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بہو نے مجھ کو صرف یہ بتانا چاہا تھا کہ نوکرانی کے علاوہ اقبال کا مقتولہ کی زندگی میں عمل دخل تھا اور میں مزید کچھ معلوم کرنا چاہوں تو اقبال سے پوچھوں۔

فجر کی اذان ہو چکی تھی اور صبح طلوع ہو رہی تھی۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ میں نے ٹھیکیدار کی بہو سے کس قدر طویل گفتگو کی تھی۔ مجھ کو معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد لاش پوسٹ مارٹم کے بعد گھر آ جائے گی اور اس گھر میں سارا محلہ اکٹھا ہو جائے گا اور ماتم کی فضا بن جائے گی اس واسطے میرا وہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تھا۔ لاش آ جانے سے میں وہاں کوئی تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے نوکرانی سے لمبی پوچھ گچھ کرنی تھی اس واسطے میں نے یہ بہتر سمجھا کہ نوکرانی کو اپنے ساتھ تھانے لے چلوں۔ میں نے ٹھیکیدار کو اندر بلایا اور کہا کہ اس کی نوکرانی کو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس کو یہ بھی کہا کہ وہ کوئی بچہ یا کم عمر آدمی نہیں، وہ خود بھی جاسوسی اور سراغ رسانی کرتا رہے اور کہیں سے بھی اس کو ذرا سا اشارہ ملے تو فوراً مجھ کو تھانے اطلاع دے۔

ٹھیکیدار نے نوکرانی کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ مجھ کو اس کے خاص ملازم اقبال کی بھی ضرورت تھی لیکن ابھی باہر کسی کو بھی پتہ نہیں لگا تھا کہ اس گھر میں کیا قیامت ٹوٹی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال بھی نہیں آیا تھا۔ اگر آیا ہوتا تو میں اس کو بھی تھانے لے جاتا۔

میں تھانے پہنچا تو صبح کی روشنی سفید ہونے لگی تھی۔ میں دو بجے کا جاگا ہوا مغز مار رہا تھا اور کچھ آرام کی ضرورت تھی لیکن میں نے آرام کی بالکل نہیں سوچی اور پکا ارادہ کر لیا کہ کسی نتیجے پر پہنچ کر دم لوں گا۔ ایک کانسٹیبل کو اپنے گھر بھیجا کہ میرے واسطے ناشتہ لے آئے۔ نوکرانی کو میں نے باہر بٹھا دیا تھا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ اس کے واسطے چائے اور ایک بند لے آئے۔ میں خود اپنے دفتر میں یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ قتل کا باعث کیا ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو باعث معلوم کرنا تھا، یہ معلوم ہو جانے سے قاتل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

میں دماغ کو لیموں کی طرح نچوڑنے لگا۔ مجھ کو یقین ہو رہا تھا کہ مقتولہ کے ساتھ زیادتی جبری طور پر نہیں ہوئی بلکہ اس میں مقتولہ کی رضا و رغبت شامل تھی۔ یہ بھی پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ زبردستی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ مقتولہ کو کمر سے نیچے برہنہ کیا نہیں گیا تھا بلکہ وہ خود برہنہ ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار کی بہو نے مقتولہ کے چال چلن کی جو باتیں سنائی تھیں ان کی روشنی میں میری سوچیں کام کر رہی تھیں۔

سوچنے والی بات یہ تھی کہ ملزم باہر سے آیا تو اس کے واسطے دروازہ کس نے کھولا تھا؟ مقتولہ نے ہی کھولا ہوگا اور یہ اس کا چاہنے والا کوئی دوست یعنی آشنا ہوگا لیکن سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ اس نے قتل کیوں کیا؟ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ قتل زیادتی کے بعد کیا گیا۔ پھر یہ بھی ایک معمہ تھا کہ اس نے زیورات کے ڈبے اور سنگار میز کی درازیں کیوں کھولیں؟ اگر کھولی تھیں تو زیورات اور پرس میں سے اتنی رقم چھوڑ کیوں گیا؟

یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے ملزم کے پاس ریوالور یا خنجر تھا اور اس نے مقتولہ کو اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور ملزم کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی۔ مقتولہ کوئی شریف لڑکی تو تھی نہیں کہ اس کو اپنی عصمت کا اتنا زیادہ خیال ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ملزم نے چہرہ نقاب یا منڈاسے میں چھپا رکھا ہو اور کسی طرح چہرہ ننگا ہو گیا اور ملزم کی شناخت ہو گئی۔ اس صورت میں ملزم نے مقتولہ کو قتل کر دینا ضروری سمجھا لیکن پھر وہی بات

سامنے آگئی کہ ملزم آیا کس طرف سے تھا۔ اگر وہ بیٹھک کے دروازے سے آیا تھا تو دروازہ مقتولہ نے ہی کھولا ہوگا۔ وہ اس کی منتظر ہوگی۔ اس صورت میں یہ ملزم کوئی غیر یا ایسا شخص نہیں تھا جس کو مقتولہ نہیں جانتی تھی۔ پھر وہی سوال کہ ملزم اتنا قیمتی مال چھوڑ کیوں گیا؟

یہ خیال بھی آیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اس کو معلوم تھا کہ آج رات ٹھیکیدار گھر میں نہیں۔ ہوسکتا ہے مقتولہ کو معلوم تھا کہ ٹھیکیدار رات پچھلی گاڑی سے آئے گا۔ یہ کوئی اس کا اپنا آشنا ہوگا جس کو اس نے بلایا تھا۔ اس خیال کے آگے پھر اندھیرا آگیا کہ وہ آشنا ہی تھا تو وہ مقتولہ کو قتل کیوں کر گیا؟

ایک اور امکان دماغ میں آیا۔ وہ یہ کہ مقتولہ کا آشنا بیٹھک سے واپس نکل رہا تھا تو ٹھیکیدار کے کسی بیٹے نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ آدمی تو نکل گیا اور بیٹا بیٹھک سے مقتولہ کے بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے مقتولہ کو اس حالت میں دیکھ لیا۔ مقتولہ نے ابھی اپنے آپ کو سنبھالا نہیں تھا۔ بیٹے نے غصے سے پاگل ہو کر مقتولہ کا گلا دبوچ لیا اور اس کو مار ڈالا۔ یہاں پھر بکھرے ہوئے زیورات میرے سامنے آگئے۔ اگر بیٹا ہی قاتل تھا تو اس نے سنگار میز کی درازیں کیوں کھولیں اور زیورات بکھیرے کیوں؟

پھر یہ امکان بھی دماغ میں آیا کہ مقتولہ نے در پردہ تعلقات ٹھیکیدار کے درمیانے بیٹے یا اس سے چھوٹے بیٹے کے ساتھ بنا رکھے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بیٹھک کی طرف سے مقتولہ کے بیڈ روم میں آیا۔ وہاں سے جب نکل رہا تھا تو بڑے بھائی نے دیکھ لیا جو مولوی ٹائپ تھا اور مذہب کے معاملے میں بڑا ہی سخت تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو تو چھوڑ دیا لیکن بیڈ روم میں آکر مقتولہ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ فساد کی جڑ یہ شیطان عورت ہے، اسی کو دنیا کے تختے سے اٹھا دیا جائے۔ ایسا ممکن ہوسکتا تھا لیکن اس مولوی ٹائپ بھائی نے زیورات الٹ پلٹ کیوں کیے؟

زیورات اور رقم کا سوال مجھ کو بار بار پریشان کرتا تھا۔ میں نے اس پر غور کیا تو یہ سوچ آئی کہ یہ حق ٹھیکیدار کو حاصل تھا کہ وہ مقتولہ کے زیورات اچھی طرح دیکھے اور اس کا پرس بھی کھول کر چیک کرے۔ اس سوچ سے مجھ کو یہ امکان نظر آیا کہ ٹھیکیدار ریل گاڑی سے اتر کر گھر آیا تو بیٹھک کا دروازہ کھلا دیکھا۔ دبے پاؤں بیڈ روم تک گیا تو بیوی کو ایسی حالت میں دیکھا جیسے اس کے پاس کوئی اس کا دوست آشنا آیا تھا۔ ٹھیکیدار نے غصے میں آ

کر اس کو پلنگ پر گرایا یا کھڑے کھڑے اس کا گلا گھونٹ دیا اور پلنگ پر ڈال دیا۔ پھر ٹھیکیدار نے دیکھا ہوگا کہ مقتولہ نے اپنے زیور کی کوئی چیز یا کچھ پیسے اپنے دوست کو دیئے ہوں گے۔ ایسے ہی اس کی یہ ساری اشیاء کھول کر دیکھی ہوں گی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیٹوں کو بلا کر بتایا کہ مقتولہ کو کوئی قتل کر گیا ہے۔

میں ان امکانات پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ زبردستی والا معاملہ نہیں تھا۔ بات ساری آشنائی کی تھی اور کچھ گڑبڑ ہوگئی جس کے نتیجے میں مقتولہ قتل ہوگئی۔ ابھی تو میں نے اپنے مخبروں سے رپورٹیں لینی تھیں۔ مقتولہ کی سرگرمیاں بہر حال خفیہ اور پُراسرار تھیں۔ میں نے نوکرانی کو اپنے پاس بلا کر بٹھالیا۔ غریب عورت کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کو تسلیاں دیں اور حوصلہ افزائی کی۔ یہ بھی کہا کہ وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ بڑے لوگوں کے گناہ بڑے بڑے ہوتے ہیں اور اکثر ان کی سزا چھوٹے چھوٹے لوگوں کو ملتی ہے۔ میں نے اس کو یہ گھسے پٹے لفظ بھی کہے کہ کسی کو پتہ نہیں لگنے دیا جائے گا کہ اس نے میرے ساتھ کیا باتیں کی ہیں۔

میں نے اس سے ایک دو باتیں پوچھیں، چھوٹے چھوٹے ایک دو سوال کیے اور کچھ باتیں اس نے از خود ہی بتا دیں، اس طرح جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یوں تھیں کہ اس نوکرانی کو ٹھیکیدار نے کہا تھا کہ وہ نئی بیوی کا زیادہ خیال رکھا کرے اور زیادہ وقت اس کی خدمت خاطر میں لگایا کرے۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو مقتولہ کی ملازمہ سمجھے۔ اس نوکرانی کو میں نے غور سے دیکھا اور اس کا بولنے کا انداز دیکھا تو میں نے یہ رائے قائم کی کہ دکھاوے کے لیے بھولی اور سیدھی سادی بنی ہوئی ہے۔ ویسے اچھی خاصی چالاک اور جہاندیدہ عورت ہے۔ میں نے کچھ باتیں واردات سے ہٹ کر بے تکلفی سے کیں تو وہ میرے ساتھ ذرا اور فری ہوگئی۔

اس نے بتایا کہ مقتولہ نے اس کو پیسے دینے شروع کر دیئے اور اس کو اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا۔ نوکرانی نے مجھ کو صاف لفظوں میں کہا کہ وہ بچی تو نہیں تھی کہ کچھ نہ سمجھتی، وہ سمجھ گئی کہ مقتولہ اس کو اپنے خفیہ کاموں میں استعمال کرنا چاہتی ہے۔

نوکرانی نے یہ خاص طور بتایا کہ مقتولہ ٹھیک چال چلن کی لڑکی نہیں تھی اور اس کی یہ تربیت اس کی ماں نے کی تھی۔ اس کے باپ کی بابت نوکرانی نے بتایا کہ لالچی اور دھوکہ

فریب کرنے والا آدمی ہے لیکن بالکل غریب اور مسکین بنا رہتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ مقتولہ یہاں سے پیسے اڑا کر اپنے ماں باپ کو دیا کرتی تھی؟

''دوسروں کو شک ہوگا''۔۔۔ نوکرانی نے جواب دیا۔۔۔ ''مجھ کو شک نہیں، مجھ کو تو یقین ہے۔ یقین اس طرح ہے کہ کئی بار بی بی (مقتولہ) نے مجھ کو پیسے دیئے اور کہا کہ یہ اس کی ماں کو دے آؤں۔ ٹھیکیدار صاحب کو تو پتہ ہی نہیں کہ ان کی جیب میں کس طرح دولت آتی ہے اور یہ کدھر جا رہی ہے۔ اس گھر میں دولت کا تو کوئی حساب کتاب ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کو کبھی شک بھی نہیں ہوا کہ ان کی نئی دلہن نے نہر کا رخ کدھر کو پھیرا ہوا ہے''۔

میں نے نوکرانی کو شاباش دی اور خوب حوصلہ افزائی کر کے کہا کہ وہ اگر پیسے اس کی ماں تک پہنچاتی رہی ہے تو پھر مقتولہ کے دوستوں کو اس کے پیغام بھی پہنچاتی ہوگی۔

نوکرانی اب بولنے پر آ گئی تھی۔ اس نے بڑے صاف لفظوں میں بتایا کہ یہ تو اس کا ایک خاص اور خفیہ کام تھا جس کا اس کو مقتولہ سے بہت انعام ملتا تھا۔ اس نے مقتولہ کے محلے کے ایک نوجوان آدمی کا نام لے کر بتایا کہ شادی سے پہلے مقتولہ کی اس کے ساتھ دوستی چل رہی تھی۔ یہ پاک محبت والی دوستی نہیں تھی بلکہ یہ ناپاک تعلقات والا معاملہ تھا۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ ان کی شادی ہو جائے گی۔ دونوں ایک ہی ذات اور برادری کے تھے لیکن ٹھیکیدار کو یہ لڑکی اتنی اچھی لگی کہ اس کے باپ سے رشتہ مانگا اور باپ نے بیٹی ٹھیکیدار کے ساتھ بیاہ دی۔ میرے کہنے پر نوکرانی نے بتایا کہ یہ تو سب کہتے ہیں کہ ٹھیکیدار نے لڑکی کو منہ مانگی قیمت دے کر خریدا ہے۔

نوکرانی نے خاص بات یہ بتائی کہ مقتولہ کے اس دوست کے ساتھ تعلقات شادی کے بعد بھی چلتے رہے تھے۔ ٹھیکیدار کو تو مقتولہ اپنا صرف شرعی خاوند سمجھتی تھی، عملاً اس کا خاوند یہ دوست تھا۔

نوکرانی نے بتایا کہ ٹھیکیدار آٹھ دس دنوں بعد ایک دو راتیں باہر رہتا تھا۔ وہ ٹھیکیداری کے سلسلے میں بڑے شہر چلا جایا کرتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں مقتولہ اپنے دوست کو رات کے وقت اپنے گھر یعنی ٹھیکیدار کے گھر بلایا کرتی تھی۔ پیغام نوکرانی لے

جاتی تھی۔ دوست عموماً آدھی رات سے ذرا پہلے آیا کرتا تھا اور اپنے آنے کی اطلاع اس طرح دیتا تھا کہ پہلو والی چھوٹی گلی میں آ کر باہر دیوار پر چھوٹا سا پتھر اٹھا کر یا کوئی اور سخت چیز دو تین بار مارتا تھا۔ بیڈ روم کی دیوار اس گلی کی طرف تھی۔ ٹک ٹک کی آواز بیڈ روم میں سنائی دیتی تھی۔ مقتولہ اپنے دوسرے کمرے میں سے گزر کر بیٹھک میں جاتی اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر دوست کو اندر لے آتی تھی۔ اس کو ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا کہ اندر سے کوئی بیڈ روم میں آ جائے گا۔ اس کے کمرے میں تو دن کے وقت بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ ٹھیکیدار کی بہو نے ٹھیک کہا تھا کہ مقتولہ نے اپنی الگ تھلگ ایک زندگی بنا رکھی تھی۔

تین بیٹوں کا غصہ اور نوجوان سوتیلی ماں

پھر مقتولہ کے اس دوست کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد بھی مقتولہ اس کو بلاتی رہی اور وہ آتا رہا لیکن ایک روز دوست نے اچانک مقتولہ کے ساتھ یہ تعلق توڑ دیا۔ یہ چھ سات مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔ مقتولہ نے نوکرانی کو کہا کہ وہ اس کے دوست کو کہے کہ آج رات آ جائے۔ نوکرانی دوست سے ملی اور پیغام دیا۔ دوست نے صاف لفظوں میں کہا کہ اس کو کہہ دو کہ آج سے ہمارا تعلق ختم ہے اور آئندہ کبھی مجھ کو نہ بلائے۔

یہاں مجھ کو شک ہوا کہ یہ رقابت والا معاملہ ہوگا۔ رقابت بھی اتنی شدید ہوگی جس کا نتیجہ قتل کی واردات کی صورت میں سامنے آیا۔ میں نے نوکرانی سے پوچھا کہ اس دوست کے علاوہ مقتولہ کا کوئی اور دوست ہوگا۔ نوکرانی نے کہا کہ مقتولہ کا چال چلن کچھ ایسا ہی تھا لیکن وہ اس کے کسی اور دوست کو نہیں جانتی نہ اس نے اس کو کبھی کسی اور شخص کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد ٹھیکیدار کا خاص ملازم اقبال تھا جو مقتولہ کے کمرے میں آتا جاتا تھا۔ نوکرانی نے وہی خیال ظاہر کیا جو ٹھیکیدار کی بہو میرے ساتھ کر چکی تھی۔ وہ یہ کہ ٹھیکیدار نے اقبال کو مقتولہ پر جاسوس مقرر کیا تھا کہ اس کی نگرانی کرتا رہے اور اگر یہ کوئی خفیہ حرکت کرے تو ٹھیکیدار کو بتائے۔ ظاہری طور پر ٹھیکیدار نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اقبال کو اس نے مقتولہ کی خدمت پر مامور کیا تھا۔

میں نے نوکرانی کو کہا کہ سنا ہے جب اقبال مقتولہ کے کمرے میں ہوتا تھا تو اس کو یعنی نوکرانی کو بھی کمرے میں جانے کی ممانعت تھی..... نوکرانی نے میرے اس سوال کا

جواب بھی خوب کھل کر دیا۔ اس نے بتایا کہ ایک روز اقبال مقتولہ کے کمرے میں تھا کہ نوکرانی اندر چلی گئی۔ نوکرانی نے دیکھا کہ اقبال کو مقتولہ نے اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا اور دونوں کے منہ جڑے ہوئے تھے۔ نوکرانی کو دیکھ کر مقتولہ نے اس کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ جب اقبال اس کے کمرے میں ہو تو وہ کمرے میں نہ آیا کرے۔ اقبال چلا گیا تو مقتولہ نے نوکرانی کو بلایا اور اس کا منہ بند کرنے کے واسطے اس کو کچھ پیسے دیئے۔ نوکرانی کا منہ تو بند ہی رہنا تھا۔ اس کو تنخواہ کے علاوہ مقتولہ سے پیسے ملتے رہتے تھے۔ غریب عورت کی یہی ضرورت تھی۔ اس کی تو بالائی آمدنی لگی ہوئی تھی۔

''سنا ہے اقبال کا اس گھر پر بہت ہی اعتماد ہے''— میں نے کہا— ''گھر کا ہر فرد کہتا ہے کہ اقبال بہت ہی شریف اور دیانتدار آدمی ہے''۔

''یہ بالکل ٹھیک ہے''— نوکرانی نے کہا— ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال دیانتدار آدمی ہے اور ایک پیسے کا بھی دھوکہ نہیں دیتا اور اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت نہیں۔ یہ جو میں نے آپ کو سنایا ہے کہ اقبال کو بی بی کے کمرے میں کس حالت میں دیکھا تھا، یہ سب بی بی کی کرتوت ہے۔ اس کا چال چلن کچھ ایسا ہی تھا۔ اقبال کا اخلاق ایسا ہرگز نہیں''۔

باتیں ہوتی رہیں اور اس دوران نوکرانی نے بتایا کہ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مقتولہ اقبال کو بھی فالتو پیسے دیتی رہتی ہے۔ عید پر اقبال کو اس نے بڑھیا اچھے کپڑے سلوا دیئے تھے اور ان سردیوں کے شروع میں اس کو ایک نئی اور قیمتی جرسی لے دی تھی۔ ایسی جرسی ٹھیکیدار کے بیٹے ہی پہن سکتے ہیں۔

میں نے نوکرانی سے پوچھا کہ مقتولہ اقبال کو رات کے وقت اپنے بیڈ روم میں بلاتی ہوگی۔ نوکرانی نے بتایا کہ مقتولہ نے اس کو کبھی نہیں کہا تھا کہ اقبال کو کہنا کہ آج رات آجائے۔ بہرحال نوکرانی کو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا نہ وہ یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکتی تھی۔

پھر میں نے نوکرانی سے پوچھا کہ ٹھیکیدار کے بیٹوں میں سے کوئی مقتولہ کے ساتھ اتنا بے تکلف ہوگا اور اس کے کمرے میں آتا جاتا رہتا ہوگا اور کبھی مقتولہ نے نوکرانی کو کہا ہوگا کہ وہ فلاں لڑکے کو اس کے پاس بھیج دے۔

نوکرانی نے وہی جواب دیا جو ٹھیکیدار کی بہو سے میں پہلے ہی سن چکا تھا۔ بڑا بیٹا تو نمازی پرہیزگار آدمی تھا اور وہ مقتولہ کے ساتھ بولتا چالتا ہی نہیں تھا۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا رویہ بھی یہی تھا البتہ درمیانے بیٹے کی بابت نوکرانی نے کہا کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں پھر بھی اس نے اس لڑکے کو مقتولہ کے کمرے میں بیٹھے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکے پر اس وجہ سے شک کیا جا سکتا تھا کہ اخلاقی لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں سے بہت مختلف تھا۔ آوارہ سا لڑکا تھا اور آزاد خیال بھی تھا۔

میں ابھی نوکرانی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا کہ ٹھیکیدار کے تینوں بیٹے بڑے غصے کی حالت میں میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ ہسپتال سے آرہے تھے۔ میں نے ان کو ایک خاص ٹسٹ کے واسطے بھیجا تھا۔ یہ ٹسٹ تو لاہور میں ہونا تھا لیکن یہاں کے ڈاکٹر نے ان کے جسموں سے کچھ مواد لینا تھا۔ پوسٹمارٹم ہو چکا تھا اور یہ تینوں فارغ ہو کر سیدھے میرے پاس آگئے۔ وہ احتجاج اور غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اس ناراضگی کی وجہ پوچھی۔

بڑے بیٹے نے کہا کہ میں نے ان کو مشتبہ سمجھا ہے اور اس واسطے ڈاکٹر کے پاس اس ٹسٹ کے واسطے بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تینوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی کبھی مقتولہ سے منہ بھی نہیں لگایا تھا اور ان پر بڑا ہی توہین آمیز اور شرمناک شک کیا گیا اور ڈاکٹر کے پاس بھیجا گیا۔

''کیا ہمارے والد صاحب نے ہمارے خلاف شک کیا ہے؟''— درمیانے بیٹے نے پوچھا۔

میں نے نوکرانی کو باہر بٹھا دیا اور ان تینوں بھائیوں کو بٹھایا۔ میں ان کے غصے کے جواب میں غصہ نہیں جھاڑنا چاہتا تھا۔ ان کو ٹھنڈا کرنے کا ارادہ تھا۔ بڑے بیٹے نے کہا کہ ٹھیکیدار گھر آیا تو اپنی بیوی کو مرا ہوا دیکھ کر اس نے تینوں کو بلایا اور یہ شک کیا کہ ان تینوں میں سے کسی نے اس کو قتل کیا ہے اور وہ بتا دے۔ اس وقت بھی ان کو غصہ آیا تھا لیکن باپ پر وہ غصہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں نے ان کو سمجھایا کہ ان کے باپ نے میرے آگے ان پر شک ظاہر نہیں کیا اور یہ تفتیش کا معمول ہے کہ تفتیش کرنے والے کے ذہن میں جو آتا ہے اس کی وہ پوری طرح

تسلی کر لیتا ہے۔ مختصر بات یہ کہ میں نے ان کو بہت کچھ کہہ سن کر ٹھنڈا کر لیا۔ یہ میں نے اس واسطے کیا کہ ان سے کچھ باتیں معلوم کرنی تھیں۔ یہ باتیں وہی تھیں جو میں ٹھیکیدار کی بہو اور نوکرانی سے پوچھ چکا تھا۔ امید تھی کہ شاید کوئی اور بات سامنے آجائے یا کم از کم ان تین بھائیوں کی بابت ہی کچھ اندازہ ہو جائے کہ مقتولہ کی بابت ان کے خیالات کیا ہیں۔

یہ میں آپ کو مختصراً بتا دیتا ہوں تفصیلی باتیں پہلے تحریر کر دی ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ مقتولہ کے ساتھ ان کا کوئی لڑائی جھگڑا اور کوئی تنازعہ نہیں تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ مقتولہ نے اس گھر میں آکر کبھی یہ دعویٰ کیا ہی نہیں تھا کہ وہ اس گھر میں مالک ہے اور اس کا حکم چلے گا۔ ٹھیکیدار کی پہلی بیوی فوت ہو گئی تو گھر کا کام کاج، باورچی خانہ اور دیگر انتظامات بڑے بیٹے کی بیوی نے سنبھال لئے جس میں مقتولہ نے کبھی دخل اندازی نہیں کی تھی اور نہ کبھی ایسی فرمائش کی تھی کہ آج وہ فلاں چیز کھانا چاہتی ہے وغیرہ۔

''سیدھی بات ہے صاحب!''—بڑے بیٹے نے کہا—''یہ لڑکی ہمارے باپ کی بیوی نہیں داشتہ تھی اور ہم اس کو اپنی سوتیلی ماں سمجھتے ہی نہیں تھے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس نے ہم تینوں کے ساتھ فری ہونے کی کوشش کی تھی۔ ہم تینوں جانتے تھے کہ یہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں''۔

''اس کے ساتھ ہماری دوستی بھی نہیں تھی دشمنی بھی نہیں تھی''—درمیانے بھائی نے کہا—''اصل قصور تو ہمارے جناب والد صاحب کا ہے جنہوں نے اس عمر میں اس نوعمر لڑکی کے ساتھ شادی کی اور یہ بھی نہ دیکھا کہ لڑکی بدنام ہے۔ اس لڑکی کا ایسا قصور ہرگز نہیں کہ اس نے زبردستی آکر ہمارے والد صاحب پر قبضہ کر لیا تھا۔ قصور ہمارے باپ کا تھا جس نے اس لڑکی کو خریدا اور اس سے بڑا قصوروار لڑکی کا باپ ہے جس نے ہمارے باپ سے رقم وصول کی''۔

نوکرانی نے میرے دل میں اقبال کی بابت شک ڈال دیا تھا۔ میں نے ان تینوں بھائیوں سے اقبال کی بابت پوچھا۔ تینوں بھائی جیسے بیک زبان بول اٹھے کہ اقبال ایسا آدمی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ زیادہ دیر مقتولہ کے کمرے میں رہتا تھا لیکن وہ سو فیصد دیانتدار اور وفادار آدمی ہے۔ وہ بیچارہ تو اپنے گھر کی ضروریات کی خاطر دن رات اس نوکری میں مصروف رہتا ہے۔ بھائی نے کہا کہ اقبال اپنی نوکری کو خطرے میں نہیں ڈال

سکتا۔ اکیلا کمانے والا ہے۔ باپ معذور اور بہنیں شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

ان تینوں بھائیوں نے جو شور شرابہ اور احتجاج کیا تھا وہ اگر کوئی اور سنتا تو فوراً فتویٰ دے دیتا کہ یہ تو بالکل ہی بے گناہ ہیں اور اپنے خلاف معمولی سے شک کو بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں لیکن میرا دماغ ایک عام آدمی کا دماغ نہیں بلکہ پولیس آفیسر کا دماغ تھا۔ اصل مجرم اسی طرح شور شرابا کر کے یا آنسو بہا کر یا جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے آپ کو بے گناہ ظاہر کیا کرتے ہیں۔ بعض بے گناہی کی ایکٹنگ بڑی ہی مہارت سے کرتے ہیں۔ میں ان تینوں کی باتوں اور احتجاج سے ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ ان کو اسی طرح چھٹی دے دیتا۔ میں نے اپنا شک رفع کرنا تھا۔ ان کو مزید ناراض بھی نہیں کرنا تھا۔ میرے پاس ایک اور ذریعہ تھا۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو سنگار میز، اس کی درازوں اور ٹین کی چھوٹی سی صندوقچی سے فنگر پرنٹ (انگلیوں کے نشان) اتارنے کا کام دیا تھا۔ یہ کام اس نے کر لیا تھا اور میں نے دیکھا کہ انگلیوں کے بڑے صاف نشان ہمارے خاص کاغذ پر منتقل ہو گئے تھے۔

میں نے ان تینوں بھائیوں سے کہا کہ میں ایسا بندوبست کر رہا ہوں کہ ان کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی اور کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔ ان کو کہا کہ وہ کورے کاغذ پر اپنی پانچوں انگلیوں کے نشان لگا دیں۔ انہوں نے کچھ پس و پیش کی۔ میں نے ان کو کہا کہ یہ انہی کے فائدے میں ہے۔ بہر حال میں نے تینوں کے انگلیوں اور انگوٹھوں کے نشان الگ الگ کاغذ پر لے لیے۔ اصل نشانات اور ان بھائیوں کے لئے ہوئے نشانات کو معائنے اور رپورٹ کے واسطے پھلور جانا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ مجھ کو مل گئی تھی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اس کو مارا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مرنے سے پہلے مقتولہ کی آبروریزی ہوئی ہے۔ موت کا وقت رات گیارہ بجے لکھا گیا تھا۔

ٹھیکیدار کی انگلیوں کے نشانات بھی لینے تھے لیکن میں نے سوچا کہ اس کو بیوی کی لاش واپس مل گئی ہے اور وہ کفن دفن کے انتظامات میں مصروف ہوگا۔ اس کو میں نے دن کے پچھلے پہر تھانے بلانا تھا..... میں نے ان بھائیوں کو رخصت کر دیا۔ تینوں میرے دفتر سے نکلے لیکن درمیان والا بھائی برآمدے سے واپس آگیا اور میرے سامنے آن بیٹھا۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھوڑی سی الگ تھلگ بات کرنا چاہتا ہے۔

''میں یہ بات اپنے بھائیوں کے سامنے نہیں کر سکتا تھا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''ہمارے باپ کی اس بیوی نے مجھ کو پھانسنے کی انتہا درجے کوشش کر ڈالی تھی لیکن میں نے اس کو لفٹ نہیں کرائی۔ ہماری امی فوت ہوگئی تو اس لڑکی نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ کبھی تو موقع دیکھ کر میرے کمرے میں آجاتی تھی یا مجھ کو اپنے کمرے میں بلاتی رہتی تھی۔ میں دو تین مرتبہ اس کے کمرے میں چلا گیا تو اس نے بڑے ہی جذباتی اور پیارے سے انداز میں میرے ساتھ محبت کا اظہار کیا۔ میں اس محبت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ اپنے والد کو بتا دوں لیکن اس واسطے چپ رہا کہ یہ بڑی چالاک اور فریب کار لڑکی ہے، کہیں ایسا نا ٹک نہ کھیل جائے کہ مجھ کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ آخر میں نے بڑی سختی سے اس کو دھتکار دیا حالانکہ میں کوئی شریف آدمی نہیں۔ میرے بارے میں آپ کسی سے بھی پوچھیں گے تو وہ یہی بتائے گا کہ یہ لڑکا اچھے کردار والا نہیں، عیاش اور آوارہ طبع بندہ ہے..... میں نے آپ کو حقیقت بتا دی ہے، آپ اپنا شک رفع کر لیں''۔

یہاں میں پھر کہوں گا کہ وہ تو بات کر کے چلا گیا جیسے مجھ کو اس نے اپنی بات سے قائل کر لیا ہو لیکن میرے دماغ میں شک قائم رہا۔ یہ شک کسی ثبوت یا قابل اعتماد شہادت کے بغیر رفع نہیں ہو سکتا تھا۔

تینوں بھائی چلے گئے تو میں نے نوکرانی کو پھر بلایا۔ اسے کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ اس کی میرے ساتھ کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس کو بھی رخصت کر دیا۔

بھائیوں کے پیچھے پیچھے میں نے ایک کانسٹیبل کو یہ کہہ کر دوڑا دیا کہ وہ ٹھیکیدار کے گھر جائے اور اس کے ایک ملازم اقبال کو اپنے ساتھ لے آئے۔ مجھ کو معلوم تھا کہ اب اقبال ٹھیکیدار کے ساتھ ہی ہوگا۔ کانسٹیبل کو میں نے خاص طور پر یہ بات کہی کہ یہ تینوں بھائی جا رہے ہیں، خیال رکھنا کہ ان کی اقبال کے ساتھ کوئی بات نہ ہو سکے۔ کہنا کہ اس کو بہت جلدی تھانے جانا ہے۔

جیسا کہ ایسی وارداتوں میں ہوتا ہے کہ اُدھر واردات ہوئی اِدھر ایک دو خوشامدی قسم کے معزز افراد اپنے نمبر بنانے کے واسطے تھانیدار کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور اندر کی خبریں سناتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر بڑی کارآمد باتیں بتا جاتے ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے جو محض چغل خور ہوتے ہیں۔ میں جب کانسٹیبل کو بھیج چکا تو ایسا ہی ایک بظاہر معزز

آدمی آ گیا۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے گی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ٹھیکیدار چونکہ دولت مند آدمی ہے اور وہ آدھے راستے میں آ کر دولت مند بنا ہے اس واسطے قصبے میں اس کے حاسد بھی موجود ہوں گے۔

میں نے اس شخص کا بڑا خندہ پیشانی سے استقبال کیا، بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کس طرح آیا ہے اور میں اس کی کیا خدمت کروں۔ یہ میں رسمی طور پر کہہ رہا تھا، مجھ کو تو معلوم تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔

''وہ ہو گیا ہے جو سب کو معلوم تھا ہوگا''۔۔۔ اس شخص نے کہا۔۔۔ ''ٹھیکیدار کو دولت نے اندھا کر دیا تھا، یہ بھی نہ سوچا کہ کم سن لڑکی کو ہی گھر لانا ہے تو کسی عزت دار گھرانے کی لڑکی لاتا۔ لڑکی بھی ایک بے غیرت خاندان کی لایا اور لڑکی نے ٹھیکیدار کے گھر میں چکلا کھول لیا۔ اس لڑکی کی ماں ابھی تک اپنے آپ کو چلاتی ہے۔ ٹھیکیدار کو اسی عورت نے پھانسا اور لڑکی دے کر رقم وصول کی تھی۔ اب وہ لڑکی کو چلا رہی ہے''۔

''چوہدری صاحب!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یہ باتیں تو مجھ کو معلوم ہو چکی ہیں، آپ یہ بتائیں کہ مقتولہ نے اپنے خاوند کے گھر میں چکلا کھول لیا تھا تو اس کے گاہک کون کون تھے اور وہ گاہک کون ہو سکتا ہے جو لڑکی کو قتل کر گیا؟''

''مجھ کو تھوڑی سی مہلت دیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں آپ کو دو چار نام بتاؤں گا..... یہ ذہن میں رکھ لیں کہ مقتولہ کی ماں پکی چور ہے اور یہی عادت مقتولہ میں تھی۔ آپ ابھی اس تھانے میں تعینات نہیں ہوئے تھے۔ اس عورت نے ایک چوری کی تھی اور مال اس کے گھر سے برآمد ہوا تھا۔ کچھ بھلے لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے یہ معاملہ تھانے میں نہیں آنے دیا تھا۔ اس لڑکی کے قصے تو بہت ہی مشہور ہیں''۔

میں نے یہ سنا کہ مقتولہ میں ماں والی چوری کی عادت تھی تو مجھ کو یہ شک ہوا کہ یہ جو اس کے زیورات بکھیرے گئے اور سنگار میز کی تلاشی لی گئی تو یہ اس لیے کیا گیا ہوگا کہ گھر میں کوئی چیز چوری ہو گئی ہوگی اور ٹھیکیدار کے بیٹوں نے مقتولہ کی یہ اشیاء اور درازیں اچھی طرح دیکھی ہوں گی لیکن یہاں سوال پھر سامنے آتا ہے کہ اس کو بے آبرو کیا گیا اور پھر قتل کر دیا گیا۔ کیا یہ اس کو سزا دی گئی تھی؟ یہاں سے آگے مجھ کو پھر اندھیرا نظر آتا تھا، بہرحال میں نے اس شک کو اپنے دماغ میں محفوظ کر لیا۔ اس معزز مخبر اور خوشامدی نے اس کے بعد جتنی

باتیں کیں وہ محض حسد تھا جس کا وہ اظہار کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار کو وہ زبردست پاپی اور نہ جانے کیا کیا ثابت کر رہا تھا۔ وہ ابھی رخصت ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اتنے میں میرا بھیجا ہوا کانسٹیبل اقبال کو لے کر آ گیا۔ اقبال کو باہر بٹھا کر وہ میرے دفتر میں آیا اور اطلاع دی۔ میں نے اس معزز آدمی کو چلتا کیا۔

''ایک خاص بات سن لیں صاحب!'' — کانسٹیبل نے مجھ کو کہا — ''میں جس شخص اقبال کو ساتھ لایا ہوں، اس پر مجھ کو کچھ شک ہو گیا ہے۔ تھانے آنے سے تو ہر کوئی گھبراتا ہے لیکن اس کی گھبراہٹ دیکھنے والی تھی۔ میں نے ٹھیکیدار کے گھر کے باہر اس کو کہا کہ تھانے چلو تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور منہ کھل گیا پھر اس طرح لگا جیسے اس پر غشی آ جائے گی۔ میرے ساتھ چل تو پڑا لیکن اس سے چلا نہیں جاتا تھا اور منہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ راستے میں اس نے مجھ کو روک لیا اور کہنے لگا کہ میں تمہیں پیسے دوں گا، تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے تھانیدار کیا پوچھے گا اور میں کیا جواب دوں۔ میں نے اس کو تسلی دی تو پھر یہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ وہ لوگ جو جرم کرتے ہیں وہ تھانے میں کس طرح کا بیان دیتے ہیں۔ اس نے پھر کہا کہ میں تمہیں بہت پیسے دوں گا، مجھ کو ٹھیک بتاؤ کہ میں تھانیدار صاحب کے ساتھ کس طرح بات کروں..... یہ تھانے تک مجھ سے یہی پوچھتا آیا اور میں اس کو حوصلہ اور تسلی دیتا رہا۔ مجھ کو اس پر بڑا شک ہے''۔

یہاں میں ایک بات کہتا ہوں۔ آج کل کے کانسٹیبل آپ نے دیکھے ہوں گے۔ میں ان کو دیکھتا ہوں تو اس طرح لگتا ہے جیسے یہ لوگ پولیس کے محکمے کے واسطے ہی نہیں بلکہ جو وردی انہوں نے پہنی ہوئی ہوتی ہے اس وردی کے واسطے بھی یہ سراسر توہین کے مجسمے ہوتے ہیں۔ یہ کانسٹیبل اپنی وردی کی بے ادبی کرتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں ایسے کانسٹیبل ہوا کرتے تھے جو اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ آج کل کے تھانیداروں سے زیادہ سیانے اور تجربہ کار ہوتے تھے۔ اپنا کچھ وقار بھی رکھتے تھے۔ میرا یہ کانسٹیبل ایسے ہی کانسٹیبلوں میں سے تھا۔ اس نے اقبال کی باتیں غور سے سنیں وراس کا انداز اور روّیہ دیکھا تو اس نے مجھ کو بتا دیا کہ یہ شخص بہت ڈرپوک ہے یا واردات کے ساتھ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ میں نے اس کو کہا کہ اس کو اندر بھیج دو۔

کانسٹیبل باہر نکلا تو ایک دو منٹ بعد ایک خوبرو جوان، دروازے میں آن کھڑا

ہوا۔ مجھ کو اس کا قد کاٹھ بڑا اچھا لگا لیکن سر آگے کو جھکا ہوا اور کندھے بھی کچھ سکیڑے ہوئے تھے۔ اس کی بابت کانسٹیبل نے مجھ کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اگر یہ نوجوان سیدھا کھڑا ہوتا تو دل کو بہت ہی اچھا لگتا۔

''آ جاؤ اقبال!'' — میں نے مسکرا کر کہا — ''آؤ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ''۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا کرسی تک آیا۔ مجھ کو ایک بار پھر کہنا پڑا کہ بیٹھ جاؤ۔ تب وہ نظریں میرے چہرے پر جمائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ نظریں جمائے بیٹھنے کو بیٹھنا نہیں بلکہ ڈھیر ہونا کہا جاتا ہے۔

''تم اتنا زیادہ ڈرے ہوئے کیوں ہو اقبال؟'' — میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے منہ سے جو جواب نکلا وہ نہ نہیں تھا اور نہ ہی ہاں تھا بلکہ وہ کچھ کہنے لگا تو اس کی زبان ہکلا گئی۔ وہ غالباً یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ ڈرا ہوا نہیں لیکن اس کا یہ خیال بھی تھا کہ کہہ دے کہ میں آپ سے ڈر گیا ہوں۔ میں نے اس کی گھبراہٹ یا خوف قائم رہنے دیا۔ کانسٹیبل میرے دماغ میں ایک شک پیدا کر گیا تھا۔

''تمہاری بی بی قتل ہو گئی ہے'' — میں نے کہا — ''کیا تم میری کچھ رہنمائی کر سکتے ہو؟ مجھ کو معلوم ہے کہ اس کے ساتھ تمہارا بڑا گہرا اور رازداری والا تعلق تھا''۔

''نہیں جناب!'' — اس نے کانپتی ہکلاتی زبان میں کہا۔

''تمہارے تو منہ سے بات بھی نہیں نکل رہی۔ صاف کہہ دو کہ اس کے ساتھ تمہارا کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں تھا لیکن میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس خاصی زیادہ شہادت آ گئی ہے کہ تمہارا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ اگر کہو تو میں ایک دو مثالیں سنا دیتا ہوں''۔

میں نے اس کو وہ بات سنائی کہ نوکرانی بیڈروم میں گئی تو اقبال مقتولہ کے بازوؤں میں تھا اور ان کے منہ جڑے ہوئے تھے۔ اب تو اس اقبال کی حالت اور ہی زیادہ بگڑ گئی۔ میں نے اس کو ایک بار پھر کہا کہ مقتولہ کے ساتھ اگر اس کی کچھ بے تکلفی تھی تو یہ کوئی جرم نہیں تھا وہ اس کا اقرار کرنے سے نہ گھبرائے لیکن اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے بے تعلق سی دو تین اور باتیں کیں تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے بھی بے

ن ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کو مجھ کہ اس پر کچھ غصہ آنے لگا۔

میں نے جیب سے کاغذ کا وہ ٹکڑا نکالا جو مجھ کو مقتولہ کے پلنگ کے نیچے پڑا ملا تھا۔ اس کا رکی تہیں کھول کر میں نے کاغذ اس کے آگے رکھا اور پوچھا کہ یہ کس کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

اس نے عجیب حرکت کی : پہلے اس کاغذ کو دیکھا اور یک لخت اپنے ہاتھ اپنے سینے پر رکھے اور ایک ہاتھ قمیض کی اوپر والی جیب میں لے گیا پھر جرسی کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے جیسے اس نے کوئی چیز گم کر دی ہو اور اس کو جیبوں میں تلاش کر رہا ہو۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس نے یہ پرچی اپنی جرسی کی جیب میں یا قمیض کی جیب میں رکھی تھی اور اب اس کو پتہ لگا ہے کہ یہ پرچی کہیں گر پڑی تھی۔ اس کو جب اپنی جیبوں میں یہ پرچی نہ ملی تو اس کا جسم جیسے بالکل ہی جام ہو گیا ہو۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا کہ یہ کس کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

''پتہ نہیں جناب!'' ــــ اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

''پھر اپنی جیبوں میں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟'' ــــ میں نے پوچھا۔ کچھ دیر اس نے جواب نہ دیا تو میں نے کہا ــــ ''یہ تحریر تمہاری ہے اور تم یہ پرچی اپنی جیبوں میں ڈھونڈ رہے تھے۔ تم جانتے ہو کہ مجھ کو یہ پرچی کہاں سے ملی ہے۔ اب بتاؤ کہ یہ پرچی وہاں مقتولہ کے پلنگ کے قریب کس وقت گری تھی''۔

''مجھ کو پتہ ہی نہیں چلا کہاں گری تھی'' ــــ اس نے رک رک کر جواب دیا۔

''یہ تم نے اپنی کس جیب میں رکھی تھی؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''شاید جرسی کی کسی جیب میں رکھی تھی'' ــــ اس نے بڑی ہی نحیف اور مریل سی آواز میں جواب دیا۔

مجھ کو اچانک یاد آ گیا کہ مقتولہ کے پلنگ سے مجھ کو کسی جرسی کا ایک بٹن ملا تھا۔ تب خیال آیا کہ اقبال نے جرسی پہن رکھی ہے اور یہ خاصی قیمتی جرسی ہے۔ نوکرانی نے مجھ کو بتایا تھا کہ مقتولہ نے اقبال کو ان سردیوں کے شروع میں بڑی قیمتی اور نئی جرسی دی تھی۔ میں نے اقبال کی جرسی کے بٹن دیکھے تو وہ سو فیصد ویسے ہی تھے جیسا بٹن مجھ کو پلنگ سے ملا تھا۔ میں نے اس کو کھڑا ہونے کو کہا۔ وہ کھڑا ہوا تو اس طرح لگا کہ بجلی بڑی زور سے چمکی ہو اور مجھ کو دونوں جہاں نظر آ گئے ہوں...... اقبال کی جرسی کا نیچے سے اوپر کو دوسرا بٹن ٹوٹا ہوا تھا یعنی بٹن تھا ہی نہیں، وہاں صرف دھاگہ تھا۔

''یہ لو اقبال!'' ــــ میں نے اپنی جیب سے بٹن نکال کر اس کے آگے رکھ دیا اور کہا ــــ ''تمہاری جرسی کا بٹن میرے پاس ہے۔ اتنی اعلیٰ جرسی کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا ہے اور یہ اچھی نہیں لگتی۔ بٹن لے لو لیکن اس سے پہلے مجھ کو یہ بتا دو کہ بٹن مقتولہ کے پلنگ پر کس طرح گرا تھا۔ یہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ یہ گزشتہ رات اس کے پلنگ پر گرا تھا''۔

میرے پاس الفاظ کا اتنا ذخیرہ نہیں جن کے ذریعے میں بیان کر سکوں کہ بٹن دیکھ کر اس نوجوان کی کیا حالت ہوئی۔ میرا تو خیال ہے کہ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی، صرف آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر تریلی سی پھوٹ آئی۔ جرم کے اقرار کا اس سے زیادہ واضح اظہار اور کیا ہو سکتا ہے!

میں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور دل ہی دل میں کہا، یا اللہ، کیا تیری ذات باری مجھ جیسے گناہ گار پر بھی اس قدر مہربان ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک معجزہ ہے...... پھر میں نے دل ہی دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

میں انگریزوں کے وقت کی بات کر رہا ہوں جب تھانیدار اپنی تفتیش کی کامیابی پر خوشیاں منایا کرتے تھے کہ اصل ملزم پکڑ لیا ہے۔ آج کے تھانیدار اپنی اس کامیابی پر خوش ہوتے ہیں کہ ان کی مرضی اور ڈیمانڈ کے مطابق مک مکا ہو گیا ہے خواہ کسی کا پورا خاندان ہی قتل ہو گیا ہو۔

مقتولہ کی دھمکیاں اور بلیک میلنگ

میں نے اس ہیڈ کانسٹیبل کو بلوایا جس نے انگلیوں کے نشان لیے تھے۔ اس کو کہا کہ وہ اقبال کی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور انگوٹھوں کے نشان کاغذ پر لے لے۔ ہیڈ کانسٹیبل پیڈ لے آیا اور اقبال کا ایک ہاتھ پکڑ کہ انگوٹھا اور انگلیاں پیڈ پر رکھے۔ اقبال نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور ہنگامہ بپا کر دیا۔ وہ لڑتا جھگڑتا نہیں تھا بلکہ روتا اور منتیں کرتا تھا کہ پہلے اس کی بات سن لی جائے اور اس پر رحم کیا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آپ مسلمان ہیں اور اللہ اور رسولؐ اور قرآن کے نام پر مجھ پر رحم کریں میں غریب باپ کا بیٹا ہوں۔ پہلے میری مجبوریاں سن لیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے آنسو بہے جا رہے تھے اور میں خاموشی سے اس کا واویلا اور فریادیں سن رہا تھا۔

وہ دراصل یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اس کے انگوٹھے لگوا لیے اور انگلیوں کے نشان لے لیے تو اس کو پھانسی کی سزا مل جائے گی۔ میں اس پر تشدد کر کے خاموش کروا سکتا تھا اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر کے کہتا کہ تم اگر قاتل ہو تو فوراً اقبال جرم کرو لیکن میں نے اس کی بجائے شفقت اور پیار کا رویہ اختیار کیا۔ اس کو کہا کہ میں مسلمان ہوں جیسا کہ اس نے کہا ہے اور میں ثابت کر دکھاؤں گا کہ پکا مسلمان ہوں اور ایک مسلمان بھائی کی خاطر کچھ قربانی دے سکتا ہوں۔

قصہ مختصر یہ کہ میں نے اس کو بہلا پھسلا لیا اور اس کو کہا کہ وہ بے تکلفی سے بات کوے، چھپائے کچھ بھی نہیں اور پھر میں اس کی مدد کرنے کا قابل ہوں گا۔ اس کو بولنے کے موڈ میں لانے کے واسطے مجھ کو محنت کرنی پڑی جس میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ جرائم پیشہ نہیں تھا۔ نمازی پرہیزگار اور دیانت دار آدمی تھا۔ وہ تو تھانے اور تھانیدار کا رعب برداشت کرنے کے بھی قابل نہیں تھا۔ میں نے اس کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا لیا اور پوچھا کہ یہی وہ جرسی ہے جو مقتولہ نے اس کو دی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ یہی ہے پھر میں نے پوچھا کہ یہ بٹن کہاں اور کس طرح ٹوٹ کر گرا تھا۔

اس نے جواب دیا کہ اس کو کچھ پتہ نہیں۔ صبح اس کو خبر ملی کہ ٹھیکیدار کی بیگم قتل ہوگئی ہے تو وہ بڑی تیزی میں کپڑے بدل کر اور یہی جرسی پہن کر دوڑ پڑا اور ٹھیکیدار کے گھر پہنچا۔ میں نے کہا کہ پرسوں یہ بٹن جرسی کے ساتھ تھا یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ پرسوں بٹن جرسی کے ساتھ تھا اور یہ گزشتہ رات ہی ٹوٹا ہوگا۔ اگر یہ شخص مجرمانہ ذہنیت کا ہوتا تو یہ جرسی پہن کر تھانے نہ آتا یا تھانے آنے سے پہلے یہ جرسی اتار آتا لیکن اس کو اتنی بھی ہوش نہیں تھی کہ اس کا ایک بٹن ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے۔

میں نے اس سے ایسے ہی ایک بات پوچھی تو اس نے ہاتھ جوڑ کر منت کی کہ میں شروع سے اس کی بات سنوں اور وہ آخر تک پوری اور بالکل سچی بات سنائے گا۔ میں نے کہا کہ چلو ایسے کر لو۔

اس نے بات اپنے گھر کی مالی حالت سے شروع کی۔ یہ میں نے پہلے تحریر کر دی ہے یعنی وہ ایک ہندو آڑھتی کا منشی تھا پھر اس کا باپ آرے میں بازو کٹ جانے سے معذور ہو گیا۔ ٹھیکیدار نے اقبال کو اپنے ہاں رکھ لیا۔ اس کو ہندو آڑھتی سے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے

تین گنا زیادہ تنخواہ ٹھیکیدار نے مقرر کر دی۔

اقبال شریف باپ کا دیانتدار بیٹا تھا اور اپنے گھر کی حالت اور ضروریات کو بھی سمجھتا تھا۔ اس نے اتنی محنت اور لگن سے کام کیا کہ ٹھیکیدار نے اس کو ایک رتبہ دے دیا اور حساب کتاب اس کے حوالے کر دیا۔ یہ باتیں تو پہلے میں نے تحریر کر دی ہیں۔ اس کے بعد ٹھیکیدار نے دوسری شادی کر لی۔ اقبال نے بتایا کہ اس کے دوست اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے کہ نئی بیگم کو خوش رکھنا وہ بہت انعام دے گی۔ یہ سب جانتے تھے کہ یہ لڑکی اچھے چال چلن والی نہیں لیکن اقبال کے ساتھ اس نے کوئی ایسی ویسی بات نہ کی۔ اقبال کی فطرت میں ذرا سی بھی بدمعاشی نہیں تھی۔ ٹھیکیدار اقبال پر پوری طرح اعتماد کرتا تھا۔ اس نے اقبال کو ایک اور ڈیوٹی دے دی۔ پہلے تو اقبال ٹھیکیدار کے گھر کے انتظامات اور اخراجات چلاتا تھا اور اس سلسلے میں ٹھیکیدار کے گھر آتا جاتا ہی رہتا تھا۔ نئی بیوی آگئی تو ٹھیکیدار نے اقبال کو کہا کہ وہ اس لڑکی سے بھی پوچھ لیا کرے کہ اس کو کچھ چاہئے تو وہ لا دے گا۔ ٹھیکیدار نے دوسری بات یہ کہی کہ نئی بیوی پر نظر رکھے اور اس کو پتہ لگے بغیر اس کی نگرانی کرتا رہا کرے کہ وہ گھر سے اگر باہر جاتی ہے تو کہاں جاتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ٹھیکیدار کو بھی معلوم تھا کہ اس کی بیوی اچھے چال چلن والی نہیں۔

اقبال نے مقتولہ کے پاس جانا شروع کر دیا۔ مقتولہ سے وہ اس کی کوئی ضرورت یا اس کا کوئی کام ہو تو پوچھتا تھا اور وہ جو کچھ بھی کہتی اقبال کر دیتا تھا۔ قتل سے آٹھ نو مہینے پہلے مقتولہ نے اقبال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی شروع کر دی۔ پہلے وہ کام کی بات پوچھتا اور کام کر دیتا تھا اور مقتولہ نے اس کو کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ بیٹھ جائے یا کچھ دیر کے واسطے رک جائے۔ اب یعنی آٹھ نو مہینے پہلے مقتولہ نے اس کو اپنے پاس بٹھانا شروع کر دیا اور اس سے اس کی گھریلو اور ذاتی باتیں پوچھنے اور ان میں دلچسپی ظاہر کرنے لگی۔ صاف پتہ لگتا تھا کہ مقتولہ اقبال کو دوست بنانا چاہتی ہے۔

نوکرانی نے جو بیان دیا تھا، میں نے حساب جوڑا تو پتہ لگا کہ یہ وہ دن تھے جب مقتولہ کے پہلے دوست نے اس سے ملنے اور اس کے حکم پر اس کے ہاں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اس کو پہلے دوست جیسا ایک دوست چاہئے تھا۔ اقبال اس کے خاوند کا ملازم تھا، جوان بھی خوبرو بھی تھا۔ وہ ہر لحاظ سے مقتولہ کے پیمانوں پر پورا اترتا تھا۔ اس نے

اقبال پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔

اقبال اس کو ٹالتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مقتولہ چاہتی کیا ہے۔ اقبال کو ایک خیال یہ آتا تھا کہ وہ مقتولہ کے خاوند کا ملازم ہے اور خاوند اس پر پورا اعتماد رکھتا ہے۔ اقبال اس اعتماد کو ٹھیس پہنچانا گناہ سمجھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ تھا ہی گناہ جس کی مقتولہ اس کو دعوت دیتی رہتی تھی۔ اقبال نمازی تھا اور اس کا کردار بڑا ہی صاف اور ستھرا تھا۔

ایک روز اقبال روزمرہ کے کمرے میں مطابق ٹھیکیدار کے گھر گیا اور مقتولہ کے کمرے میں گیا۔ مقتولہ کی حالت تو ایسی تھی جیسے کوئی نشئی نشے سے ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس نے انتہائی بے ہودہ اور فحش حرکتیں کر کے اقبال کے حیوانی جذبات کو ابھارا۔ اقبال نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا تو مقتولہ نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ اس کو معلوم تھا کہ اقبال کس قدر حاجت مند ہے اور اس کا باپ معذور ہے اور اس کی دو بہنیں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں۔ مقتولہ نے اقبال کو دھمکی دی کہ اس نے اس کی بات نہ مانی تو وہ ٹھیکیدار کو کہہ کر نوکری سے نکلوا دے گی اور الزام یہ لگائے گی کہ اقبال نے اس پر دست درازی کی ہے اور پہلے بھی کرتا رہا ہے اور مقتولہ برداشت سے کام لیتی رہی ہے۔

یہ ضرب اتنی کاری ثابت ہوئی کہ اقبال نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ویسے بھی یہ قدرتی بات ہے۔ اقبال کی عمر تیئس چوبیس سال ہی تو تھی۔ اقبال جب مجھ کو یہ بیان دے رہا تھا تو وہ ایک بار پھر رو پڑا اور کچھ دیر روتا ہی رہا اور اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس کا اب خوف دور ہو گیا تھا اس واسطے کہ وہ اپنے ضمیر سے اور اپنی روح سے بوجھ اتار کر پھینک رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس پہلے گناہ کے بعد وہ رات کو مسجد میں گیا، نفل پڑھے اور اس کے بعد اللہ کے حضور بہت رویا اور گناہوں کی معافی مانگی۔ وہ کچھ اطمینان اور سکون میں آ گیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ آئندہ ایسا گناہ نہیں کرے گا لیکن وہ ایک چکر میں آ گیا تھا۔ مقتولہ نے یہ گناہ ہر تیسرے چوتھے روز سرزد کرانا شروع کر دیا۔

اقبال تو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ کر بُری طرح پس رہا تھا۔ ایک طرف وہ اللہ کے حضور توبہ تائب کرتا اور بخشش مانگتا اور دوسری طرف وہ اس قدر مجبور اور بے بس تھا کہ یہ نوکری چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ جب معذور باپ اور جوان بہنوں کو دیکھتا تو ان کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر تیار ہو جاتا تھا۔ مولوی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کو

گناہ نہیں کرنا چاہئے تھا، اس کی بجائے وہ بھوکا مر جاتا لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ بہتر وہی جانتا ہے جو کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ مقتولہ نے اب اقبال کی یہی کمزوری بھانپ لی تھی اور اس کو نوکری سے نکلوا دینے کی دھمکیاں دے کر ایک قسم کی بلیک میلنگ کر رہی تھی۔

اقبال نے کہا کہ اس نے مقتولہ کے آگے ہاتھ جوڑے تھے اور کہا تھا کہ وہ اس کو معاف کر دے لیکن مقتولہ اتنی آزاد اور بے حیا عورت تھی کہ کوئی اور بات سمجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ دھمکیوں اور بلیک میلنگ سے ہٹ کر اقبال کو پیسے بھی دیتی رہتی تھی۔ دو مرتبہ اس نے اقبال کو بڑے اچھے کپڑے سلوا کر دیئے تھے اور تیسری بار عید پر اس نے اقبال کو اور ہی زیادہ قیمتی سوٹ یعنی شلوار قمیض دیا تھا۔ پھر ان سردیوں کے آغاز میں اس کو یہ قیمتی جرسی دی تھی۔

مقتولہ نے گزشتہ چار مہینوں سے یہ معمول شروع کر دیا تھا کہ دن کی بجائے اقبال کو ہفتے میں ایک اور کبھی دو دفعہ رات کے وقت بلاتی تھی۔ جس رات بلانا ہوتا اس روز اس کو کہہ دیتی تھی کہ ساڑھے دس اور گیارہ کے درمیان آ جائے اور اس کو بیٹھک کا دروازہ کھلا ملے گا۔ اقبال کبھی چوری چھپے آ جاتا اور کبھی اپنے گھر یہ جھوٹ بولتا کہ آج کام زیادہ ہے اور ٹھیکیدار بھی جاگ رہا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور اقبال کی شادی ہو گئی۔ مقتولہ نے اقبال کی دلہن کو نہایت اچھا سوٹ دیا تھا اور سلامی بھی بے شمار دی تھی۔

اب اقبال اس گناہ کو اور ہی زیادہ گناہ سمجھنے لگا اس واسطے کہ اس کو بہت برا لگتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ وہ کوئی دھوکہ فریب اور بددیانتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مقتولہ کو ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اب وہ اس کو معاف کر دے اس واسطے کہ اس نے شادی کر لی ہے اور اس کی بیوی اس کو چاہتی ہے اور اس پر بھروسہ بھی کرتی ہے لیکن مقتولہ نے اپنا رویہ اور زیادہ سخت کر لیا۔

ایک بزرگ ـــــ خواب یا حقیقت؟

قتل کی رات سے تقریباً پندرہ روز پہلے کا واقعہ اقبال نے اس طرح بتایا کہ وہ پکا ارادہ کر کے مقتولہ کے پاس گیا اور اس کو کہا کہ اب وہ اس گناہ سے توبہ کرتا ہے اور اگر وہ اس کو نکلوانا چاہتی ہے تو نکلوا دے اور وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ اقبال نے بتایا کہ اس نے بات

کہہ تو دی لیکن وہ ٹھیکیدار کی اتنی اچھی اور اتنی زیادہ تنخواہ والی نوکری چھوڑنا نہیں چاہتا اور چھوڑ سکتا ہی نہیں تھا۔ مقتولہ نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور کہا کہ وہ اس کو بھرتی ہونے کے قابل چھوڑے گی ہی نہیں، اس کو گرفتار کروا دے گی۔ اقبال کو معلوم تھا کہ ٹھیکیدار بڑے شہر میں بڑے افسروں کے ساتھ ملتا جلتا ہے اور وہ اس کا بیڑہ غرق کر سکتا ہے۔

اسی روز کا ذکر ہے کہ مقتولہ نے ہنسی مذاق میں اقبال کی انگلی سے اس کی شادی کی انگوٹھی اتاری اور اپنے پاس رکھ لی۔ مقتولہ نے کہا کہ اس کو اس انگوٹھی کی کوئی ضرورت نہیں، اس کے پاس اتنے زیادہ زیورات ہیں کہ وہ اس کو ایسی دس انگوٹھیاں دے سکتی ہے لیکن اس انگوٹھی کو وہ نشانی کے طور پر رکھے گی۔ اقبال نے جب ضد کی تو مقتولہ نے اس کو دوسری انگوٹھی دے کر کہا کہ اس کی بجائے یہ انگلی میں ڈال لو۔ یہ انگوٹھی زیادہ وزنی ہونے کی وجہ سے زیادہ قیمتی تھی لیکن اقبال نے قبول نہ کی۔

اقبال کے واسطے یہ ایک نئی مصیبت پیدا ہو گئی۔ وہ گھر جاتا تو انگوٹھی والی انگلی بیوی سے چھپا کر رکھتا۔ بیوی خالی انگلی دیکھ کر ضرور پوچھتی کہ انگوٹھی کہاں ہے۔ ادھر ہر روز مقتولہ کی منتیں کرتا کہ انگوٹھی اس کو دے دے لیکن وہ نہیں دیتی تھی۔

قتل سے تین دن پہلے اقبال کی بیوی نے خالی انگلی دیکھ کر پوچھ ہی لیا کہ انگوٹھی کہاں ہے۔ اقبال نے یہ جھوٹ بولا کہ دفتر میں ویسے ہی اتاری تھی اور دراز میں رہ گئی ہے۔ بیوی نے کہا کہ ایسی بے احتیاطی نہ کیا کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ انگوٹھی گم ہی ہو جائے، کل ضرور لے آئے۔ اگلے روز دن کے وقت اقبال روزمرہ معمول کے مطابق مقتولہ کے کمرے میں گیا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے انگوٹھی مانگی لیکن مقتولہ بدکردار لڑکی تھی جس میں جذبات کا نام و نشان نہ تھا، اس نے انگوٹھی نہ دی اور یہ تو اس نے قبول ہی نہ کیا کہ اقبال اپنی بیوی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔

اس روز اقبال نے اپنے دل و دماغ میں زبردست طوفان اٹھتا محسوس کیا۔ عشاء کی نماز مسجد میں پڑھی اور اس کے بعد جب سارے نمازی مسجد سے نکل گئے تو اس نے نفل پڑھنے شروع کیے اور اس کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ کتنے پڑھ چکا ہے اور کتنے اور پڑھے گا۔ نفل پڑھنے کے دوران اس کے آنسو بہتے رہے۔ دعا میں اس نے اللہ تعالیٰ کی مدد مانگی اور بخشش بھی مانگی۔

اقبال نے قسمیں کھا کر یہ بات سنائی کہ اس رات ایک سفید ریش بزرگ خواب میں آئے اور انہوں نے اتنا ہی کہا کہ ایسے گناہ گار کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دو، تمہاری نجات اسی میں ہے۔ اس کے بعد بزرگ غائب ہو گئے اور اقبال کی آنکھ کھل گئی۔ اس روز تو اس کی جذباتی حالت اس قدر بُری تھی کہ وہ پاگل ہو جاتا تو کوئی بعید نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ اس بزرگ کی بات اس کے دل پر ایسی نقش ہوئی کہ اس نے مقتولہ کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

اتفاق سے اگلے روز مقتولہ نے اس کو کہا کہ رات اسی وقت آ جانا، بیٹھک کا دروازہ کھلا ملے گا۔ اقبال چلا گیا۔ جاتے ہی اس نے انگوٹھی کا مطالبہ کیا لیکن مقتولہ نے ہنسی مذاق میں یہ بات ٹال دی اور اقبال کو اپنے مقصد کی طرف لے گئی۔ وہ اتنی استاد لڑکی تھی کہ اقبال کو ہر حالت میں رام کرنے کا گر جانتی تھی۔ اقبال نے اس کا یہ نشہ پورا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ پھر گیا اور اس پر وہ پاگل پن طاری ہو گیا جس میں انسان اپنی یا کسی کی جان لے لیا کرتا ہے۔ مقتولہ ابھی پلنگ پر چت لیٹی ہوئی تھی کہ اقبال نے اس کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی اور دانت پیس کر پورا زور لگایا جس سے اس کی گرفت لوہے کے جیسی ہو گئی اور مقتولہ جینے کے حق سے محروم ہو گئی۔

اقبال تیزی سے پلنگ سے اترا اور سنگار میز کی درازیں کھولیں اور ڈبے کھول کر اور درازوں کی تلاشی لے کر اپنے انگوٹھی ڈھونڈ لی اور جیب میں ڈال کر وہاں سے نکل گیا۔ وہ بہت ہی جلدی میں تھا اس واسطے زیورات اور دیگر اشیاء کو بکھرا رہنے دیا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ انگلیوں کے نشانات کی صورت میں اپنی نشانی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قتل کر دینا کوئی مشکل نہیں، اصل کام قتل کو ہضم کرنا ہے جو شاید کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

جرسی کے بٹن کی بابت اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس کو بٹن ٹوٹنے کا کچھ پتہ نہیں لگا۔ اتنا یاد تھا کہ اس نے مقتولہ کا گلا دبایا تو مقتولہ نے تڑپتے ہوئے اس کی جرسی دونوں مٹھیوں میں بٹنوں والی جگہ سے پکڑی تھی پھر اس کے دونوں ہاتھ دائیں اور بائیں ہو گئے تھے۔ شاید اس وقت بٹن جرسی سے ٹوٹ کر پلنگ پر گر پڑا ہو گا۔ کاغذ کی پرچی بھی اسی وقت جیب سے گری ہو گی۔

اس طرح اقبال نے مقتولہ کو قتل کیا اور میرے آگے اقبال جرم بھی کر دیا۔ اس کے

بعد اس نے مجھ کو کہا کہ میں اگر پکا مسلمان ہوں تو اس کی مدد کروں۔ اقبال نے جس دکھے ہوئے انداز میں مجھ کو یہ بات سنائی تھی اس کا میرے دل پر بہت بُرا اثر ہوا۔ مجھ کو معلوم تھا اور آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ امیر کبیر لوگوں کے گھروں کی عورتیں غریب نوکروں کو جس طرح چاہتی ہیں استعمال کر لیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ دنیا کا قانون ہی نہیں بلکہ خدائی بھی ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔

میں نے دل میں عہد کر لیا کہ اقبال کو سزا نہیں ہونے دوں گا لیکن اس کے واسطے کوئی استادی کھیلنی پڑتی تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اس کو بے گناہ قرار دے دیتا اور یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں مقدمہ اتنا ڈھیلا بناتا جو کورٹ میں جاتے ہی ناکام ہو جاتا۔ اس طرح میری نالائقی ثابت ہوتی تھی۔ بہر حال میں نے ایک راستہ سوچ لیا اور اقبال کو بتا دیا کہ سیشن کورٹ سے اس کو عمر قید یا سزائے موت مل جائے گی لیکن اپیل میں وہ بری ہو جائے گا۔

میں ان تفصیلات میں اور ان باریکیوں میں نہیں جانا چاہتا اور ضروری بھی نہیں سمجھتا کہ میں نے کون سی گنجائش رکھ دی تھی اور کس طرح رکھی تھی۔ پولیس آفیسر اس استادی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں نے خود اقبال کو کہا تھا کہ وہ سیشن کورٹ میں جا کر اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے اور یہ بیان دے کہ اس کو تھانے میں مار پیٹ کر یہ بیان لیا گیا تھا۔

مقدمہ جب سیشن کوٹ میں گیا تو اقبال نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بیان وہی دیا جو میں نے اس کو بتایا تھا یعنی وہ اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو گیا۔ میں نے مقدمہ ٹھیک ٹھاک تیار کیا تھا صرف ایک آدھ خانہ خالی رکھا تھا اور آخر سیشن جج نے اقبال کو عمر قید سنا دی۔

اس سزا کے خلاف اقبال کے وکیل نے اپیل ہائی کورٹ میں دائر کی میں نے سیشن کورٹ کے فیصلے کے روز اقبال کو الگ کر کے کہہ دیا تھا کہ اس سزا سے وہ گھبرائے نہیں اور اپنے وکیل سے کہے کہ مجھ کو الگ تھلگ ضرور ملے۔ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر کے وکیل مجھ سے ملا تھا اور میں نے اس کو دو پوائنٹ بتائے تھے۔ وکیل نے ہائی کورٹ میں وہی دو پوائنٹ پکڑے اور ایک آدھ خود پیدا کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہائی کورٹ نے شک کا فائدہ دے کر اقبال کو بری کر دیا۔ میں اللہ کے حضور سرخرو ہو گیا۔

اقبال بڑی لمبی سزا سے تو بچ گیا لیکن اس کے ماں باپ اور بہنوں نے بہت بُرا

وقت دیکھا۔ بہنوں کے لیے جو تھوڑا سا زیور بنا تھا وہ بک گیا اور مقدمے میں لگ گیا۔ کی آمدنی اتنا عرصہ بند رہی۔ اقبال کا باپ بائیں ہاتھ سے جو محنت مزدوری کر سکتا تھا کرتا رہا اور اس کی ماں اور بہنیں لوگوں کے کپڑے سی کر بھی اور میلے کپڑے گھر لا کر دھو کر بھی کچھ پیسہ کماتی رہیں، لیکن اللہ نے ان کی مدد کی۔ وہ اس طرح کہ سیشن کورٹ نے ابھی فیصلہ نہیں سنایا تھا کہ ٹھیکیدار بس پر بڑے شہر کو جا رہا تھا کہ یہ بس ایک ٹرک سے ایسی زور سے ٹکرائی کہ بارہ چودہ مسافر مارے گئے اور ان میں ٹھیکیدار بھی تھا۔ چونکہ اس کے دونوں بڑے بیٹے اس کے ساتھ کام کرتے تھے اس واسطے انہوں نے ٹھیکیداری کو سنبھال لیا۔

اقبال جب بری ہو کر باہر آیا تو وہ مجھ سے ملا، میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر کی حالت بتائی۔ وہ مجھ کو کہتا تھا کہ میں اس کے روزگار کا کوئی بندوبست کر دوں۔

ایک روز ٹھیکیدار کے بڑے بیٹے سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے یہ کیس چھیڑ دیا اور اس کو وہ سارا بیان سنایا جو اقبال نے مجھ کو دیا تھا اور اس میں اقبال کی مذہب پرستی کا ذکر زیادہ کیا۔ ٹھیکیدار کا بڑا بیٹا تو تھا ہی اسلام پسند اور پکا مومن۔ اقبال کے کردار کا یہ پہلو اس کے دل میں اتر گیا۔ مقتولہ کے خلاف تو اس کے دل میں زہریلی نفرت بھری ہوئی تھی۔ اس نے مقتولہ کے قتل کو بالکل جائز سمجھا اور اس نے کہا کہ اس کو اپنے باپ کی موت کا بھی کوئی خاص افسوس نہیں اس واسطے کہ وہ ایک بدچلن لڑکی کو گھر لے آیا تھا۔

میں نے اس کو کہا کہ وہ اگر اچھا سمجھے تو اقبال کو اپنے ساتھ لگا لے، یہ ایک نیکی ہو گی۔ اس شخص نے کوئی دلیل نہ دی بلکہ یہ کہا کہ وہ آج ہی اقبال کو بلا لے گا اور اس کو روزگار پر لگا دے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اقبال کا روزگار پہلے کی طرح لگ گیا۔ میرے دماغ میں دراصل وہ بزرگ آ گئے تھے جو اقبال کو خواب میں ملے تھے۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ وہ محض ایک خواب ہی نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت تھی اور وہ حقیقی اشارہ تھا جو اقبال کو ملا تھا۔

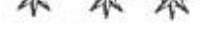

چڑیا پھنس گئی

تھانوں میں پولیس کے تشدد سے ملزموں کے ہلاک ہونے کی خبریں اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ہلاک ہونے والوں کے پسماندگان شور شرابہ کرتے ہیں۔ اس حلقے کا ایم پی اے یا ایم این اے یا کونسلر اپنی پبلسٹی اور مقبولیت بڑھانے کے لیے مرنے والے کی لاش کا جلوس نکلواتے ہیں اور اخباروں میں خبریں بھی چھپواتے ہیں۔ کچھ دن شور شرابہ لگا رہتا ہے اور تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اگر کوئی بہت ہی پیچھے پڑ جائے تو متعلقہ تھانیدار کو لائن حاضر یا معطل کر دیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

پولیس تشدد سے تھانوں میں ملزموں یا مشتبہوں کے ہلاک ہونے کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ رائے نہیں دیتا کہ ان میں کتنے واقعات سچے اور کتنے جھوٹے ہوتے ہیں۔ تھانوں میں ملزموں سے اقبال جرم کرانے اور مشتبہوں سے کوئی سراغ اگلوانے کے لیے ایذا رسانی کا طریقہ آج کی بات نہیں۔ یہ طریقہ اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن پولیس وجود میں آئی اور اس نے کسی واردات کا پہلا ملزم پکڑا اور اس سے اقبال جرم کرایا تھا لیکن ملزم کا پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہو جانا جرم ہے جو دفعہ 302 (قتل) کے تحت آتا ہے۔ ایذا رسانی بھی جرم ہے۔ اگر عدالت میں ثابت ہو جائے کہ ملزم سے ایذا رسانی کے ذریعے اقبال جرم کرایا گیا ہے تو عدالت اس اقبال جرم کو قبول نہیں کرتی۔

یہ ایک الگ موضوع ہے جو میں نے شروع کر دیا ہے۔ اس کے لیے الگ قانون اور ضابطے ہیں۔ میرے ریکارڈ میں ایسا ایک واقعہ موجود ہے جو میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ اپنے اصول کے مطابق اور تین بہت برے تجربات سے ڈرتے ہوئے میں جگہوں اور افراد کے نام اصلی کی بجائے فرضی لکھوں گا۔

مجھے فوری طور پر ایک قصبے کے تھانے کا چارج لینے کا حکم ملا۔ میں نئے تھانے کے

علاقہ ڈی ایس پی کے پاس پہنچا۔ وہ انگریز تھا۔ اس وقت کسی افسر کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہوتا تھا کہ وہ انگریز ہے، پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ وہ اپنے کام میں مخلص اور دیانتدار اور ڈسپلن کا بڑا سخت افسر ہے۔ یہ میں اپنی تقریباً ہر کہانی میں لکھ چکا ہوں کہ انگریز اپنے قانون کا احترام کرتے اور لوگوں سے احترام کراتے تھے۔ ایسا انگریز کم ہی دیکھنے میں کبھی آیا ہوگا جو قانون شکنی کو برداشت کرتا ہو۔ یہ ڈی ایس پی (سی بی ڈریک) جس کے ماتحت میں نئے تھانے کا چارج لینے گیا تھا، ذرا زیادہ ہی سخت مزاج معلوم ہوتا تھا۔

میں جب اس کے دفتر میں پیش ہوا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے کیا لیکچر دے گا۔ میں اس وقت تک ایسے چار لیکچر سن چکا تھا۔ یہ پانچواں تھا نہ تھا جس کا میں چارج لینے گیا تھا اور یہ پانچواں ڈی ایس پی تھا جس کا میں نے لیکچر سننا تھا اور بار بار..... ''ٹھیک ہے!..... بہت اچھا صاحب بہادر!..... جی حضور!'' ــــ ویسے ہی کہتے رہنا تھا جس طرح مشاعرے میں شاعر ایک دوسرے کو داد دیا کرتے ہیں اور میں نے اس کے سامنے اٹنشن کھڑے رہنا تھا، لیکن اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا تو اس نے میری توقع کے خلاف اس قسم کا کوئی لیکچر نہ دیا جو ڈی ایس پی نئے تھانیدار کو دیا کرتے تھے۔ اس کی بجائے اس نے ایک کیس میرے آگے رکھ دیا جو پہلے اس نے مجھے زبانی سنایا۔

اسے آپ کیس کہیں، انکوئری کہیں یا تفتیش کہہ لیں، میں اس وقت فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کہوں۔ بات یہ تھی کہ میں جس تھانے کا چارج لینے آیا تھا، اس کا پہلا ایس ایچ او رہزنی کی ایک واردات کی تفتیش کر رہا تھا۔ اس نے ایک مشتبہ کو تھانے میں طلب کیا۔ اگلی صبح اس مشتبہ کی لاش قصبے سے تقریباً ایک میل دور ویران علاقے میں پڑی ہوئی پائی گئی، لیکن ایسا کوئی ثبوت موجود نہ تھا نہ کوئی شہادت تھی کہ مقتول کو تھانے بلایا گیا تھا۔ یہ الزام مقتول کے باپ نے تھانیدار پر لگایا تھا کہ اس نے اس کے بیٹے پر تھانے میں اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا۔

''تمہاری سروس بہت ہو گئی ہے'' ــــ ڈی ایس پی نے اپنے لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا ــــ ''تمہیں معلوم ہوگا کہ اس شکایت کی تحقیقات ہونی چاہئے لیکن تم اس کی تفتیش کرو گے جس طرح قتل کی واردات کی تفتیش کی جاتی ہے''۔

''ایس ایچ او کہاں ہے؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''وہ لائن حاضر ہے''۔۔۔ ڈی ایس پی ڈریک نے جواب دیا۔۔۔ ''وہ معطل ہے۔ اس کے ساتھ ایک اے ایس آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھی ہم نے معطل کر دیا ہے۔ شکایت ان تینوں کے خلاف ملی ہے''۔

اس ڈی ایس پی کے ساتھ میری جو گفتگو ہوئی تھی وہ تو بڑی لمبی ہے، میں اصل وقوعہ اختصار سے سناتا ہوں۔ تھانے والے قصبے کا ایک ہندو آڑھتی جو ساہوکارہ بھی کرتا تھا یعنی سود پر قرض بھی دیتا تھا، دیہاتی علاقے میں وصولیوں کے لیے گیا تھا۔ وہ واپس آرہا تھا تو شام ہوگئی۔ قصبے سے تقریباً میل دور تھا تو اندھیرا ہوگیا۔ وہ علاقہ ویران تھا۔ دو آدمیوں نے اس روک لیا اور لمبے لمبے چاقو دکھا کر اس سے وہ ساری رقم لے لی جو اس نے مختلف آدمیوں سے وصول کی تھی۔

وہاں سے وہ گھر جانے کی بجائے تھانے میں گیا اور رہزنی کی رپورٹ درج کرائی۔ تھانیدار نے تفتیش شروع کر دی۔ اس دوران ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو جو انگریز تھا، ایک درخواست ملی کہ درخواست دہندہ کے بیٹے کو اس واردات کی تفتیش میں تھانے بلایا گیا تھا لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ اگلے روز صبح سویرے اسے اطلاع ملی کہ اس کے بیٹے کی لاش قصبے سے تھوڑی ہی دور پڑی پائی گئی ہے۔ تھانیدار نے تفتیش شروع کر دی۔ درخواست میں لکھا تھا کہ مقتول کے باپ نے تھانیدار سے کہا کہ اسے رات کو تھانے بلایا گیا تھا تو تھانیدار نے اس کی پٹائی کر دی اور اسے ڈرایا دھمکایا کہ وہ ایسی فضول بات پھر کبھی منہ سے نہ نکالے ورنہ اسے پولیس پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے درخواست میں لکھوایا تھا کہ اس کا بیٹا پولیس کے تشدد سے مارا گیا ہے۔

غور اس بات پر کریں کہ مقتول کا باپ غریب آدمی تھا اور وہ ذاتی ملازمت اور محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس کی کوئی سوشل حیثیت نہیں تھی۔ آج کے سوشل آرڈر کے مطابق وہ کیڑا مکوڑا تھا۔ ایسے کیڑے پاؤں کے نیچے آکر کچلے جاتے ہیں اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا لیکن انگریز ڈپٹی کمشنر نے اس کی درخواست پر فوری طور پر عمل کیا اور درخواست ایس پی کو بھجوا دی۔ ایس پی نے اپنے حکم کے ساتھ درخواست متعلقہ ڈی ایس پی کو بھجوا دی۔ ڈی ایس پی نے یہ نہیں کیا کہ درخواست متعلقہ تھانیدار کو بھجوا دیتا اور تھانیدار جو بھی جواب دیتا اسے قبول کر لیا جاتا۔ ڈی ایس پی خود اچانک قصبے کے تھانے میں جا پہنچا اور اس واردات

کی فائل اپنے قبضے میں لے لی جو قتل کی تھی اور دیکھا کہ تھانیدار نے کیا کارروائی کی ہے۔ پھر اس نے درخواست دینے والے کو بلایا۔ اس کا بیان لیا اور اس نے تھانیدار، اے ایس آئی اور دو تین کانسٹیبلوں کے بیان لیے۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ مقتول کو تھانے بلایا گیا تھا لیکن ڈی ایس پی کو شک ہوگیا کہ الزام غلط نہیں۔ اس کی رائے پر تھانیدار، اے ایس آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو معطل کر کے لائن حاضر کر دیا گیا اور یہ نزلہ مجھ پر گرا کہ میں اس تھانے کا چارج لوں اور تفتیش کروں کہ یہ شکایت کہاں تک صحیح ہے۔

مجھے ڈی ایس پی نے یہ بھی بتایا کہ معطل شدہ تھانیدار، اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل نے بیان دیئے ہیں کہ مقتول کو اس رات تھانے میں طلب کیا ہی نہیں گیا تھا۔

''ہوسکتا ہے مقتول کو کسی اور نے قتل کیا ہو''۔۔۔ ڈی ایس پی نے کہا۔۔۔ ''یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے''۔ ایسی وارداتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن میں اس انگریز ڈی ایس پی کے رویے اور انداز پر حیران ہوا۔ مجھے کچھ ایسا شک ہوا جیسے وہ مجھے کسی ایسے چکر میں ڈال رہا ہو جس میں وہ خود پھنسا ہوا تھا۔ میں اس سے صرف حکم اور ہدایات لے سکتا تھا اس سے کوئی فالتو بات نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ایک تو وہ انگریز تھا اور دوسرے یہ کہ وہ میرا افسر اعلیٰ تھا۔ اس نے مجھے جو فائل اور کاغذات دیئے وہ میں لے کر آ گیا۔

بدمعاش تھانیدار

میں اس نئے تھانے میں گیا۔ وہاں نیا اے ایس آئی پہنچ گیا تھا۔ وہ سکھ تھا۔ نام منگل سنگھ سندھو تھا۔ پرانا تھانیدار (سب انسپکٹر) اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل جنہیں معطل کیا گیا تھا تینوں ہندو تھے۔ اس تھانے میں ایک سنیئر اے ایس آئی بھی تھا لیکن وہ تین مہینوں سے غیر حاضر تھا کیونکہ وہ بیمار ہوگیا تھا اور ہسپتال میں رہا تھا۔ اس کا اپریشن بھی ہوا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کے لیے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی لکھ دی تھی۔

سب سے پہلے میں نے تھانے کے تمام افراد کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ میں کیا ہوں اور اپنے ماتحتوں سے میں کیا توقع رکھتا ہوں۔ میں نے ڈسپلن پر زور دیا اور ''گربہ کشتن روز اول'' کے محاورے کو ذہن میں رکھ کر سب پر خوب رعب جمایا اور یہ ظاہر کیا کہ میں بدمعاش قسم کا تھانیدار ہوں۔

''اب بتاؤ''— میں نے پوچھا— ''جیرے (مقتول) کو اس رات تھانے میں بلایا گیا تھا؟''

ان میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ سب سے پہلے ایک ہیڈ کانسٹیبل بولا— ''اگر دس گیارہ بجے کے بعد بلایا گیا ہو تو مجھے معلوم نہیں''— اس نے کہا— ''میں سو گیا تھا''۔

اس کے بعد سب نے کہہ دیا کہ انہیں معلوم نہیں تقریباً سب نے کہا کہ جیرے کو آدھی رات کے بعد بلایا گیا ہوگا۔ اس وقت سب سو گئے تھے۔

میں نے پریڈ ڈسمس کر دی پھر ایک ایک کو اپنے پاس بٹھایا اور یہی سوال پوچھا۔ سراغرسانی کے انداز سے جرح کی۔ بہت مغز کھپایا لیکن ان سب نے مجھے یقین دلا دیا کہ جیرے کو اس رات تھانے میں نہیں بلایا گیا تھا۔ صرف یہ پتہ چلا کہ اسے قتل ہونے سے پہلے دو مرتبہ دن کے وقت اسی واردات کی تفتیش میں بلایا گیا تھا اور اسے بہت جلدی واپس بھیج دیا گیا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے باقاعدہ طور پر شاملِ تفتیش کیا گیا تھا یا اسے ویسے ہی بلایا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اسے کس واردات کی تفتیش میں بلایا گیا تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پولیس کے ان تینوں آدمیوں کے ساتھ بات کروں جنہیں معطل کیا گیا تھا۔ میں ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور پھر پولیس لائنز میں گیا۔ سب سے پہلے معطل شدہ سب انسپکٹر سے ملا۔ میں اسے سرکاری طور پر مل رہا تھا کیونکہ میں تفتیش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کے ساتھ دوستوں کی طرح بات کی اور اسے کہا کہ وہ مجھے صحیح بات بتا دے اور میں اسے بچانے کی صورت پیدا کر لوں گا۔

جس طرح فوجی اپنے ساتھی فوجی کی مدد کرتا ہے اسی طرح پولیس والے بھی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ یہ رواج بہت پرانا ہے۔ میں اس ہندو سب انسپکٹر کی مدد کرنا چاہتا تھا یا نہیں، یہ ایک الگ بات ہے۔ میں نے اسے تاثر یہی دیا کہ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھ پر اعتبار کرے گا لیکن وہ پکا ہندو تھا جو کسی مسلمان پر اعتبار کرنا اپنے مذہب کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس نے مقتول کو تھانے میں طلب کیا ہی نہیں تھا۔ اس نے کچھ اس قسم کی کہانی سنا دی کہ وہ بڑا سخت تھانیدار ہے اور چونکہ وہ کسی کی ذرا سی بھی غلطی معاف نہیں کرتا اس لیے قصبے کے بعض

شہریوں نے اس کے خلاف یہ کیس بنا دیا ہے۔

''رائے جی!''— میں نے کہا— ''میری ہمدردی اور دلچسپی تمہارے ساتھ ہے مجھے ان شہریوں کے نام پتے بتا دو۔ میں ان کے بیان نہیں لوں گا۔ یہ معلوم کر لوں گا کہ انہوں نے تمہارے ساتھ دشمنی کی ہے۔ میں ان کو اعتماد میں لے لوں گا پھر تم دیکھنا کہ میں انہیں کہاں تک پہنچاتا ہوں۔''

''یہ کام نہ کرنا''— اس نے کہا— ''ان کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں تم بھی رگڑے جاؤ گے''۔

میں نے اسے اپنے اثر میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن اس شخص نے میری کوئی بھی ترکیب کامیاب نہ ہونے دی۔ میں اسے پہلے سے جانتا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ اس نے جو باتیں مجھے سنائیں ان سے میں متاثر ہو گیا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ یہ سب انسپکٹر جس کا نام رائے برمن تھا، بے گناہ ہے۔

اس کے بعد میں معطل شدہ اے ایس آئی سے ملا۔ اس نے بھی سب انسپکٹر رائے برمن جیسی باتیں کیں۔ اس کا بیان رائے برمن سے ملتا تھا۔ میں نے اس سے وہی سوال پوچھے جو رائے برمن سے پوچھے تھے۔ اس نے تقریباً وہی جواب دیئے جو رائے برمن نے دیئے تھے۔ اس کا بیان بھی یہی تھا کہ مقتول کو تھانے بلایا ہی نہیں گیا تھا۔

پھر میں ہیڈ کانسٹیبل سے ملا۔ وہ بھی ہندو تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اصل بات اگل دے گا۔ چونکہ وہ کم عہدے کا آدمی تھا اس لیے میں نے اس کے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ اسے بہت ہی اہمیت دی لیکن اس نے بھی صاف انکار کر دیا اور آخر تک انکار ہی کرتا رہا۔ اس نے بھی یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہر کے کچھ لوگوں نے رائے برمن کے خلاف دشمنی رکھی ہوئی تھی اور ان لوگوں نے مقتول کے قتل کو یہ رنگ دے دیا ہے اسے تھانے بلایا گیا تھا اور اس پر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ مر گیا اور اس کی لاش اٹھوا کر شہر سے باہر پھینک دی گئی۔

وہاں میں یہ تاثر لے کر واپس آیا کہ مقتول کو تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔ تینوں نے یہ تسلیم کیا کہ اسے دن کے وقت دو مرتبہ تھانے طلب کیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جو ہندو ساہوکار رہزنی کا شکار ہوا تھا اس نے کہا تھا کہ اسے جیرے پر شک ہے۔ شک کی وجہ یہ بتائی کہ جیرا اس ہندو کی آڑھت کی دکان میں ملازم تھا۔ سب انسپکٹر رائے برمن نے کہا کہ

جیرے پر سیٹھ نے بلاوجہ شک کیا تھا۔ اگر دکان میں چوری ہوئی ہوتی تو ملازم پر شک کوئی وزن رکھتا تھا۔

مقتول کی بیوی اور انگریز ڈی ایس پی

ان تینوں نے اپنے خلاف جیرے کے قتل کا الزام غلط ثابت کر دیا تھا اور میں نے ان کے دلائل کو اور ان کی پیش کی ہوئی واقعاتی شہادت کو قبول کر لیا لیکن میں نے یہ بھی ذہن میں رکھا کہ یہ تینوں پولیس آفیسر ہیں اور تجربہ کار بھی۔ وہ جرح کر کے دوسروں کو لاجواب کرنے اور اپنے اوپر جرح کرنے والے کو مطمئن کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ میری نظر میں ابھی یہ تینوں مشتبہ تھے۔ میں نے یہ ثبوت تلاش کرنا تھا کہ ان تینوں کے بیانات صحیح ہیں۔

سب انسپکٹر رائے برمن نے مجھے ایک بات بتائی تھی جس کی میں نے تصدیق کرنی تھی۔ اس نے کہا تھا ڈی ایس پی ڈریک مقتول کے باپ کی درخواست پر خود تھانے میں آیا تھا۔ اس نے مقتول کے باپ کا بیان الگ بٹھا کر لیا تھا پھر مقتول کی بیوی کا بھی بیان لیا تھا۔

''ملک صاحب!''— سب انسپکٹر برمن نے کہا تھا— ''مجھے پتہ چلا تھا کہ مقتول کی بیوی نے ڈی ایس پی کو بیان دیا ہے کہ مقتول کو تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔ اسے شام کے کھانے کے بعد کوئی بلانے آیا تھا اور وہ مجھے بتا کر گیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر بعد آ جائے گا''۔

میری ایک کمزوری یہ تھی کہ میں اس قصبے اور اس علاقے میں اجنبی تھا۔ یہاں کے کسی بھی آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ اس علاقے کے سرکاری افراد (نمبردار، ذیلدار وغیرہ) کی ذہنیت سے بھی مجھے واقفیت نہیں تھی۔ یہ لوگ ہوتے تو جی حضوری تھے لیکن ان میں سے بعض خوشامد چاپلوسی میں ہی دھوکہ دے جاتے تھے۔

میں اس کمزوری کو اچھے طریقے سے استعمال کرنا بھی جانتا تھا۔ جب علاقے کے تھانے میں نیا تھانیدار آتا تھا تو یہ لوگ اس کے ''حضور'' حاضری دیتے اور چاپلوسی کی مسمریزم چلاتے تھے۔ یہ ایک دوسرے کی غیبت بھی کرتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی چلتا ہے۔ میں جب اس تھانے میں آیا تو یہ سلسلہ میرے ساتھ بھی چل پڑا جو میرے لیے عجیب یا نیا نہیں تھا۔ اگر میں آپ کو یہی سنانے لگوں کہ یہ چاپلوس لوگ کیا باتیں کرتے ہیں اور کس انداز سے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف کس طرح زہر اگلتے ہیں اور حرکتیں کیسی

کرتے ہیں تو یہ عوام الناس کے لیے بڑا ہی دلچسپ مضمون ہوگا۔ ان میں بعض اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ بڑے ہی چالاک اور ہوشیار پولیس آفیسر پر اپنا جادو چلا لیتے ہیں۔ پاکستان کے درپردہ حکمران ایسے ہی چاپلوس اور خوشامدی لوگ ہیں۔ میں آپ کو کوئی اور کہانی سنا رہا ہوں اس لیے اس موضوع کو یہیں رہنے دیتا ہوں۔

اس قبیل کے افراد میں ایک تو سرکاری اہل کار ہوتے ہیں جن میں اس وقت نمبردار، ذیلدار، سفید پوش انعام خور اور چوکیدار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ خودساختہ مخبر تھے جن میں معززین بھی شامل تھے۔ قصبوں اور شہروں کے بعض لوگ چھوٹے اور بڑے تھانیدار کو دوست بنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان میں بعض کا طرزِ زندگی ایسا تھا کہ پولیس کی دوستی ان کی ضرورت تھی۔ ان میں ایک نسل اور بھی تھی جنہیں میں شریف قسم کے بدمعاش کہا کرتا تھا۔

یہ جب باری باری میرے پاس آنے اور فرشی سلام کر کے اپنا اپنا تعارف کرانے لگے تو میں نے نوٹ کیا کہ انہیں ابھی یہ معلوم نہیں کہ میں مستقل طور پر اس تھانے میں آیا ہوں یا صرف انکوئری کے لیے آیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تھانے کا چارج لے چکا ہوں اور اے ایس آئی بھی نیا آیا ہے۔ یہ سن کر ان کے انداز بالکل بدل گئے۔ ایسے ضمیر فروش آدمیوں کے ساتھ میرا رویہ کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ ان میں اپنے آپ کو جو معززین اور رئیس شہر سمجھتے تھے انہیں میں اپنے پاؤں کے نیچے رکھا کرتا تھا لیکن اس قصبے کے جو معززین میرے پاس آئے انہیں میں نے اتنی عزت اور اتنے احترام سے اپنے پاس بٹھایا کہ ان کا دماغ خراب کر دیا۔ یہ میری مسمریزم تھی جو میں نے ان پر چلائی تھی کیونکہ میں نے ان سے افراد اور حالات کے متعلق صحیح معلومات لینی تھیں۔

میں نے ان سے معطل شدہ بڑے اور چھوٹے تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل کے متعلق بہت کچھ پوچھا۔ مقتول اور اس کے باپ کے متعلق پوچھا۔ ان میں سے کسی کے متعلق بھی کوئی غیر معمولی بات معلوم نہ ہوئی۔ سب انسپکٹر رائے برمن کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ رشوت خور اور عیاش تھا۔ اس کا اے ایس آئی اسی کی لائن پر چلتا تھا۔ مقتول کا نام نذیر احمد تھا اور جیرا کہلاتا تھا۔ قتل ہونے تک وہ گمنام آدمی تھا۔ اس کی عمر چھبیس سال تھی اور ایک یا ڈیڑھ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ گمنام اس وجہ سے تھا کہ غریب آدمی تھا اور ایک ہندو

آڑھتی کی دکان پر ملازم تھا۔

جیرے کا باپ بھی محنت مزدوری کرنے والا غریب آدمی تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ جیرا شادی کے بعد اپنے ماں باپ سے الگ ہو گیا تھا اور اسی محلے میں ایک مکان میں کرائے پر رہتا تھا۔ نہ جیرا بدمعاش تھا نہ اس کا باپ نہ اس کے کسی بھائی کے خلاف کسی کو کوئی شکایت تھی۔ وہ مویشیوں کی طرح زندہ رہنے والے لوگ تھے جن کے دو ہی کام ہوتے ہیں۔ پیٹ بھرنا اور بچے پیدا کرنا۔

جیرے کے متعلق کچھ رپورٹیں اس کے خلاف بھی ملیں جو دراصل اس کے ایک سالے کے خلاف تھیں جس کی عمر جیرے سے ڈیڑھ دو سال کم تھی۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اچھے چال چلن والا نہیں تھا۔ جوا وغیرہ بھی کھیل لیتا تھا۔ اس کے ساتھ جیرے کا رشتہ صرف یہ نہیں تھا کہ وہ جیرے کا سالا تھا بلکہ ان کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ میرے نزدیک یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو جیرے یا اس کے باپ کے خلاف جاتی۔

پردے پردے میں

یہ لوگ جنہیں میں نے پولیس کا پیشہ ور یا عادی خوشامدی کہا ہے، مجھے باری باری ملنے آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ شہر میں سب انسپکٹر رائے برمن کا کون ایسا دشمن تھا جس نے اس پر یہ الزام لگوایا اور جیرے کے باپ سے درخواست دلائی ہے کہ رائے برمن نے جیرے پر تشدد کر کے اسے مارا ہے؟

مجھے اس سوال کا تسلی بخش جواب کسی سے بھی نہ ملا۔ ان لوگوں میں ہندو زیادہ تھے، دو یا تین مسلمان اور دو سکھ تھے۔ باقاعدہ مخبروں سے بھی معلوم کیا۔ وہ بھی سب انسپکٹر رائے برمن کا کوئی دشمن نہ بتا سکے۔ اگر ایسا کوئی دشمن تھا تو اس کا سراغ مجھے خود ہی لگانا تھا۔

میں نے مقتول کے باپ کو تھانے بلایا۔ اسے جب میرے سامنے کھڑا کیا گیا تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ خوف کے مارے اندر سے کانپ رہا ہے اور اسے سہارا نہ دیا گیا تو گر پڑے گا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ اس طرح فرش پر بیٹھ گیا کہ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی رہیں جیسے اسے یہ خطرہ تھا کہ میں اس پر حملہ کر دوں گا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو اس کے چہرے پر خوف کا تاثر اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ اسے یقین نہیں

آ رہا تھا کہ میں اسے کرسی پر بٹھا رہا ہوں۔ تین چار بار کہنے سے وہ کرسی پر بیٹھا۔ میں نے اس سے اتنا ہی پوچھا کہ تم نے ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی ہے کہ تمہارے بیٹے کو.....

''حضور، مائی باپ!''— اس نے میری پوری بات نہ سنی اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ رونے جیسی آواز میں کہنے لگا— ''میں نے خود درخواست نہیں دی تھی۔ ملک عباس نے درخواست لکھی تھی اور اس پر میرا انگوٹھا لگوایا تھا''۔

اس سے مجھے شک ہوا کہ اس غریب آدمی کو سب انسپکٹر رائے برمن کے خلاف آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ میں نے اسے پوچھا کہ ملک عباس کون ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہے۔

''کیا تمہیں بتایا گیا تھا کہ درخواست میں کیا لکھا ہے؟''

''ہاں حضور!''— جیرے کے باپ نے جواب دیا— ''انہوں نے درخواست پڑھ کر سنائی تھی۔ میں نے خود درخواست نہیں دی تھی۔ اگر حضور حکم کریں تو میں درخواست واپس لے لوں گا''۔

وہ بہت ہی ڈرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے بات کرتا اور ہکلاتا تھا جو خوفزدگی کی علامت تھی۔ میں نے اس کے ساتھ پیار اور شفقت سے بات کی اور اسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور وہ مجھ سے نہ ڈرے۔ اس کے ساتھ اس طرح باتیں کیں جیسے میں تھانیدار نہیں ہوں اور اس نے جو کچھ کیا ہے، بہت اچھا کیا ہے۔

اس کے دل سے خوف اُتار کر اسے کہا کہ وہ سب سے پہلے یہ بتائے کہ اسے یہ شک کس طرح ہوا تھا کہ اس کے بیٹے کو تھانے بلایا گیا اور اس پر تشدد کیا گیا تھا۔

''آپ کو اپنا مائی باپ سمجھتا ہوں حضور!''— اس نے کہا— ''اگر کوئی بات فضول منہ سے نکل جائے تو معاف کر دینا..... جیرا میرا بیٹا تھا حضور! ایک روز مجھے پتہ چلا کہ سیٹھ پیارے لال نے اس پر چوری کا الزام لگایا ہے اور اسے تھانے بلایا گیا ہے۔ میں نے جیرے سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ اسے تھانے بلایا گیا تھا اور دونوں بار تھانیدار نے اس سے پوچھ گچھ کر کے چھوڑ دیا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ ایک دو دن سوچ لو، میں تمہیں پھر بلاؤں گا اور اگر تم نہ مانے تو بہت برا سلوک کروں گا.....

''جیرا سیٹھ پیارے لال کی دکان پر ملازم تھا۔ میں سیٹھ کے پاس چلا گیا اور اس کے

قدموں میں بیٹھ کر کہا کہ میرا بیٹا چور نہیں اور آپ غریبوں پر یہ ظلم نہ کریں۔ آپ خود سیانے ہیں مائی باپ! غریب آدمی کو صرف اس لیے چور سمجھا جاتا ہے کہ وہ غریب ہے..... میری منت سماجت پر سیٹھ نے کہا کہ اپنے بیٹے سے کہو کہ وہ میرا مال پردے پردے میں مجھے دے دے اور میں پولیس سے مقدمہ واپس لے لوں گا.....

''میں نے پھر بھی اس کی منت کی اور اس کے پاؤں پر بھی ہاتھ رکھا لیکن وہ نہ مانا۔ میں نے جیرے سے پوچھا تو جیرا قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ اس نے چوری نہیں کی۔''

''چوری کہاں سے ہوئی تھی؟''— میں جانتا تھا کہ یہ رہزنی کی واردات تھی لیکن میں جیرے کے باپ سے پوچھنا چاہتا تھا— ''کیا سیٹھ کے گھر چوری ہوئی تھی یا دکان سے؟''

''نہیں حضور!''— اس نے جواب دیا— ''یہ واردات تو سارے شہر میں مشہور ہوگئی تھی کہ سیٹھ وصولیوں کے لیے دیہات میں گیا تھا اور واپسی پر رات ہوگئی۔ ایک یا دو آدمیوں نے اسے روک کر اس کے پاس جو کچھ تھا وہ لے لیا۔ میرا بیٹا رہزن تو نہیں ہوسکتا حضور!''

''پھر تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ تمہارے بیٹے کو رات کو تھانے بلایا گیا تھا؟''

''میرے محلے کے ایک آدمی نے بتایا تھا''— اس نے جواب دیا اور اس آدمی کا نام بتا کر کہا— ''اس نے اسے ایک آدمی کے ساتھ تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں جیرے کے گھر گیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہم سے الگ رہتا ہے۔ میں نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ جیرا کہاں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اسے معلوم نہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ وہ کس کے ساتھ گیا ہے تو اس نے بتایا کہ اسے کوئی بلانے آیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ جیرے کو شاید تھانے بلایا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ تھانے میں اس کا کیا کام ہوسکتا ہے؟''

اس نے جس آدمی کا نام لیا تھا، میں نے اسے تھانے بلوایا۔ اس کے آنے تک میں مقتول کے باپ سے تفتیش کرتا رہا۔

جوانی کے نشے میں چور تھی

اسے پکا شک تھا کہ اس کے بیٹے کو اس رات تھانے بلایا گیا تھا اور وہاں سے وہ واپس نہیں آیا۔ صبح اسے اطلاع ملی کہ اس کے بیٹے کی لاش فلاں جگہ پڑی ہوئی ہے۔ وہ

وہاں گیا اور اپنے بیٹے کی لاش دیکھی۔ سب انسپکٹر رائے برمن وہاں آچکا تھا۔ اسے لاش کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی۔

رائے برمن نے مقتول کے باپ، بیوی وغیرہ کو تھانے بلایا اور باپ سے پوچھنے لگا کہ مقتول کی ذاتی یا خاندانی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ باپ بہت ہی غمزدہ تھا۔ اس نے غم کی شدت میں کہہ دیا کہ رات کو اسے تھانے بلایا گیا تھا۔ اس کی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا حریف سیٹھ پیارے لال ہوسکتا تھا جو کہتا تھا کہ جیرے نے اسے لوٹا ہے۔

''اگر تم نے یہ بات کسی اور کے سامنے کی تو میں تمہیں الٹا لٹکا دوں گا''— رائے برمن نے اسے کہا— ''میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ''۔

باپ نے پھر اپنا ٹک دہرا دیا۔ رائے برمن نے اس کی اتنی پٹائی کی کہ وہ کچھ دیر بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش میں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے منہ پر پانی پھینکا گیا تھا اور اس کے منہ میں پانی ڈالا بھی گیا تھا۔

''سیٹھ پیارے لال کو راستے میں روک کر تم نے لوٹا ہے''— چھوٹے تھانیدار (اے ایس آئی) نے اسے کہا۔ وہ پہلے اس کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اس نے مقتول کے باپ کو گالیاں دے کر رائے برمن سے کہا— ''رائے جی! اسے حوالات میں بند کردو۔ یہ پکا ڈاکو ہے''۔

اسے گھسیٹنے اور دھکے دینے لگے۔ ایک غریب آدمی پر جو دہشت طاری ہوئی ہوگی اس کا اندازہ صرف میں ہی کرسکتا ہوں۔ یہ شخص جس طرح میرے سامنے آکر خوفزدہ ہوا تھا وہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔ وہ سب انسپکٹر رائے برمن کے قدموں میں گر پڑا۔ اسے اور زیادہ ڈرا دھمکا کر اور ذلیل و خوار کر کے اس تسلی کے ساتھ تھانے سے نکال دیا گیا کہ اس کے بیٹے کا قاتل مل جائے گا۔

مقتول کی بیوی سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ مقتول کے باپ نے مجھے بتایا کہ مقتول کی بیوی کو بہت دیر، شام تک تھانے میں رکھا گیا تھا۔

''وہ جب واپس آئی تھی تو کیا وہ بھی تمہاری طرح ڈری ہوئی تھی؟''— میں نے پوچھا۔

''نہیں''۔۔۔ مقتول کے باپ نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔۔۔ ''وہ ڈری ہوئی نہیں تھی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ جیرے کو رات تھانے نہیں بلایا گیا تھا''۔

''اب درخواست کی بات سناؤ''۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ ''ملک عباس نے تمہاری درخواست کیوں لکھی تھی؟ کیا تم نے اسے کہا تھا؟''

یہ ذہن میں رکھیں کہ ڈپٹی کمشنر کا دفتر ضلعی شہر میں تھا جو اس قصبے سے ستائیس میل دور تھا۔ اس قصبے کے جو آدمی اس شہر میں ملازم تھے وہ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے ہفتے کی شام اپنے گھروں کو آجایا کرتے تھے۔ ملک عباس ڈپٹی کمشنر کا ریڈر تھا۔ مقتول کے باپ نے مجھے بتایا کہ اگلے روز بھی اسے تھانے بلایا گیا۔ اس کے بیٹے کی لاش کو دفنانے کے لیے نہلایا جا چکا تھا۔ یہ غریب آدمی تھانے گیا تو اسے پھر ڈرایا دھمکایا گیا اور کہا گیا کہ قاتل کا سراغ مل گیا ہے اور وہ اپنی زبان بند رکھے۔ اس نے بیٹے کا جنازہ اٹھوانا تھا اور وہ پہلے ہی دہشت کا مارا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر رائے برمن سے کہا کہ اسے بیٹے کے جنازے کے لیے گھر جانے دیا جائے۔ اسے اجازت دے دی گئی۔

اس کا بیٹا دفن ہو گیا۔ اگلے روز ہفتہ (سنیچر) تھا۔ ملک عباس اسی محلے کا رہنے والا صاحب حیثیت اور نیک سیرت آدمی تھا۔ مقتول کے باپ نے مجھے بتایا کہ ملک عباس ہفتے کی شام اتوار کی چھٹی کے لیے گھر آیا تو فاتحہ کے لیے مقتول کے باپ کے گھر گیا اور ایسے الفاظ میں ہمدردی کا اظہار کیا کہ غم کے مارے ہوئے باپ پر تھانے میں جو تشدد ہوا تھا وہ اس نے ملک عباس کو سنا دیا۔ ملک عباس خاموشی سے چلا گیا۔

دوسرے دن ملک عباس نے مقتول کے باپ کو اپنے گھر بلایا۔ وہاں دو اور معزز آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی مسلمان تھے۔ ملک عباس نے ایک درخواست مقتول کے باپ کو پڑھ کر سنائی جو اس کی طرف سے ڈپٹی کمشنر کے نام لکھی گئی تھی۔ مقتول کے باپ کا اس پر انگوٹھا لگوایا گیا اور درخواست ملک عباس نے اپنے پاس رکھ لی۔

چار دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مقتول کے باپ کو تھانے بلایا گیا۔ وہاں ڈی ایس پی ڈریک آیا ہوا تھا۔ اس نے مقتول کے باپ کا بیان لیا۔ باپ کا بیان وہی تھا جو اس نے مجھے دیا تھا۔ ڈی ایس پی نے جو کارروائی کی وہ میں پہلے سنا چکا ہوں۔ میں نے اب یہ ثابت کرنا تھا کہ مقتول تھانے میں تشدد سے ہلاک ہوا ہے یا یہ کہ یہ الزام غلط ہے اور قاتل

کوئی اور ہے۔ اس صورت میں مجھے اس قاتل کا سراغ لگانا تھا۔

ملک عباس میرے لیے ایک اہم گواہ تھا۔ ایک اس لیے کہ وہ ڈی سی کا ریڈر تھا، لہٰذا ان امور کا اُسے تجربہ تھا۔ دوسرے اس لیے کہ اس نے یہ درخواست بلا سوچے سمجھے نہیں لکھی ہوگی بلکہ کچھ نہ کچھ شہادت دیکھی ہوگی اور تیسری وجہ اس کی اہمیت کی یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا اور نیک سیرت تھا کیونکہ اس نے ایک غریب اور بے آسرا مسلمان کی مدد کی تھی۔ اس نے ہفتے کی شام گھر آنا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے ہفتے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ میں نے اسے ٹیلیفون کیا اور کہا کہ وہ آج ہی شام یا کل صبح میرے پاس آجائے۔ میں اسے تفتیش کے لیے سرکاری طور پر بلا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دفتری کارروائی کے مطابق کل صبح آجائے گا۔

میں مقتول کے باپ سے مزید پوچھ گچھ کرتا رہا اور اس دوران اس آدمی کو تھانے لانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا جس نے مقتول جیرے کو اس رات تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسی کانسٹیبل کو کہا کہ وہ سیٹھ پیارے لال کو بھی تھانے پہنچنے کے لیے کہے اور مقتول کی بیوی کو اپنے ساتھ لیتا آئے۔

مقتول کے باپ سے میں نے مقتول کے سالے کے متعلق پوچھا۔ مجھے بتایا گیا تھا وہ اچھے چال چلن کا آدمی نہیں اور اس کی مقتول کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ مقتول کے باپ نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے اپنے انداز سے مزید کریدا تو اس نے تسلیم کیا کہ یہ لڑکا بدنام ہے اور جیرے کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔

''ایک بات اور بتاؤ''۔۔۔ میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا۔۔۔ ''جیرے کی بیوی کی تو کسی اور کے ساتھ دوستی نہیں تھی؟''

وہ چپ رہا اور پریشان سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں غریب آدمی سمجھ کر تمہاری بے عزتی کر رہا ہوں''۔۔۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ہو سکتا ہے تمہارے بیٹے کو کسی اور نے قتل کیا ہو اور اس میں اس کی بیوی کا بھی ہاتھ ہو..... جیرا شادی کر کے تم سے الگ کیوں ہو گیا تھا؟''

''بیوی نے اسے الگ کرایا تھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میری بیوی کے ساتھ یہ لڑکی بہت لڑتی جھگڑتی تھی۔ شوقین لڑکی ہے۔ جوانی کا نشہ ہے حضور! اپنی اور ہماری حیثیت نہیں دیکھتی۔ اس کا بھائی بھی شوقین ہے۔ کام کاج تو کرتا کوئی نہیں لیکن کپڑے

اچھے بھلے پہنتا ہے"۔

"جیرے کی بیوی کے چال چلن کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"نہیں حضور!"— اس نے جواب دیا— "کبھی کوئی ایسی بات سنی نہیں۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ میرے بیٹے نے اسی کے کہنے پر الگ مکان کرائے پر لے لیا تھا"۔

میں یہ تحقیقات اس لیے بھی کر رہا تھا کہ جیرے کا قاتل کوئی اور بھی ہو سکتا تھا اور اس کا باعث بھی کچھ اور ہوگا۔

دیسی شراب کی دو بوتلیں

میں نے جنہیں تھانے بلایا تھا وہ آ گئے تھے سب سے پہلے سیٹھ پیارے لال کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ وہ رہزنی کا شکار کس طرح ہوا ہے اور اس کا کتنا مال گیا ہے۔ اس نے جو تفصیل سنائی وہ میں نے اس تفصیل کے ساتھ ملائی جو اس کیس کی فائل میں لکھی ہوئی تھی۔ یہ بالکل صحیح تھی۔ رقم کے علاوہ سونے کی ایک انگوٹھی، دو جھمکے اور سونے کے دو کڑے تھے۔ یہ زیورات ایک دیہاتی نے اس کے پاس گروی رکھے اور کچھ رقم سود پر قرض لی تھی۔ رقم اور زیورات کپڑے کی ایک تھیلی میں تھے جو رہزنوں نے چھین لی تھی۔

میں نے اس واردات کی تفتیش کی فائل کا ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ بتا دوں۔ اس میں کسی بھی مشتبہ کا نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ جیرے کا بھی نام نہیں تھا۔ کچھ ضمنیاں تحریر کی ہوئی تھیں۔ ان سے کوئی شک پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"لالہ جی!"— میں نے سیٹھ سے کہا— "یہ تو صاف بات ہے کہ آپ کی دلچسپی صرف یہ ہے کہ آپ کا چور پکڑا جائے اور آپ کو آپ کا مال مل جائے"۔

"ہاں جناب!"— اس نے ہندوؤں کے خاص انداز سے ہاتھ جوڑ کر کہا— "پہلے تھانیدار تو کچھ بھی نہ کر سکے"۔

"اس تھانیدار نے تو سارا معاملہ چوپٹ کر دیا ہے لالہ جی!"— میں نے کہا— "آپ کا جو چور تھا اسے تھانے بلا کر جان سے ہی مار دیا"۔

میں نے سیٹھ کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اس کے چہرے پر جو تبدیلی آئی تھی اسے پڑھنے کی کوشش کی۔

"اس کی لاش تو کہیں اور سے ملی تھی سرکار!"— سیٹھ پیارے لال نے کہا۔

"ان چکروں میں آپ نہ پڑیں لالہ جی!"— میں نے کہا— "میں آپ کا مال برآمد کرنے کی کوشش میں ہوں۔ کوئی مرے یا جیئے، میں آپ کا مال برآمد کر کے آپ کی جھولی میں ڈالوں گا"۔

سیٹھ کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ہندو سیٹھ ہو، کروڑ پتی ہو، وہ ہوتا بنیا ہی ہے۔ پیسے کی خاطر اپنے بیوی بچوں کو قربان کر دیتا ہے۔ پیسہ اور ذاتی مفاد اس کا مذہب ہے۔ اس زمانے میں بھی ہندو کی یہی ذہنیت تھی جب اس کی بغل میں چھری تھی اور آج بھی اس کی ذہنیت وہی ہے۔ جب اس کی بغل میں اگنی میزائل اور ایٹم بم ہیں۔ میں نے سیٹھ پیارے لال کی دکھتی رگ ہاتھ میں لے لی۔

"اگر آپ تھانیدار رائے برمن کی مٹھی گرم کر دیتے تو وہ چور کو پکڑنے میں دن رات ایک کر دیتا"— میں نے ایک شک کی بنا پر کہا— "اس نے آپ کو ضرور اشارہ دیا تھا"۔

"چھوٹے تھانیدار نے صاف اشارہ دیا تھا"— اس نے کہا— "میں نے ایک سو روپیہ بڑے تھانیدار کو، پچاس روپے چھوٹے تھانیدار کو اور پچیس روپے حوالدار (معطل شدہ ہیڈ کانسٹیبل) کو دیئے تھے"— اس نے ایک دو سیکنڈ چپ رہ کر کہا— "اگر آپ میرا مال برآمد کر دیں تو....."

"نہ لالہ جی!"— میں نے اسے آگے بولنے نہ دیا..... "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ کا پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا ہے۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ آپ نے یہ رقمیں پہلے دن ہی ان لوگوں کو دی تھیں یا بعد میں؟"

"پہلے دن نہیں"— اس نے جواب دیا— "سات آٹھ دن بعد"۔

"ذرا سوچ کر بتائیں"— میں نے پوچھا— "جس روز جیرے کی لاش ملی تھی اس سے کتنے دن پہلے ان لوگوں نے آپ سے پیسے مانگے تھے؟"

"ایک روز پہلے"— اس نے جواب دیا— "انہوں نے تو اس سے دگنی رقم مانگی تھی۔ آخر سودا اس رقم پر ہوا جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ اس کے علاوہ دیسی شراب کی دو بوتلیں بھی میں نے انہیں دی تھیں"۔

ایک سو روپیہ، پچاس اور پچیس روپے اس وقت کی خاصی زیادہ رقمیں تھیں۔

''رائے برمن نے آپ کو تسلی دی ہوگی کہ وہ بہت جلد مال برآمد کرادے گا''۔

''اس نے تو پکا وعدہ کیا تھا کہ کل تک ملزم حوالات میں ہوگا''۔۔۔ اس نے کہا۔

''کیا آپ کو جیرے پر پکا شک تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کیا اس سے پہلے کبھی اس نے چوری کی تھی؟ وہ آپ کا ملازم تھا''۔۔۔ میں نے ذرا سوچ کر کہا۔۔۔ ''لالہ جی مہاراج! اگر آپ کو اپنا مال واپس چاہئے تو سچ بولنا۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں لینا۔ اگر جھوٹ موٹ سے مجھے نچانے کی کوشش کرو گے تو ایسا نہ ہو کہ آپ کو لینے کے دینے پڑ جائیں''۔

کچھ ایسی ہی اور باتوں سے اس سیٹھ کو ڈرایا۔ ہندو بڑی ہی مکار اور عیار قوم ہے۔ میرے ڈرانے اور اسے یہ لالچ دینے کا کہ اس کا مال مل جائے گا وہ کچھ سچی باتیں کرنے لگا۔

''میں نے رائے برمن کو تو یہی کہا تھا کہ مجھے جیرے پر پکا شک ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اب آپ ہی بتائیں کہ شک پکا ہوتا ہے یا نہیں۔ جیرے نے پہلے کبھی چوری نہیں کی تھی۔ میں نے اس پر شک اس بنا پر کیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ میں وصولیوں کے لیے فلاں فلاں گاؤں میں جا رہا ہوں۔ میں نے جیرے کو کہا تھا کہ ہوسکتا ہے مجھے واپسی میں اتنی دیر ہو جائے کہ سورج غروب ہو جائے۔ تم یوں کرنا کہ شام کو نالے کے پار پرانے کنوئیں کے پاس آ جانا۔ میں اسی راستے سے واپس آؤں گا''۔

میں نے بعد میں نالے کے پار پرانے کنوئیں کا علاقہ دیکھا تھا۔ یہ برساتی نالہ تھا جو ان دنوں خشک پڑا تھا۔ پرانا کنواں ایک صدی یا اس سے بھی زیادہ پرانا اور ویران ہو چکا تھا۔ اس میں پانی نہیں کیچڑ تھا۔ قصبے سے یہ ایک میل سے زیادہ فاصلے پر تھا۔ اردگرد کا علاقہ کٹا پھٹا تھا۔ اس علاقے میں کوئی گاؤں نہیں۔ قصبے کو آنے والا ایک راستہ وہیں سے گزرتا تھا۔

سیٹھ پیارے لال نے اپنے بیان میں کہا کہ اسے ایک گاؤں میں دیر ہو گئی۔ اس کے پاس کرائے پر لی ہوئی گھوڑی تھی۔ وہ جب پرانے کنوئیں والے علاقے میں پہنچا تو جیرا وہاں نہیں تھا۔ اس نے جیرے کو آوازیں دیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ سیٹھ جب نالے میں آیا تو اچانک دو آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔

سیٹھ سمجھا کہ یہ جیرا ہے جو اپنے کسی دوست کو ساتھ لایا ہے۔ جیرے کو اس نے اپنی حفاظت کے لیے بلایا تھا۔

''تم یہاں کھڑے ہو''۔۔۔ سیٹھ نے بڑے رعب سے کہا۔۔۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ سورج غروب ہو جائے تو پرانے کنوئیں پر آ جانا''۔

''یہ تھیلی ہمارے حوالے کر دو''۔۔۔ ایک آدمی نے اسے کہا۔۔۔ ''اور اپنی جان بچاؤ''۔

سیٹھ نے مجھے بتایا کہ ان دونوں کے چہرے صافوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے بھی انہیں پہچاننا بہت ہی مشکل تھا۔ سیٹھ نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے اور رویا بھی۔ رہزنوں نے اس پر رحم نہ کیا اور چاقو دکھا کر اس سے تھیلی لے لی۔ اس کے کرتے کی جیب کی تلاشی لے کر جو پیسے جیب میں تھے وہ بھی نکال لئے۔

''میں نے ان کی منتیں کی تھیں''۔۔۔ سیٹھ نے مجھے بتایا۔۔۔ ''اور انہوں نے میرے ساتھ باتیں کی تھیں''۔

''کیا باتیں کی تھیں؟''

''زیادہ نہیں!''۔۔۔ سیٹھ نے جواب دیا۔۔۔ ''وہ یہی کہتے رہے کہ جان سے مار دیں گے۔ گھوڑی بھی لے لیں گے۔ تم سود خور غریبوں کا خون چوستے ہو..... ان میں سے ایک کی آواز جیرے جیسی تھی..... حضور! جیرے پر مجھے شک ہونا ہی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میری واپسی پر اندھیرا ہو جائے گا۔ اگر مجھے جیرے نے نہیں لوٹنا تو اس نے اپنے دو آدمی مجھے لوٹنے کے لیے بھیج دیئے۔ میں نے اس کی آواز بھی پہچانی تھی''۔

''وہاں سے آپ سیدھے تھانے گئے؟''

''تھانے تو میں بعد میں گیا تھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''پہلے میں جیرے کے گھر گیا۔ وہ گھر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ شام کو باہر چلا گیا تھا اور ابھی واپس نہیں آیا..... میں تھانے چلا گیا۔ وہاں نہ بڑا تھانیدار تھا نہ چھوٹا تھانیدار تھا۔ ایک حوالدار نے میری رپورٹ لکھی اور مجھے کہا کہ صبح ہوتے ہی تفتیش شروع ہو جائے گی۔ میں نے بہت زور دیا کہ مجھے بڑے تھانیدار سے ملوا دو لیکن حوالدار (ہیڈ کانسٹیبل) مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ میں خود ہی بڑے تھانیدار کے گھر چلا گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک آدمی نکلا میں نے اسے کہا کہ تھانیدار صاحب سے ملنا ہے۔ اس نے کہا کہ تھانیدار صاحب بیمار ہیں اور سو گئے ہیں''۔

دو آبے کی زبان میں

تھانیدار کی بیماری اور اس کے سو جانے کے متعلق میں نے بعد میں اصلیت معلوم کی تھی وہ میں یہیں بتا دیتا ہوں۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ جو آدمی رائے برمن کے گھر سے نکلا تھا وہ کون سا کانسٹیبل تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ رائے برمن اور اس کا اے ایس آئی شراب کے نشے میں بدمست تھے۔ قصبے کے دو معزز قسم کے بدمعاش بھی وہاں موجود تھے اور تاش کی بازی لگی ہوئی تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ رائے برمن اور اے ایس آئی کا مکان معزز قسم کے جوئے بازوں کے اڈے بنے ہوئے تھے۔

اگر رائے برمن ہوش میں ہوتا اور اسے اپنی ڈیوٹی کا پاس ہوتا تو وہ اسی وقت سیٹھ کا بیان لیتا۔ سیٹھ اسے بتاتا کہ اسے اپنے ملازم پر شک ہے اور اس کا ملازم اپنے گھر سے غیر حاضر ہے تو رائے برمن اسی وقت جیرے کے گھر چھاپہ مارتا پھر وہ جائے واردات پر جاتا اور کھرے محفوظ کر لیتا۔ اس طرح صبح تک جیرا پکڑا جاتا یا یہ ثابت ہو جاتا کہ جیرا بے گناہ تھا۔

مجھے دوسرے ذرائع سے پکی خبر مل گئی تھی کہ رائے برمن نے اپنے تھانے کے علاقے کو اپنی ریاست بنا رکھا تھا اور اپنے تھانے کے تمام عملے کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی، تمام بڑے بڑے بدمعاشوں، بڑے زمینداروں اور شہر کے اثر و رسوخ والے افراد کے ساتھ اس نے بڑے اچھے تعلقات بنا رکھے تھے۔ اس کا کمال یہ بھی تھا کہ جرائم پر بھی اس نے کنٹرول رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس اقبال جرم کرانے کا طریقہ ایذا رسانی تھا، لیکن یہ تمام معلومات حاصل ہو جانے کے باوجود یہ ثابت کرنا میرے لیے آسان نہیں تھا کہ جیرا اس کے تشدد سے ہلاک ہوا ہے اور یہ ثابت کرنا بھی آسان نہیں تھا کہ اسے کسی اور نے قتل کیا ہے۔

میرے ذہن میں ایک شک اور آیا۔ وہ یہ تھا کہ رہزنوں میں ایک جیرا تھا اور دوسرا اس کا کوئی دوست تھا۔ دونوں نے رہزنی کی واردات کی اور مال کی تقسیم پر ان کا جھگڑا ہوا۔ جیرے کا ساتھی پیشہ ور رہزن یا ڈکیت ہوگا۔ اس نے جیرے کا پتہ ہی کاٹ دیا۔

جیرے کی لاش جس جگہ پڑی ہوئی پائی گئی تھی وہ جگہ رہزنی کی جائے واردات سے

بہت دور یعنی قصبے کے دوسری طرف تھی۔

یہاں مناسب لگتا ہے کہ میں پوسٹمارٹم رپورٹ کی تفصیل سناؤں۔ مقتول کے سر پر ضرب لگی تھی لیکن یہ ضرب لاٹھی یا ڈنڈے وغیرہ کی نہیں تھی اور یہ زخم بھی نہیں تھا۔ اس سے دماغ کو ایسی ضرب پڑی کہ دماغ سے خون جاری ہوا جسے برین ہیمریج کہتے ہیں۔ اتفاق سے پوسٹمارٹم کرنے والا سرکاری ڈاکٹر عیسائی تھا۔ اگر وہ ہندو ہوتا تو رائے برمن اسے بھی اپنا دوست بنا لیتا اور ڈاکٹر اس کی مرضی کے مطابق پوسٹمارٹم رپورٹ لکھتا۔ اس وقت عیسائی اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ اور ہمیں اپنی رعایا سمجھا کرتے تھے۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اس نے رائے برمن (اگر وہ قتل کا ملزم تھا) کی کوئی مدد نہ کی۔ میں اس کے پاس چلا گیا تھا۔ اس نے مجھے واضح الفاظ میں پوسٹمارٹم رپورٹ سمجھائی تھی۔

اس دور میں پوسٹمارٹم اتنی باریکی سے کیا جاتا تھا جیسے لاش کا ایک ایک بال چیک کیا گیا ہو۔ اس عیسائی ڈاکٹر نے پوسٹمارٹم رپورٹ میں لکھا بھی تھا اور مجھے بتایا بھی تھا کہ لاش کے ٹخنوں کے قریب دونوں ٹانگوں پر اس قسم کے بڑے صاف نشان تھے جیسے رسی سے پاؤں باندھے گئے ہوں۔ پوسٹمارٹم رپورٹ میں معدے کی کیفیت یہ لکھی گئی تھی کہ معدے میں جو غذا تھی وہ ابھی ہضم ہونا شروع نہیں ہوئی تھی اور غذا کی خاصی مقدار خوراک کی نالی میں حلق تک واپس آئی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ دماغ سے جو خون نکلا تھا وہ دماغ میں ہی یعنی کھوپڑی کے اندر ہی جمع ہو کر جمتا رہا۔ تھوڑی سی مقدار ناک میں آئی تھی۔

''میں آپ کا امتحان لینا چاہتا ہوں''۔۔۔ ڈاکٹر فرانسس نے ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا۔۔۔ ''اس سے آپ کیا سمجھے ہیں؟''

''مرنے سے پہلے مقتول کو الٹا لٹکایا گیا تھا''۔۔۔ میں نے جواب دیا۔۔۔ ''اور میرا خیال ہے کہ الٹا لٹکانے سے پہلے اس کے سر پر ضربیں لگائی گئیں''۔

''میرا خیال کچھ اور ہے''۔۔۔ ڈاکٹر فرانسس نے کہا۔۔۔ ''سر کی ضرب جس قسم کی تھی اس سے میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ مقتول کو پاؤں سے باندھ کر الٹا لٹکایا گیا اور اسے اونچا لے گئے۔ رسی ٹوٹ گئی ہوگی یا قاتلوں کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی ہوگی یا انہوں نے دانستہ رسی چھوڑ دی ہوگی جس سے مقتول سر کے بل گرا نیچے پکا فرش تھا یا کوئی بڑا پتھر ہوگا جس سے دماغ مجروح ہوا..... اب ڈی ٹیکشن (سراغرسانی) آپ کا کام ہے۔ میں نے

آپ کو بڑا واضح سراغ یا اشارہ دے دیا ہے''۔

میں سیٹھ پیارے لال کے بیان پر تھا اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔ سیٹھ نے مجھے بتایا کہ اگلے روز وہ رائے برمن سے تھانے میں جا کر ملا اور اسے ساری واردات سنائی اور جیرے پر شک کا اظہار کیا، لیکن یہ صرف شک تھا۔ رائے برمن نے جو کارروائی کی وہ پہلے سنا چکا ہوں۔ سیٹھ سے جو رشوت لی گئی وہ بھی سنا چکا ہوں۔ اب میں اپنے دماغ پر زور دینے لگا کہ مقتول کس طرح اور کہاں قتل ہوا۔ یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ مقتول کو وہاں قتل نہیں کیا گیا تھا جہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ میں نے وہ جگہ جا کر دیکھی۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا جس کے ساتھ مقتول کو الٹا لٹکایا گیا ہوتا۔ اردگرد کم و بیش چالیس چالیس قدم دور دور کچھ درخت تھے۔ میں نے اتنی محنت کی کہ ان درختوں کے نیچے گیا۔ اوپر بھی دیکھا۔ مجھے کوئی ایسا نشان نظر نہ آیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ مقتول کو یہاں لٹکایا اور سر کے بل گرایا گیا۔

یہی نظر آتا تھا کہ مقتول کی موت اسی طریقے سے کہیں اور واقع ہوئی اور اس کی لاش اس جگہ لے جا کر پھینک دی گئی جہاں یہ پڑی ہوئی ملی تھی۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ تھانوں میں ملزموں اور مشتبہوں پر پولیس پہلے روز سے ہی تشدد کرتی آئی ہے۔ بعض تھانوں میں الگ کمرے بنے ہوئے ہوتے ہیں جہاں ملزموں سے تفتیش کی جاتی ہے۔ یہ دراصل ٹارچر روم ہوتے ہیں جنہیں ٹی وی کے ایک ڈرامے میں ڈرائینگ روم کہا گیا تھا، اور بعض تھانوں میں تھانیدار کوئی سا کمرہ اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے اس تھانے کے ایک پرانے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا کہ اس مطلب کے لیے یہاں کون سا کمرہ استعمال ہوتا ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل مجھے تھانے کے پچھواڑے ایک کمرے میں لے گیا۔ میں نے اندر جاتے ہی سب سے پہلے اوپر دیکھا۔ چھت میں لکڑی کے بالے لگے ہوئے تھے۔ درمیان کے بالے میں دو کنڈے لگے ہوئے تھے لیکن کنڈا ایک ہی تھا اور دوسرے کنڈے کی جگہ بالے میں سوراخ تھا۔ یہ کنڈے پنکھا لٹکانے کے لیے لگائے جاتے تھے۔ یہ اس وقت استعمال ہوتے تھے جب بجلی نہیں آئی تھی۔ نوکر دروازے میں بیٹھ کر رسی کھینچتا رہتا اور کپڑے کا پنکھا ہلتا اور سارے کمرے کو ہوا پہنچاتا تھا۔

یہ کمرہ کسی وقت دفتر کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا اس لئے یہاں پنکھے کے لیے کنڈے

لگے ہوئے تھے۔ ایک کنڈا اترا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے یہ کمرہ دکھایا اور مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میرے ساتھ سکھ اے ایس آئی سندھو تھا۔ وہ اپنے طور پر اور کچھ میری ہدایات کے مطابق تفتیش کر رہا تھا۔ وہ تجربہ کار اے ایس آئی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر کے ساتھ میری کیا باتیں ہوئی ہیں۔ یہ میں اسے پہلے بھی بات چکا تھا۔ اب ہم دونوں اس معمے کو حل کرنے کے لیے تبادلہ خیالات کرنے لگے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جیرے کو اس رات اس کنڈے کے ساتھ لٹکایا گیا ہو اور کنڈا نکل گیا ہو۔

''ابھی پتہ چل جاتا ہے ملک جی!''—— سکھ اے ایس آئی نے کہا اور باہر نکل گیا۔

وہ جب واپس آیا تو وہی ہیڈ کانسٹیبل جس نے ہمیں یہ کمرہ دکھایا تھا اس کے ساتھ تھا۔ اے ایس آئی نے دوآبے کی ٹھیٹ پنجابی میں ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ بات کی۔ اس کا بات کرنے کا انداز یہ تھا کہ ہر فقرے کے بعد بڑی زور سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر مارتا تھا۔ سکھوں کی طرح وہ ہر فقرے میں دو تین گالیاں دیتا تھا۔ میں آپ کو اس کی یہ باتیں سلیس اردو میں ترجمہ کر کے سناتا ہوں۔

''مری بات کان کھول کر سن حوالدار!''—— اے ایس آئی سندھو نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور ایک بڑی دلچسپ گالی دے کر کہا—— ''تم سب ہمارے آگے بہت جھوٹ بول چکے ہو۔ اب سچ بولو۔ میں نے، ملک جی اور تم نے اسی تھانے میں رہنا ہے۔ اگر اب جھوٹ بولا تو میں تمہیں اس دوسرے کنڈے کے ساتھ اسی طرح لٹکا دوں گا جس طرح رائے برمن نے جیرے کو الٹا لٹکایا تھا''۔

ہیڈ کانسٹیبل نے دنیا بھر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ اسے بالکل علم نہیں کہ جیرے کو تھانے میں ہلاک کیا گیا تھا یا اس رات تھانے میں بلایا بھی گیا تھا یا نہیں۔

''پھر یہ بتا''—— اے ایس آئی نے پوچھا—— ''کہ تم لوگ ملزموں کے ساتھ اس کمرے میں کیا سلوک کرتے تھے..... سیدھی بات کر کیا یہاں اقبال جرم نہ کرنے والے ملزموں کو الٹا لٹکایا جاتا تھا؟''

''ہاں سردار جی!''—— ہیڈ کانسٹیبل نے بڑی برخورداری سے جواب دیا—— ''یہ تو سب انسپکٹر رائے برمن کا خاص طریقہ تھا۔ پہلے تو ملزم یا مشتبہ کی پٹائی ہوتی تھی۔ وہ نہ مانے تو کئی دوسرے طریقے آزمائے جاتے تھے۔ ان طریقوں میں ایک یہ تھا کہ اس کنڈے میں

ایک رسی گذاری ہوئی تھی۔ ملزم کے دونوں پاؤں اس رسی سے باندھے جاتے۔ دو کانسٹیبل اسے الٹا کر کے اوپر کو اٹھاتے۔ ایک آدمی رسی نیچے کو کھینچتا تھا اور رسی کا دوسرا سرا وہ سامنے والی کھڑکی کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا''۔

''ملزم کو فرش سے کتنا اونچا رکھتے تھے؟''— سندھو نے پوچھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ کے اشارے سے بلندی کا اندازہ بتایا۔ یہ کم و بیش ساڑھے پانچ فٹ بنتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملزم کا سر فرش سے ساڑھے پانچ فٹ اونچا رہتا تھا۔

''اب یہ بتا''— سندھو نے اس سے پوچھا— ''یہ کنڈا کب کا نکلا ہوا ہے؟''

''یقین جانیں سردار جی!''— ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا— ''میں نے آج دیکھا ہے کہ کنڈا نکلا ہوا ہے۔''

میں خاموش کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سکھ اے ایس آئی کی باتیں کارآمد تو تھیں ہی لیکن میں ان کی دلچسپی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''تم نے کتنے دن پہلے یہ کنڈا لگا ہوا دیکھا تھا؟''— سندھو نے پوچھا— ''اور یہ رسی کہاں ہے؟''

''کوئی ایک مہینہ پہلے یہ کنڈا لگا ہوا دیکھا تھا؟''— ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا— ''میں رسی تلاش کرتا ہوں۔ وہ تو اس کنڈے کے ساتھ لٹکتی رہتی تھی''۔

ٹوٹ ٹوٹ پڑتا تھا

ہیڈ کانسٹیبل نے سارا تھانہ چھان مارا، وہ رسی کہیں نظر آئی۔ یہ ایک ثبوت تھا کہ رسی غائب کر دی گئی ہے۔ میں نے سکھ اے ایس آئی کو سکھوں کی طرح بڑی بے ہودگی سے خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل سے بڑا اچھا سراغ اگلوا لیا تھا، لیکن یہ ثابت کرنا ابھی باقی تھا کہ جیرے کو یہاں الٹا لٹکایا گیا تھا۔

میں نے اس آدمی کو بھی بلوایا ہوا تھا جس نے یہ بتایا تھا کہ اس رات اس نے جیرے کو ایک آدمی کے ساتھ تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے اندر بلایا اور اس سے پوچھا کہ جب اس نے جیرے کو تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تھا، اندازاً وقت کیا تھا۔ اس کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اس نے جو اندازہ بتایا وہ نو اور دس بجے کے درمیان تھا۔ اس

زمانے میں قصبوں میں لوگ آٹھ بجے تک سو چکے ہوتے تھے۔

میں نے مقتول کی بیوی کو بھی بلوایا ہوا تھا۔ اس سے پوچھا کہ اس رات جیرا کسی کے بلانے پر تقریباً کتنے بجے باہر نکلا تھا۔

''میں سو گئی تھی''— اس نے جواب دیا— ''جیرا گھر نہیں تھا۔ وہ آیا اور اس نے مجھے جگایا۔ میں نے اسے کھانا دیا۔ وہ کھانا کھا کر لیٹ گیا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ جیرے نے مجھے کہا کہ دیکھنا، باہر کون ہے۔ میں نے کنڈی کھولی تو ایک آدمی نے کہا کہ جیرے کو باہر بھیجو۔ میں نے اندر جا کر جیرے کو بتایا۔ جیرا باہر نکلا۔ میں لیٹ گئی پھر میری آنکھ لگ گئی۔ آدھی رات کے بہت بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ جیرا بستر پر نہیں تھا۔ باہر دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا میں نے صبح تک انتظار کیا۔ صبح ہوتے ہی اطلاع ملی کہ جیرے کی لاش شہر کے باہر ایک جگہ پڑی ہوئی ہے''۔

میں نے اس لڑکی سے ابھی بہت کچھ پوچھنا تھا، لیکن ابھی اس وقت کا اندازہ کر رہا تھا جس وقت جیرے کو تھانے میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ جیرے کی بیوی کے بیان کے مطابق یہ تقریباً وہی وقت تھا جب جیرا تھانے گیا تھا۔ جیرے کی بیوی نے بتایا تھا کہ اس نے دیر سے کھانا کھایا تھا اور اس کے فوراً بعد ایک آدمی اسے بلانے آیا تھا۔ مجھے پوسٹمارٹم رپورٹ میں معدے کی جو کیفیت لکھی تھی وہ یاد آئی۔ وہ یہ تھی کہ معدے میں جو غذا تھی وہ ابھی ہضم نہیں ہوئی تھی اور غذا کی خاصی مقدار خوراک کی نالی میں واپس آئی ہوئی تھی۔ یہ اچھا خاصا ثبوت تھا کہ جیرے کو تھانے بلایا گیا اور الٹا لٹکایا گیا۔ اوپر لکڑی کے بالے میں جو کنڈے لگے ہوئے تھے وہ کم و بیش تین انچ سے زیادہ بالے کے اندر تھے۔ یہ پنکھے کا وزن سہارنے کے لیے تھے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی جتنا وزن لٹکایا جا سکتا تھا، لیکن بار بار اتنا وزن لٹکانے سے یہ بالے سے نکل بھی سکتے تھے۔ یہ تو ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بتا ہی دیا تھا کہ اس کنڈے کے ساتھ ملزموں کو لٹکایا جاتا تھا۔ جیرے کی باری آئی تو کنڈا نکل آیا۔

پھر میرے پاس وہ اہم شخص آ گیا جس کا نام ملک عباس تھا اور جس نے مقتول کے باپ کی درخواست لکھی اور ڈپٹی کمشنر تک پہنچائی تھی۔ وہ چالیس سال کی عمر کا معزز اور بارعب انسان تھا۔ اس نے جب میرے ساتھ بات کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صحیح معنوں میں نیک اور جہاندیدہ انسان ہے۔ میں نے اس سے صرف یہ پوچھا کہ اسے کس طرح

یقین ہو گیا تھا کہ مقتول کو تھانے میں تشدد سے مارا گیا ہے۔

''کیا آپ سب انسپکٹر رائے برمن کو نہیں جانتے؟''— اس نے پوچھا۔

''نہیں''— میں نے جواب دیا— ''میں نے پہلی بار اس کا نام سنا ہے''۔

''بہت ہی بدکار آدمی ہے''— ملک عباس نے کہا— ''اس نے تعلقات ایسے بنا رکھے ہیں کہ اس کے تمام جرائم پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ مسلمانوں کا تو یہ دشمن ہے۔ اگر کسی مسلمان کو رہزن لوٹ لیتے تو رائے برمن کوئی کارروائی نہ کرتا۔ لٹنے والا ہندو تھا اور اس نے شک ایک مسلمان پر کیا اس لیے اس نے مسلمان کو جان سے ہی مار ڈالا۔ میں نے ایک تو اس آدمی کے ساتھ بات کی تھی جس نے جیرے کو تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور میں ڈاکٹر فرانسس سے بھی ملا تھا۔ وہ نہایت اچھا انسان اور مخلص ڈاکٹر ہے۔ میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جیرے کے جسم پر تشدد اور ایذا رسانی کے نشانات تھے یا نہیں''۔

اس سے آگے ملک عباس نے مجھے ڈاکٹر کا وہی تجزیہ سنایا جو ڈاکٹر نے مجھے سنایا تھا۔

ملک عباس کے تجربہ کار دماغ نے یقین کر لیا کہ مقتول تشدد سے مرا ہے۔ ملک عباس نے قصبے کے دو معزز اور دانشمند مسلمانوں کے ساتھ بات کر کے مقتول کے باپ کی طرف سے ڈپٹی کمشنر کے نام درخواست لکھی اور درخواست پر مقتول کے باپ کا انگوٹھا لگوا کر درخواست لے گیا اور دستی ڈپٹی کمشنر کے آگے رکھ دی۔ ڈپٹی کمشنر نے فوری کارروائی کا حکم دیا اور جو کارروائی عمل میں آئی وہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

''ملک صاحب!''— میں نے ملک عباس سے پوچھا— ''یہ فیصلہ کس طرح ہوا تھا کہ ایس ایچ او، اے ایس آئی اور اس ہیڈ کانسٹیبل کو معطل کیا جائے؟''

''اس سوال کا جواب ڈی ایس پی ڈریک ہی دے سکتا ہے''— ملک عباس نے جواب دیا— ''میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ آپ معطل شدہ ہیڈ کانسٹیبل کو تھانے بلوائیں۔ تشدد کے ذریعے یا وعدہ معاف گواہ بنانے کا لالچ دے کر اسے اقبالی بیان پر اکسائیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ بیان دے دے گا''۔

ملک عباس کا یہ مشورہ بڑا اچھا تھا۔ یہ میں نے پہلے بھی سوچا تھا، لیکن میں اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کے حق میں نہیں تھا۔ بہر حال مشورہ قیمتی تھا۔ ملک عباس نے کچھ اور باتیں بھی بتائی تھیں اور اس نے کہا تھا کہ میں اسے جیسی بھی شہادت دینے کے لیے کہوں گا

وہ شہادت دے گا۔

میں نے اسی روز معطل شدہ ہیڈ کانسٹیبل کو تھانے طلب کرنے کا انتظام کر دیا۔ اگلے روز وہ تھانے میں آ گیا۔ اس کا نام جگن ناتھ تھا۔

''جگن ناتھ جی!''— میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر دوستانہ لہجے میں کہا— ''میرا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ اس سے زیادہ مہربانی نہیں کر سکتا کہ تمہیں یہاں بلایا ہے اور تمہاری جاں بخشی کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ میرے پاس شہادت اکٹھی ہو گئی ہے۔ تم خود پولیس کے پرانے ملازم ہو۔ سب کچھ جانتے ہو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر راضی ہو جائے گے تو میں تمہاری مدد کروں گا..... میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا''۔

''جناب عالی!''— اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا— ''آپ نے خود کہا ہے کہ میں پولیس کا بڑا پرانا ملازم ہوں۔ میں وعدہ معاف گواہ بننے کے لالچ میں نہیں آؤں گا۔ آپ کے پاس شہادت موجود ہے تو چالان عدالت میں پیش کر دیں۔ مجھے تو خواہ مخواہ رگڑا لگ رہا ہے''۔

ملک عباس نے مجھے بتایا تھا کہ سب انسپکٹر رائے برمن کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں اور اس نے ایسے تعلقات اور ایسا اثر و رسوخ بنایا ہوا ہے کہ اسے کسی کا ڈر اور خطرہ نہیں۔ اس ہیڈ کانسٹیبل نے جس دلیری اور ڈھٹائی سے مجھے جواب دیا۔ اس سے ملک عباس کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔

نیا اے ایس آئی منگل سنگھ سندھو جو میرے ساتھ آیا تھا، میرے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ اس نے جب ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ کا جواب سنا تو اس نے یہ پروا کیے بغیر کہ میں موجود ہوں۔ ہیڈ کانسٹیبل کی گردن پر ہاتھ رکھا اور جھٹکا دے کر اسے اٹھایا۔

''ملک جی!''— اے ایس آئی سندھو نے کہا— ''مجھے معاف کر دینا''— اس نے کہا پھر سکھوں کی طرح ایک گالی دے کر بولا— ''یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ میرے ساتھ آئیں''۔

وہ ہیڈ کانسٹیبل کو گردن سے پکڑ کر دھکیلتا ہوا باہر لے گیا اور میں بیوقوفوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ مجھے غصہ تو آیا۔ میں ڈسپلن کی پابندی بڑی سختی سے کیا اور کروایا کرتا تھا لیکن منگل سنگھ سندھو منہ زور اور سرکش قسم کا بیل تھا۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ

بڑے کام کا بیل تھا۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ کو پچھواڑے کے کمرے میں لے گیا۔ میں دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ سندھو طاقتور جسم کا سکھ تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو ایسی پٹخنی دی کہ ہیڈ کانسٹیبل پیٹھ کے بل گرا۔ سندھو نے اپنا ایک پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''ملک جی!''۔۔۔ اس نے مجھے کہا۔۔۔ ''اسے اسی طرح چھت کے ساتھ لٹکاؤں گا جس طرح انہوں نے جیرے کو لٹکایا تھا۔ اسے چھ فٹ اونچا لے جا کر رسی چھوڑ دوں گا۔ آگے اس کی قسمت ہے کہ زندہ رہے یا جیرے کی طرح مر جائے پھر میں اوپر والوں کو بیان دوں گا کہ انہوں نے اس طریقے سے جیرے کو قتل کیا تھا، آپ ادھر ہی ٹھہریں۔ میں رسی منگواتا ہوں۔''

''ذرا ٹھہر جا منگل سنگھ!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میرے اسی رسی سے لٹکاؤں گا جس سے انہوں نے جیرے کو لٹکایا تھا۔ اسے اٹھنے دو۔''

اے ایس آئی سندھو پیچھے ہٹ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل آہستہ آہستہ اٹھا۔

''وہ رسی کہاں ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''اگر وہ رسی برآمد کر کے بیان دے دو گے تو ٹھیک ہے ورنہ رسیاں بہت ہیں۔''

منگل سنگھ سندھو اس پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتا تھا اور میں اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دراصل ایکٹنگ تھی جو میں اور منگل سنگھ کر رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا اور وہ بول پڑا۔

چڑیا پھنس گئی ہے

''وہ رسی تو نہیں ملے گی''۔۔۔ ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ نے کہا۔۔۔ ''وہ پھینک دی تھی اور بھنگی کوڑے کرکٹ میں لے گیا تھا''۔

میں نے اسی وقت ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ تھانے کے بھنگی کو بلا لائے۔

''میں پورا بیان دے دوں گا''۔۔۔ جگن ناتھ نے ایسے لہجے میں کہا جس لہجے میں ہارا ہوا جواری بولا کرتا ہے''۔۔۔ آپ میرے بچوں پر رحم کریں اور مجھے سلطانی گواہ بنا لیں''۔

''وہ تو میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''بیان پورا دو اور

شہادت اور ثبوت بھی ساتھ دو''۔

اس نے پورا بیان دے دیا جو ہم نے اسے دفتر میں بٹھا کر قلمبند کیا تھا۔ اس کا بیان سنانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے انہی باتوں کی اور ہمارے شکوک کی تصدیق کی جو میں پہلے ہی سنا چکا ہوں۔ مختصر یہ کہ اس نے تصدیق کر دی کہ سب انسپکٹر رائے برمن نے تھانے کے علاقے کو اپنی ریاست بنا رکھا تھا اور اس نے تمام سٹاف کو رشوت خوری اور من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔

میں آپ کو اپنی تفتیشی کہانیوں میں یہ بتاتا رہتا ہوں کہ انگریزوں کے زمانے میں تھانے دار من مانی اور رشوت خوری نہیں کر سکتے تھے پھر بھی کوئی تھانیدار غلط حرکتوں پر اتر ہی آتا تھا لیکن ایک نہ ایک روز وہ پکڑا جاتا اور اسے جرم ثابت ہونے پر اس کی انتہائی سزا ملتی تھی۔ من مانی کرنے والا تھانیدار بہت ہی ڈھیٹ ہوتا تھا اور اسے غیرت کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی یا اس کا اوپر تک اثر و رسوخ ہوتا تھا۔ رائے برمن کو دونوں فائدے حاصل تھے۔ شراب اور جوئے کی اسے ایسی لت پڑی تھی کہ وہ عزت اور آبرو سے دستبردار ہو گیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ کچھ جاگیر انگریزوں کی دی ہوئی تھی۔ اس کے باپ نے انگریزوں کو جنگِ عظیم کے دوران وار فنڈ میں چندہ بھی دیا تھا۔ وار فنڈ میں چندہ دینے والوں کو انگریز بہت عزیز رکھتے تھے لیکن انگریز کو اپنا قانون بھی بہت پیارا تھا۔

اس ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے، معطل شدہ اے ایس آئی نے اور سب انسپکٹر رائے برمن نے سیٹھ پیارے لال سے رشوت لی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سیٹھ پیارے لال کو جیرے پر پختہ شک تھا لیکن وہ کوئی ثبوت یا شہادت نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے جب رشوت دے دی تو رائے برمن نے کہا کہ جیرے کو بلا کر الٹا لٹکاتے ہیں، شاید وہ اقبالی ہو جائے۔ یہ سارا معاملہ ابھی شک میں تھا۔ رائے برمن نے رات کو دیر سے جیرے کو تھانے بلایا۔ معطل شدہ اے ایس آئی اور یہ ہیڈ کانسٹیبل رائے برمن کے خاص آدمی تھے اس لیے انہیں اس نے اپنے ساتھ رکھا۔

جگن ناتھ نے اس ایذا رسانی کی تفصیل بیان کی جو جیرے پر آزمائی گئی تھی پھر اس نے بیان کیا کہ اس کے پاؤں رسی سے باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ اسے جگن ناتھ نے اٹھا کر اوپر کیا تھا اور رسی اے ایس آئی نے کھینچی تھی۔ اسے پانچ فٹ سے ذرا زیادہ بلندی پر لے

گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے جیرے کو چھوڑ دیا ادھر رسی کا دوسرا سرا اے ایس آئی نے کھڑکی کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیا اور بالے میں سے کنڈا نکل گیا۔ میرے پوچھنے پر جگن ناتھ نے بتایا کہ کنڈا دس بارہ منٹ بعد نکلا تھا۔

انہوں نے جیرے کو دیکھا۔ وہ سر سے ننگا تھا۔ دماغ کو بڑی سخت چوٹ آئی تھی اس لیے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ان تینوں نے باری باری اس کی نبضیں دیکھیں جو آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی تھیں آخر رک ہی گئیں۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ لاش کو کہاں چھپایا جائے۔ یہ تینوں اس مسئلے پر بحث مباحثہ کرنے لگے تینوں اس بات پر متفق تھے کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے کہ یہ واردات ہوئی ہے۔ لاش اٹھوانے کے لیے کانسٹیبلوں کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ان کے قابل اعتماد کانسٹیبل موجود تھے لیکن یہ معاملہ بڑا سنگین تھا کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ خود ہیڈ کانسٹیبل جو اس واردات کا ایک مجرم تھا تمام پردے چاک کر رہا تھا حالانکہ رائے برمن نے اسے بہت عیش کرائی تھی۔

اس ہیڈ کانسٹیبل نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ آدھی رات کے وقت ہیڈ کانسٹیبل نے لاش اپنے کندھے پر ڈالی۔ اے ایس آئی اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہیڈ کانسٹیبل کہیں رک کر چھپ جاتا اور اے ایس آئی آگے جا کر اِدھر اُدھر دیکھتا اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہتا کہ آگے آ جائے۔ راستے میں اے ایس آئی نے بھی لاش اٹھائی۔ تھانہ قصبے سے ذرا باہر ہی تھا۔ انہیں قصبے میں سے نہ گزرنا پڑا۔ تھانے سے تھوڑی ہی دور ایک گھاٹی اترتی تھی اور آگے کٹا پھٹا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل لاش کو قصبے سے دور پھینک آئے۔

ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ نے اس کانسٹیبل کا بھی نام بتایا جو جیرے کو گھر سے بلانے گیا تھا۔ میں نے اس کانسٹیبل کو اس واردات کے ملزموں کی فہرست میں شامل کر لیا، کیونکہ میں نے پہلے روز تھانے کے تمام افراد کو اکٹھا کر کے پوچھا تھا کہ اس رات جیرے کو تھانے بلایا گیا تھا یا نہیں۔ سب نے کہا تھا کہ انہیں معلوم نہیں۔ ان میں یہ کانسٹیبل بھی شامل تھا۔

''میں آپ کو ایک اور بات بھی بتا دینا چاہتا ہوں'' — جگن ناتھ نے کہا — ''مجھے شک ہے کہ رہزنی میں جیرے کا ہاتھ تھا''۔

''یہ شک تمہارے دل میں کیوں پیدا ہوا؟'' — میں نے پوچھا۔

''جیرے کی لاش برآمد ہوئی اور ہم نے پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دی'' — اس نے کہا — ''رائے برمن نے دکھاوے کی تفتیش شروع کر دی۔ جیرے کے باپ کی اس نے بہت بے عزتی کی کیونکہ اس نے کہہ دیا تھا کہ جیرا تھانے میں پولیس تشدد سے مرا ہے۔ پھر جیرے کی بیوی کو اس نے بلایا اور اسے بہت دیر اپنے ساتھ رکھا۔ میں نے رائے برمن سے پوچھا تھا کہ اس لڑکی کا رویہ کیا تھا۔ رائے برمن کے الفاظ یہ تھے کہ چڑیا پھنس گئی ہے۔ اس کے ساتھ سودا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد لائنوں میں بھی (پولیس لائنز میں) معطلی کے دوران بھی میں نے رائے برمن سے پوچھا تھا کہ یہ لڑکی کیا بیان دے گی۔ رائے برمن نے کہا تھا کہ تم اس کی طرف سے بے غم ہو جاؤ۔ مال اس کے پیٹ میں ہے..... میں نے رائے برمن سے اور اے ایس آئی مہندر (معطل شدہ اے ایس آئی) سے بھی پوچھا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ مال اس کے پیٹ میں ہے؟ مہندر نے ہنس کر کہا تھا کہ رائے برمن کو تم نہیں جانتے کہ کتنا گہرا آدمی ہے؟ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اس کا (رائے برمن کا) باپ ہمیں بچانے کے لیے گورنر تک پہنچ رہا ہے''۔

''جیرے کی بیوی کو معطل ہونے سے پہلے رائے برمن نے پھر بھی کبھی بلایا تھا؟'' — میں نے پوچھا۔

''ایک روز اپنے گھر بلایا تھا'' — اس نے جواب دیا — ''ہو سکتا ہے ایک دو بار اور بھی بلایا ہو''۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' — میں نے پوچھا — ''تم تجربہ کار ہیڈ کانسٹیبل ہو''۔

''آپ مجھ سے زیادہ عقل رکھتے ہیں'' — اس نے جواب دیا — ''میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ چڑیا پھنس گئی تھی۔ رائے برمن نے اسے مال کھلایا ہو گا کہ وہ ایسا بیان نہ دے کہ اس کے خاوند کو تھانے بلایا گیا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ پولیس کپتان کو اس نے یہی بیان دیا تھا کہ اس کے خاوند کو تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔ غریبوں کی لڑکی ایک تو چند روپے دیکھ کر خوش ہو گئی ہو گی۔ پولیس کا خوف بھی دل پر سوار ہو گا اور تھانیدار کی دوستی نے بھی اس کا دماغ پھیر دیا ہو گا۔ میں تو یہی سمجھا ہوں جناب!''

تھانیدار، جینا اور دو ریشمی جوڑے

اس ہیڈ کانسٹیبل نے مجسٹریٹ کے سامنے جا کر بھی اپنا اقبالی بیان قلمبند کرایا۔ میں نے اس کے ساتھ پکا وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمارا سلطانی گواہ ہوگا۔ مجھے امید تھی کہ ڈی ایس پی میرا یہ فیصلہ مان لے گا، لیکن وہ اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے میرا فیصلہ رد کر دیا۔ میں نے اسے اپنی تمام کارگزاری اور تفتیش اسی طرح سنائی تھی جس طرح آپ کو سنائی ہے۔ یہ سن کر تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے مجھے داد بھی دی لیکن وہ ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ کو معاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''سب انسپکٹر خان!''— اس نے مجھے کہا— ''یہ ہیڈ کانسٹیبل ایک آدمی کا قاتل ہے۔ یہ مت دیکھو کہ مقتول غریب آدمی تھا یا امیر۔ تمہارے پاس شہادت آ گئی ہے۔ اگر تم ٹھیک سے مقدمہ قائم کرنا جانتے ہو تو ہمیں سلطانی گواہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک قاتل کو ہم کس طرح معاف کر سکتے ہیں؟''

اس انگریز ڈی ایس پی کی یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں خود بھی کسی کو سلطانی گواہ بنانے کے حق میں نہیں ہوا کرتا تھا۔ آپ خود ہی سوچیں کہ ایک آدمی اپنی زبان سے اقرار کر رہا ہے کہ وہ فلاں جرم میں شامل تھا یا جرم میں برابر کا شریک تھا۔ قانون انگریزوں کا ہو یا مسلمانوں کا اپنا اسلامی قانون ہو، کوئی قانون مجرم کو معاف نہیں کیا کرتا۔ مجھے خطرہ صرف یہ نظر آ رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل سیشن کورٹ میں جا کر اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے گا۔ اس کے لیے میں نے یہ پیش بندی کرنی تھی کہ شہادت مضبوط ہوتی۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اقبالی بیان زیر دفعہ 164 دے دیا تو میں نے اسے جھوٹا وعدہ دے دیا کہ وہ سلطانی گواہ ہے۔ بیان لینے والے مجسٹریٹ نے اسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا۔

میں نے تھانے کی صفائی کرنے والے بھنگی کو بلوایا تھا۔ اس سے پوچھا کہ پچھلے کمرے میں ایک موٹی رسی چھت کے ساتھ لٹکی رہتی تھی وہ اس نے دیکھی ہوگی۔

''کیا تم جانتے ہو وہ رسی کہاں ہے؟''— میں نے پوچھا۔

''سرکار کے بچے جئیں''— بھنگی نے بھنگیوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر خوشامدانہ لہجے

میں جواب دیا— ''وہ رسی موجود ہے، میں نے ایک ماشکی کو دے دی تھی''۔

''پوری بات سناؤ''— میں نے اسے کہا— ''یہ رسی تمہیں کہاں سے ملی تھی؟..... اور یہ بھی بتاؤ کہ یہ رسی تم نے پہلے کبھی دیکھی تھی؟''

''ہاں، مائی باپ!''— اس نے جواب دیا— ''یہ رسی پچھلے کمرے میں چھت کے ساتھ لٹکی رہتی تھی مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہاں سے کب اتاری گئی۔ کچھ دنوں کی بات ہے کہ تھانے کے احاطے کے باہر کوڑے کا ڈرم پڑا رہتا ہے۔ میں تھانے میں جھاڑو دے کر کوڑا ڈرم میں پھینکنے گیا تو دیکھا کہ رسی کوڑے میں پڑی ہوئی تھی۔ رسی نہیں سرکار! یہ تو رسہ ہے۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور گھر لے گیا۔ ایک مسلمان ماشکی جو لوگوں کے گھروں میں پانی ڈالتا ہے، مجھے راستے میں مل گیا اور اس نے یہ رسہ میرے ہاتھ میں دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کا کیا کرو گے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کا کیا کرنا ہے، اگر یہ تمہارے کام آ سکتا ہے تو تم لے لو اور کچھ پیسے دے دو۔ اس نے مجھے آٹھ آنے دیے اور میں نے رسہ اسے دے دیا۔ اس نے یہ اپنے چمڑے کے ڈول میں ڈال لیا''۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر ماشکی رسے سمیت میرے پاس پہنچ گیا۔ اس طرح رسہ بطور شہادت اور دو مزید گواہ مل گئے۔ بھنگی سے میں نے یہ بیان دلوانا تھا کہ یہ رسہ واردات والے کمرے میں چھت کے ساتھ لٹکا رہتا تھا۔ میں نے عدالت میں جمعدار سے یہ بیان دلوایا تھا کہ یہ رسہ کنڈے کے ساتھ لٹکا رہتا تھا اور اس نے دو بار دن کے وقت دو ملزموں کو اس رسے کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا دیکھا تھا۔

میں نے جیرے کی بیوی اور سیٹھ پیارے لال کو تھانے بلوایا۔ سیٹھ پہلے پہنچ گیا۔

''لالہ جی!''— میں نے اسے کہا— ''یہ بتائیں کہ آپ نے جیرے پر اتنا پکا شک کیوں کیا تھا''۔

میں اس سے یہ سوال دو تین روز پہلے بھی پوچھ چکا تھا۔ اب اس لیے پوچھا کہ وہ اپنے اسی بیان پر قائم ہے یا بیان بدلتا ہے۔

''میں نے اس روز آپ کو بتایا تھا کہ صرف جیرے کو معلوم تھا کہ میں وصولیوں کے لیے قصبے سے باہر جا رہا ہوں''— سیٹھ نے جواب دیا— ''اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے جیرے کو کہا تھا کہ ہو سکتا ہے واپس آتے آتے شام ہو جائے اس لیے وہ رانے

کنوئیں کے پاس پہنچ جائے..... اس روز آپ نے میرا پورا بیان نہیں لیا تھا۔ جیرے کا ایک سالا ہے جو بدمعاش قسم کا لڑکا ہے۔ وہ دکان میں کبھی کبھی جیرے کے ساتھ آتا تھا۔ جس شام میرے ساتھ یہ واردات ہوئی اس سے اگلے روز وہ دکان پر آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ سنا ہے آپ کل واپس آتے لوٹے گئے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے ٹھیک سنا ہے۔ اسے چاہئے یہ تھا کہ میرے ساتھ ہمدردی کرتا۔ اس کی بجائے اس نے مجھ سے اس طرح کی باتیں پوچھنی شروع کر دیں کہ آپ نے کسی پر شک لکھوایا ہے یا نہیں اور یہ بھی کہ تھانے والے کیا کہتے ہیں اور وہ کیا کارروائی کر رہے ہیں؟ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جیرا چپ چپ تھا اور کبھی وہ اپنے سالے کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لیتا اور کبھی سالا جیرے کی طرف چوروں کی طرح دیکھ لیتا..... حضور! اتنی عمر ہو گئی ہے۔ اس قسم کے اوچھے اور چھچھورے لڑکوں کے چہروں اور نظروں کو تو بھانپ سکتا ہوں۔ مجھے پکا شک ہے کہ ان دونوں نے مجھے لوٹا ہے۔ میں آج آپ کو ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں۔ ان کے محلے کے دو بڑی عمر کے مسلمانوں نے مجھے بتایا ہے کہ جیرے کی بیوی اور بیوی کا یہ بھائی اس طرح خرچ کر رہے ہیں جیسے انہیں کہیں سے دولت مل گئی ہو"۔

اس سیٹھ کے ساتھ میری اور اے ایس آئی منگل سنگھ سندھو کی بہت باتیں ہوئی تھیں جن سے ہم دونوں کے دلوں میں بھی شک پیدا ہو گیا تھا۔ اس تفتیش کے دوران میں نے اپنے خفیہ ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ جیرے کی بیوی نے کچھ قیمتی کپڑے خریدے ہیں حالانکہ یہ موقع کپڑے خریدنے کا نہیں تھا۔ وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی اور ابھی اس کے خاوند کا چالیسواں بھی نہیں ہوا تھا۔ مقتول کے سالے کے متعلق بھی مجھے ایسی ہی رپورٹیں ملی تھیں۔ وہ جوا بھی کھیلتا تھا۔ میں نے یہاں تک معلوم کر لیا تھا کہ دو تین روز پہلے اس نے جوئے میں اتنی زیادہ بازی لگائی تھی کہ دوسرے جواری کچھ حیران ہوئے تھے۔ یہی عادی جواری اور چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والے پولیس کے مخبر بھی ہوا کرتے ہیں۔

میں نے مقتول کے سالے کو بھی طلب کر لیا۔

سیٹھ کا بیان ہو چکا تو مقتول کی بیوی کو اندر بلایا جو خاصی دیر سے آئی بیٹھی تھی۔ وہ کوئی خاص خوبصورت لڑکی نہیں تھی، لیکن اس میں نوجوانی کی کشش اچھی خاصی تھی اور وہ قبول صورت تھی۔

"دیکھو جینا!"— میں نے اسے کہا— "تمہارے بھائی کو بھی میں نے تھانے بلایا ہے۔ اگر اپنے بھائی کو بچانا چاہتی ہو تو سچ بولو..... کیا تم نے کپڑے خریدے ہیں؟ اگر جھوٹ بولو گی تو میں اس دکاندار کو تمہارے سامنے کھڑا کر دوں گا جس سے تم نے کپڑے خریدے ہیں۔ کپڑے خریدنا کوئی جرم نہیں ڈرے بغیر بتا دو"۔

"جی ہاں"— اس نے کہا— "میں نے دو ریشمی جوڑے خریدے ہیں"۔

"ابھی تمہارے خاوند کا چالیسواں بھی نہیں ہوا"— میں نے کہا— "کیا تم نے دوسری شادی کے لیے یہ کپڑے خریدے ہیں؟ یہ بھی بتاؤ کہ اتنے پیسے کہاں سے لائی تھیں"۔

وہ غریبوں کی لڑکی تھی۔ اس نے اتنے پیسے کبھی دیکھے نہیں تھے۔ یہیں سے مجھے شک ہوا کہ اس کے ہاتھ میں اتنی رقم آ گئی تھی جس نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میں نے اس کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے ایک تیر چلایا:

"تمہارا خاوند کو تمہارے بھائی نے قتل کیا ہے"— میں نے جھوٹ بولا— "تمہارے خاوند قتل ہو گیا ہے اور بھائی تمہارا پھانسی چڑھے گا"۔

وہ آخر بہن تھی اور یہ اس کا اکیلا بھائی تھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ تڑپ اٹھی اور قسمیں کھانے لگی کہ اس کے خاوند کو اس کے بھائی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔

وہ قسمیں کھاتی رہی اور میں یہی کہتا رہا کہ قاتل اس کا بھائی ہے۔ وہ رو پڑی۔

"پھر یہ بتاؤ"— میں نے پوچھا— "کہ تمہارے خاوند کا قاتل کون ہے"۔

"میں کیسے بتا سکتی ہوں"— اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"تم سب کچھ بتا سکتی ہو"— میں نے دبدبے سے کہا— "تم جس تھانیدار کے پاس آتی رہی ہو اس کی تھانیداری ختم ہو چکی ہے۔ وہ اب تمہاری مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ سچ بتاؤ کہ پہلے تھانیدار کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔ تمہیں معلوم تھا کہ تمہارے خاوند کو تھانے بلایا گیا ہے"۔

میں نے اسے اتنا زیادہ ڈرایا اور ایسی باتیں کیں جو صحیح ثبوت پیش کرتی تھیں کہ غریب کی بچی سخت خوفزدہ ہو گئی اور اس نے صحیح بیان دے دیا۔ بیان مختصراً یوں تھا کہ اسے

معلوم تھا کہ جیرے کو جو بلانے آیا تھا وہ ایک کانسٹیبل تھا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ میں نے اس کانسٹیبل کو حوالات سے نکلوا کر اس کے سامنے کھڑا کیا تو اس نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ یہی آدمی جیرے کو بلانے آیا تھا۔

پھر اس نے اپنے بیان میں اس راز سے پردہ اٹھایا کہ جیرے کی لاش کی برآمدگی کے بعد رائے برمن نے اس کا بیان کے لیے بلایا تو اس نے اس لڑکی کی بہت ڈرایا اور یہ تاثر دیا کہ رہزنی کا مجرم جیرا تھا اور مال گھر میں پڑا ہے۔ رائے برمن نے لڑکی کو ڈرایا بھی، اسے لالچ بھی دیا اور اس کے ساتھ دلی محبت کا اظہار بھی کیا اور اس سے منوالیا کہ رہزنی کا سارا مال جیرے کے گھر میں پڑا ہے۔

رائے برمن نے اس لڑکی کے ساتھ یہ سودا کیا کہ وہ رہزنی کا مال اپنا مال سمجھے اور اگر تحقیقات ہو کہ اس کے خاوند کو تھانے بلایا گیا تھا یا نہیں تو وہ یہ بیان دے کہ اسے تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔

رائے برمن نے اس لڑکی کو اس لیے خرید لیا تھا کہ اس سے پہلے مقتول کا باپ رائے برمن کو کہہ چکا تھا کہ جیرے کو تھانے بلایا گیا تھا اور تھانے سے وہ زندہ نہیں نکلا۔ رائے برمن کا سودا کامیاب رہا۔ اس لڑکی نے ڈی ایس پی کو بیان دیا تھا کہ اس کے خاوند کو اس رات تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔

یہ تو مجھے پہلے ہی پتہ چل چکا تھا کہ مقتول کی بیوی اپنے بھائی کی طرح شوقین مزاج ہے۔ اسی شوقینی کے پیچھے اس نے خاوند کو ماں باپ سے الگ کرلیا تھا۔ باقی یہ میری اپنی رائے ہے کہ اس نے اپنے خاوند کو اپنی فضول خرچیوں سے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ خاوند رہزنی پر اتر آیا۔ اس لڑکی نے بتایا کہ کچھ رقم اس کے بھائی نے لے لی تھی اور جو زیورات سیٹھ پیارے لال سے چھینے گئے تھے وہ اس لڑکی نے اپنے گھر زمین میں دبا دیے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ کبھی ضلعے کے شہر میں جا کر بیچ آئیں گے۔

اس کے بعد اس کے بھائی کو بلایا۔ وہ چونکہ مجرم تھا اس لیے اس کا خوفزدہ ہونا قدرتی امر تھا۔ میں نے اس کے آگے شہادت رکھ دی۔ پہلے تو اس نے انکار کیا، لیکن میں اور منگل سنگھ اقرار کرانا جانتے تھے۔ یہ اوچھا سا لڑکا تھوڑی دیر میں اقبالی بیان دینے پر راضی ہو گیا۔ اس کے بیان کا اہم پہلو یہی تھا کہ جیرے نے اسے بتایا تھا کہ اس کا سیٹھ آج شام کو

مال لا رہا ہے۔ اس کے سالے نے کہا کہ چلو آج شکار مارتے ہیں۔ دونوں نے اسی طرح شکار مار لیا جس طرح سیٹھ مجھے سنا چکا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور انہوں نے بڑی خوشی خوشی اس لڑکی کو اس راز میں شریک کرلیا۔ اتنی زیادہ رقم ان کے ہاتھ میں پہلی بار آئی تھی۔ جیرے کی بیوی بہت خوش ہوئی اور وہ سمجھے مال ہضم ہو گیا ہے۔

میں دونوں بہن بھائی کو اس مکان میں لے گیا جو جیرے نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ دو گواہوں کے سامنے جیرے کی بیوی نے زیورات کی نشاندہی کی اور خود ہی کھود کر کپڑے کی پوٹلی نکال دی اور گواہوں کے سامنے بیان دیا کہ یہ زیوارت اس گھر میں کس طرح آئے تھے اور کس طرح زمین میں دبائے گئے۔

جیرے کی بیوی اور سالے نے کچھ بچی کھچی رقم بھی برآمد کرا دی اور اس لڑکے نے اقبالی بھی دے دیا۔

اللہ نے مجھ پر کرم کیا کہ دونوں وارداتوں کی تفتیش کامیابی سے مکمل ہو گئی۔ رائے برمن، اے ایس آئی مہندر اور ہیڈ کانسٹیبل جگن ناتھ کے خلاف قتل کا مقدمہ زیر دفعہ 302 بنایا گیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق ہیڈ کانسٹیبل سیشن کورٹ میں جا کر اپنے بیان سے منحرف ہو گیا تھا، لیکن شہادت مکمل تھی۔ تینوں کو سزائے عمر قید دی گئی جو اپیلوں کے بعد بھی برقرار رہی۔ رائے برمن کے جاگیردار باپ کا اثر و رسوخ بھی کام نہ آیا نہ اس کی دولت اور جاگیر اس کے بیٹے کو بچا سکی۔

جیرے کی بیوی کو ایک سال اور اس کے بھائی کو دو سال سزائے قید دی گئی اور جو کانسٹیبل جیرے کو تھانے لانے کے لیے گیا تھا اسے محکمانہ کارروائی میں سروس سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔

اس جینے سے موت اچھی

اغوا اور قتل کی یہ واردات ہندوستان کے ہندو ٹھاکروں کے علاقے کی ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں کو جو ہندوؤں کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے، بتا رہا ہوں کہ ہندوؤں کی اکثریت تجارت پیشہ ہے اسی لیے انہیں ہندو بنئے کہا جاتا ہے ان میں ایک نسل ان ہندوؤں کی بھی ہے جو زراعت پیشہ ہیں اور کاشتکار کہلاتے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی بڑے زمیندار اور جاگیردار ہیں جیسے پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی عادتیں اور خصلتیں تجارت پیشہ ہندوؤں سے بہت مختلف ہیں۔ ان کی متعدد ذاتیں ہیں، زیادہ تر راجپوت ہیں۔ عام طور پر ہندو بزدل، عیار اور مکار ہوتے ہیں لیکن زراعت پیشہ ہندوؤں میں دلیری اور صحیح مردانگی پائی جاتی ہے۔ ان میں جو بڑے زمیندار اور ان سے بڑے جاگیردار ہیں، وہ شراب بھی پیتے ہیں، گوشت بھی کھاتے ہیں اور آپس میں اسی طرح لڑائی مار کٹائی اور قتل و غارت کرتے رہتے ہیں جس طرح ہمارے دیہاتی علاقوں میں ہوتا ہے۔ بڑے زمیندار اور جاگیردار ٹھاکر کہلاتے ہیں۔

انگریز اپنے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو مسلح افواج میں بھرتی نہیں کیا کرتے تھے۔ فوجی بھرتی کے لئے دو تین علاقوں کے زراعت پیشہ ہندوؤں کو فٹ قرار دیا گیا تھا' مثلاً روہتک' حصار' کرنال اور راجپوتانہ کا علاقہ ـــــ ان علاقوں کے ہندوؤں کو جنگجو قرار دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا کردار جنگجو قوموں جیسا تھا۔ یہ بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور اب بھی ہیں۔

ہندوؤں کا ذکر آیا ہے تو بے شمار باتیں ذہن میں آ گئی ہیں۔ کچھ تو بڑی ہی دلچسپ اور مضحکہ خیز ہیں لیکن اس قصے کو میں یہیں تک رہنے دیتا ہوں۔ آپ کو مزید بور نہ کروں تو بہتر ہے۔ آیئے' آپ کو ایک واردات اور اس کی تفتیش سناتا ہوں۔

نگر ہری کشن اس علاقے کا ایک قصبہ تھا۔ یہ تمام علاقہ بڑا ہی زرخیز تھا۔ دیہاتی علاقوں کا اناج نگر ہری کشن کی منڈی میں آتا اور وہاں سے دوسرے علاقوں کو جاتا تھا۔ اس طرح یہ قصبہ خاصی بڑی تجارتی منڈی تھی۔ وہاں کے چھوٹے چھوٹے کسان بھی خوش حال تھے۔ بڑے زمینداروں اور وڈیروں کے بیٹوں کی طرح ان ہندو زمینداروں کے بیٹے بھی اپنے آپ کو شہزادے اور قانون سے بالا سمجھتے تھے۔ میں اس قصبے کے تھانے کا ایس ایچ او تھا۔ اردگرد کے دیہات کا خاصا وسیع علاقہ میرے تھانے میں شامل تھا۔

ایک صبح ساڑھے نو دس بجے کے درمیان قصبے سے دو اڑھائی میل دور کے ایک گاؤں کا ایک ٹھاکر تین چار آدمیوں کے ساتھ تھانے میں آیا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ صدمہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس کے گھر کا کوئی فرد قتل ہو گیا ہے یا اس کے گھر کی کوئی عورت لاپتہ ہو گئی ہے۔

''ٹھاکر جی کا جوان بیٹا قتل ہو گیا ہے''ـــ ایک آدمی نے ٹھاکر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

تھانے میں اس قسم کی رپورٹ آتی ہے تو واردات سنتے ہی تھانیدار کی زبان آٹومیٹک طریقے سے چل پڑتی ہے۔ بغیر سوچے تھانیدار کی زبان سے سوال نکلنے لگتے ہیں، مثلاً کب؟ کیسے؟ کہاں؟ کسی کے ساتھ دشمنی؟ کلہاڑی چھری وغیرہ استعمال ہوئی یا گلا گھونٹا گیا یا زہر دیا گیا؟ وغیرہ..... میں نے بھی ٹھاکر پر سوالوں کی قطار لگا دی۔ مجھے جو جواب ملے ان سے یہ کہانی بنی کہ یہ ٹھاکر خاصا بڑا زمیندار تھا اور اس کی اراضی گاؤں سے تقریباً ایک میل دور سے شروع ہوتی تھی اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس ٹھاکر کی تین بیٹیاں تھیں اور بیٹا یہی ایک تھا جو قتل ہو گیا تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال بتائی گئی۔ شادی شدہ تھا اور ایک بچہ بھی تھا۔ بچے کی عمر ابھی دو یا تین مہینے تھی۔ مقتول بیٹے کا نام جگ جیون رام تھا جسے ماں باپ نے ضرورت سے کہیں زیادہ لاڈ اور پیار سے پالا تھا۔ اکلوتا بیٹا تو ہوتا ہی شہزادہ ہے۔ ان کی جو اراضی تھی، اس میں جگ جیون رام نے بڑا خوبصورت چھوٹا سا ایک مکان بنا رکھا تھا۔ وہ کچھ دن اس مکان میں رہتا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں رہ رہا تھا۔ چند دن پہلے اس نے کچھ دن اس مکان میں گزارے تھے۔ وہاں جب وہ رہتا تھا تو اس کی راتیں بھی وہیں گزرتی تھیں لیکن اب وہ اپنے گھر میں تھا۔

قتل کھیتوں والے مکان میں ہوا۔

یہ تو ایف آئی آر تحریر کرنے کے لئے کچھ ضروری باتیں پوچھی تھیں۔ اصل بیان بعد میں لینے تھے۔ میں نے کچھ اور ضروری باتیں پوچھیں اور ایف آئی آر تحریر کی اور ان کے ساتھ جائے وقوعہ پر چلا گیا۔

مجھے اب یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے کہ میں جائے وقوعہ پر گیا تو میرے ساتھ اپنے سٹاف کے کتنے آدمی تھے اور میں کس طرح وہاں تک پہنچا۔ آپ میری بے شمار کہانیاں پڑھ چکے ہیں جن سے آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کس طرح اور کیسے لوازمات کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچا ہوں گا۔ ویسے بھی آپ کو اصل واردات اور تفتیش کی تفصیلات اور اس کے نتیجے کے ساتھ دلچسپی ہونی چاہئے..... اب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ میں ٹھاکر کے کھیتوں میں اس مکان میں پہنچ گیا جہاں مقتول کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ جگہ قصبے سے دو اڑھائی میل دور تھی اور ہم سب وہاں تک دو یکوں میں پہنچے تھے۔

دوپٹہ موت کا پھندہ بن گیا

وہ واقعی چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا۔ دو کمرے تھے، برآمدہ تھا، آگے چھوٹا سا صحن تھا اور صحن کی چھوٹی سی دیوار تھی۔ مجھے اس کمرے میں لے جایا گیا جس میں لاش پڑی ہوئی تھی۔

لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی اور ٹانگیں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ دائیں ٹانگ بہت باہر کی طرف اور بائیں ٹانگ ذرا کم باہر کی طرف ہو کر گھٹنے سے مڑی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی چیز یہ دیکھی کہ لاش کے گلے میں یعنی گردن کے گرد دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔ لاش کا منہ بھی کھلا ہوا اور آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ اسے دوپٹے سے پھانسی دی گئی ہے۔ اگر دوپٹہ چھت کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا اور لاش اس کے ساتھ لٹک رہی ہوتی تو شک کیا جاتا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے لیکن وہاں تو شک والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہ قتل کا کیس تھا۔

میں نے لاش کو ایک کروٹ پر کروایا۔ یہ کام میرے ساتھ آئے ہوئے دو کانسٹیبلوں نے کیا تھا۔ میں دوپٹہ پیچھے کی طرف سے دیکھنا چاہتا تھا۔ گردن کے پیچھے دوپٹے کی گانٹھ

ہونی چاہئے تھی جو نہیں تھی۔ اس کی بجائے دوپٹہ رسے کی طرح مروڑا ہوا تھا۔ اس سے میں طریقہ واردات سمجھ گیا جو یہ تھا کہ دوپٹہ پیچھے سے مقتول کے گلے میں ڈالا گیا اور گردن کے پیچھے سے مروڑا گیا اور مقتول کا سانس رک گیا۔

یہ سلیٹی رنگ کا وائل کا دوپٹہ تھا۔ درمیان سے دوپٹہ مقتول کے گلے میں ڈالا گیا تھا، باقی فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے دوپٹہ مقتول کے گلے سے الگ کیا کیونکہ اسے قبضے میں لینا اور کورٹ میں پیش کرنا تھا۔ جب میں فرش سے دوپٹہ اٹھا رہا تھا تو دوپٹے کے نیچے فرش پر ایک بندا پڑا ہوا تھا۔ اسے ٹاپس کہوں تو شاید زیادہ ٹھیک ہوگا۔ یہ کان کے سوراخ میں لٹکانے والا ٹاپس نہیں تھا بلکہ اس کا ذرا لمبوترا کلپ سا تھا جو کان کے نیچے والے حصے کو پکڑ لیتا اور ٹاپس ٹھکانے پر رہتا تھا۔ یہ کوئی عجیب چیز نہیں تھی، آپ نے ایسے ٹاپس اکثر دیکھے ہوں گے۔ یہاں ایک ہی کان کا ٹاپس تھا اور اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ سونے کا تھا۔ میں نے یہ اٹھا لیا کیونکہ یہ بھی ایگزبٹ کے طور پر کورٹ میں پیش کرنا تھا اور اس ٹاپس نے مجھے تفتیش میں بھی مدد دینی تھی۔

کرسیوں کے ساتھ ایک تپائی پڑی تھی۔ اس پر شراب کی بوتل اور تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس واردات میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس عورت نے مقتول کو قتل کیا یا اس عورت نے قتل کی واردات میں مدد دی، البتہ یہ ثابت تھا کہ قتل کے وقت اس کمرے میں ایک عورت موجود تھی اور میرا قیاس تھا کہ قتل کا باعث یہی عورت تھی۔

عورت وہاں سے جا چکی تھی اور اس کا کوئی سراغ نہیں تھا سوائے ایک ٹاپس اور دوپٹے کے۔ یہ دونوں چیزیں تھیں جو عورتیں عام طور پر استعمال کرتی تھیں۔ کمرے میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر بڑا خوبصورت پلنگ پوش تھا۔ میں نے اسے خاص طور پر اور ایک خاص خیال کے مطابق دیکھا لیکن مجھے وہ اشارہ نہ ملا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ پلنگ پوش یعنی پلنگ پر بچھی ہوئی چادر پر ایسی سلوٹیں نہیں تھیں جن سے یہ کہا جا سکتا کہ اس پلنگ پر کوئی لیٹا ہے اور اس پر دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ پلنگ سے ذرا ہٹ کر دیوار کے قریب تین اچھی قسم کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اگر اس کمرے میں کوئی بیٹھا تھا تو وہ پلنگ کی

بجائے کرسی پر بیٹھا ہوگا۔

اس کمرے میں گھوم پھر کر دیکھا۔ پلنگ کے نیچے بھی جھانکا اور فرش پر نظریں دوڑائیں، شاید کوئی اور سراغ یا اشارہ مل جائے مگر کچھ نہ ملا۔ دوسرے کمرے میں گیا اور وہاں بھی بڑی گہری نظروں سے سارے کمرے کا گھوم پھر کر معائنہ کیا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

اس مکان سے تقریباً چالیس قدم دور ایک کچا مکان تھا جس کا ایک کمرہ رہائشی تھا اور اس سے ملحق بڑا کمرہ تھا جو مویشیوں کے لیے تھا اور اس میں کچھ بھوسہ بھی رکھا تھا اور زراعت کا مختلف قسم کا سامان بھی۔ مجھے بتایا گیا کہ رات کو ایک مزارعہ اس کچے مکان میں رہتا ہے اور ایک کتا بھی ہوتا ہے جو رات کو کھلا رہتا ہے۔

واردات کی رات اتفاق سے وہاں دو مزارعے سوئے تھے۔ مجھے جب یہ پتہ چلا کہ ایک مزارعہ یہاں ہوتا ہے اور گذشتہ رات وہاں دو تھے تو میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ رات کو وہاں رہنے والے مزارعہ نے بتایا کہ یہ اس کا رشتہ دار بھی ہے اور دوست بھی۔ شام کے بعد اس کے پاس آیا تھا اور دونوں تاش کھیلتے رہے پھر گپیں ہانکتے رہے اور پھر دوسرا مزارعہ بھی یہیں رک گیا اور سو گیا۔

ان دونوں مکانوں کے درمیان کشادہ جگہ تھی اور کچھ درخت بھی تھے۔ مویشیوں کے لیے ایک کھرلی بھی بنی ہوئی تھی۔ تین چار چارپائیاں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ بیٹھنے اور ستانے کے لیے بڑی اچھی تھی۔

میں نے پہلے اس مزارعہ کو اپنے پاس الگ بٹھایا جو روزانہ رات وہاں رہتا تھا۔ اس سے پوچھا کہ رات کو مقتول کس وقت یہاں آیا تھا یا یہاں تھا اور شام کے بعد کہیں نکلا ہی نہیں؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ مقتول ان دنوں اس مکان میں نہیں رہتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ نہیں رہتا تھا تو پھر یہاں کب اور کیوں آیا؟

مزارعہ نے بتایا کہ شاید آدھی رات کا وقت ہوگا جب کتا اس طرح بھونکا جیسے اس نے کسی آدمی کو قریب آتے دیکھا ہو۔ دونوں مزارعوں کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں گھوڑے کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو ان کے قریب آ کر رک گئیں۔ دونوں مزارعے باہر نکلے۔ اگر تانگہ آیا تھا تو انہیں یقین تھا کہ یہ چھوٹے ٹھاکر جی ہوں گے یعنی مقتول۔

تانگہ پکے مکان کے دروازے پر رکا تو دونوں مزارعے اٹھ کر ادھر آنے لگے لیکن مقتول نے انہیں کہا کہ تم سو جاؤ، تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔

دونوں واپس اپنے کچے مکان میں چلے گئے۔ ابھی وہ چارپائیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ مقتول نے وہاں مستقل طور پر رہنے والے مزارعہ کو آواز دے کر کہا کہ تانگہ کھول دو اور گھوڑے کو اندر باندھ دو۔ دونوں مزارعے دوڑے آئے۔ ایک نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور تانگہ گھما کر مویشیوں والے کمرے کے سامنے جا روکا۔

پھر اس مزارعہ نے بیان دیا کہ گھوڑے کو اندر باندھ کر اس کے آگے چارہ پھینکا اور دونوں اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ وہ حسب معمول صبح اس وقت جاگ اٹھے جب صبح ابھی دھندلی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ مقتول اپنے مکان میں ہے۔ اسے جانا ہوتا تو تانگہ لے کر جاتا۔ دوسرا مزارعہ جو رات ویسے ہی یہاں رک گیا تھا، چلا گیا اور وہاں رہنے والا مزارعہ وہیں رہا۔ اسے چھوٹے ٹھاکر کی حاضری میں موجود رہنا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس وقت جاگ اٹھے اور بلا لے۔

سورج نکل آیا تو بھی مقتول نہ جاگا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مزارعہ اندر چلا جاتا اور اسے جگا دیتا۔ دیہات میں اتنی دیر تک سونے کا رواج ہی نہیں تھا۔ لوگوں کے کام کاج ہی ایسے تھے لیکن وہ بڑے امیر ٹھاکر کا لاڈلا بیٹا تھا اس لئے مزارعہ نے اس کے مکان میں قدم رکھنے کی بھی جرأت نہ کی۔

اتنے میں مقتول کا باپ یعنی یہ ٹھاکر آ گیا جو میرے پاس تھانے آیا تھا۔ مزارعہ نے اپنے بیان میں کہا کہ ٹھاکر کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے مزارعہ سے پوچھا — ''کیا جگی رات یہاں آ گیا تھا؟'' — مقتول کا نام جگ جیون رام تھا۔ گھر میں اور گاؤں میں اسے جگی کہتے تھے۔ مزارعہ نے اسے بتایا کہ اس کا جگی اندر سویا ہوا ہے۔

باپ اندر چلا گیا۔ مزارعہ باہر دروازے میں کھڑا رہا۔ دو تین منٹ بعد مزارعہ کو اندر سے ٹھاکر کی سخت گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس نے مزارعہ کو پکارا تھا لیکن یہ عام قسم کی پکار یا اس کی عام آواز نہیں تھی۔ ادھر سے مزارعہ اندر کو دوڑا، ادھر سے ٹھاکر دوڑتا ہوا باہر کو نکلا۔

''اوئے، میری تو دنیا ہی لٹی پڑی ہے'' — ٹھاکر نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ

مارتے ہوئے کہا۔

مزارعہ نے بیان میں کہا کہ وہ اندر گیا تو ٹھاکر کے بیٹے کی لاش کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور مکان کے دونوں کمروں میں کوئی اور آدمی نہیں تھا۔

بدی میں ڈوبا ہوا شہزادہ

مزارعہ بیان دے چکا تو میں نے اس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ پہلی یہ کہ تانگے میں وہ اکیلا آیا تھا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ مزارعہ نے بتایا کہ جب تانگہ آیا تو وہ اور اس کا دوست جاگ کر ادھر چلے تو دور سے ہی انہیں مقتول نے کہا کہ تم سو جاؤ، تمہاری ضرورت نہیں لیکن دونوں مزارعے جب اپنے کچے مکان میں گئے تو مقتول نے انہیں پکارا اور کہا کہ تانگہ کھول دو اور گھوڑے کو اندر باندھ دو۔

دونوں مزارعے تانگے تک گئے۔ رات کا اندھیرا تھا اس لئے وہ دونوں صرف اتنا دیکھ سکے کہ مقتول کے ساتھ دو اور آدمی تھے لیکن ان کی پہچان ممکن نہیں تھی۔ مزارعے جب دوڑتے ہوئے گئے کہ تانگہ وہاں سے لے جا کر گھوڑا اس سے الگ کر دیں، اس وقت مقتول ان آدمیوں کے ساتھ دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس وقت ان دونوں مزارعوں نے دیکھا کہ مقتول کے ساتھ آدمی ایک ہی تھا اور دوسری کوئی عورت تھی۔ وہ اندر نہیں جا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ مزارعوں کو دیکھ کر مقتول اور اس کے ساتھی نے لڑکی یا عورت کو اندر کو دھکیلا اور بڑی جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

اس کے بعد میں نے اس مزارعہ کا بیان لیا جو اس رات وہاں سویا تھا۔ اسے بھی میں نے بلوا لیا تھا۔ تفتیش ذرا ذرا سے بھی شک پر کی جاتی ہے۔ اس مزارعہ پر یا دونوں پر مجھے بجا طور پر شک تھا کہ یہ دونوں بھی اس واردات میں شامل ہوں گے..... دوسرے مزارعہ نے بھی تقریباً وہی بیان دیا جو پہلے مزارعہ نے دیا تھا۔ اس نے بھی کہا کہ مقتول کے ساتھ ایک آدمی اور ایک عورت تھی جسے زبردستی تانگے سے اتار کر اندر لے جایا گیا تھا۔

اس مزارعہ پر خاصی جرح کر کے میں نے پھر اس مزارعہ کو اپنے پاس بٹھایا جو روزانہ رات وہاں رہتا تھا۔ اب میرا دماغ اس بات پر اٹک گیا تھا کہ اس عورت کو یہاں زبردستی لایا گیا تھا۔ مقتول کے کمرے میں شراب کی بوتل اور گلاس بھی پڑے ہوئے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول یہاں عیش و عشرت کے لیے آیا تھا اور اس عورت کو اسی مقصد کے لیے یہاں لایا تھا۔

میں نے اس مزارعہ کو ڈرایا اور کہا کہ دیکھ لو، ٹھاکر کا بیٹا قتل ہو گیا ہے اور تم دونوں مزارعوں کے سوا یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ پہلا شک تم دونوں پر آتا ہے۔ صحیح بیان دینا ورنہ رگڑے جاؤ گے۔ اس طرح اس کے ساتھ کچھ اور باتیں کیں جن میں کچھ دھمکیاں بھی تھیں اور کچھ دوستی اور شفقت بھی شامل کر لی تھی۔ آپ نے پاکستان کے دیہات میں دیکھا ہو گا کہ ان بے چارے مزارعین کی حیثیت بڑے بڑے زمینداروں نے مویشیوں کے برابر کر رکھی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ رہتا ہے کہ مویشی حیوان اور مزارعے انسان ہوتے ہیں۔ یہ مزارعہ بھی روایتی مزارعین کی قبیل میں سے تھا لیکن ذرا سا فرق یہ تھا کہ عقل والا معلوم ہوتا تھا اور بات پوری خود اعتمادی کے ساتھ کرتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ وہ کسی بات کو پردے میں نہیں رہنے دے گا لیکن میں اس پر پردہ ڈالے رکھوں ورنہ ٹھاکر جی کو پتہ چلا کہ اس نے ان کے بیٹے کی عادتیں اور خصلتیں تھانیدار کو بتا دی ہیں تو وہ اسے جان سے ہی مروا دیں گے۔ یہ درخواست میرے لئے کوئی نئی نہیں تھی۔ میں ایسے کئی نوکروں اور مزارعین سے تفتیش کر چکا تھا اور ان میں سے ہر ایک نے یہی درخواست کی تھی کہ میں اس کے بیان کو خفیہ رکھوں۔ اس مزارعہ کے ساتھ بھی میں نے یہی وعدہ کیا۔ یہ نہ بتایا کہ اسے یہی بیان کورٹ میں بھی دینا پڑے گا۔

اس نے جو باتیں بتائیں اور میرے سوالوں کے جو جواب دیئے، ان سے یہ صورتِ حال سامنے آئی کہ یہ مزارعہ مقتول کا قابلِ اعتماد آدمی تھا اور مقتول کے کچھ راز بھی اس مزارعہ کے پاس تھے۔ ان لوگوں کے نام کچھ عجیب الٹے پلٹے سے ہوتے ہیں اس لئے میں اس مزارعہ کا نام بھول گیا ہوں۔ اس نے بتایا کہ مقتولہ چند دن رات اس مکان میں آ کر رہتا تھا اور ظاہر یہ کرتا تھا کہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ پانی صحیح باری پر لگ رہا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ لیکن اس کا اصل مقصد محض عیاشی ہوتا تھا۔ اس کا ایک دوست تھا جو اس کے ساتھ یہاں رہتا تو نہیں تھا لیکن جب کبھی مقتول یہاں رہتا تھا تو یہ دوست رات کو یہاں آ جایا کرتا اور عیش و عشرت کر کے رات کو ہی اپنے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ یہ دونوں یہاں شراب پیتے تھے اور گاؤں میں دو لڑکیاں تھیں، ان میں ایک لڑکی چوری چھپے

یہاں آجاتی تھی۔

مزارعہ نے مقتول کے اس دوست کا نام رام سروپ بتایا جو مقتول کا ہم عمر تھا اور وہ بھی گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ مقتول جیسا ہی شہزادہ اور بدی میں ڈوبا ہوا۔

''کیا رات کو یہی دوست اس کے ساتھ نہیں تھا؟''۔۔۔ میں نے مزارعہ سے پوچھا۔

''میں پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا''۔۔۔ مزارعہ نے جواب دیا۔۔۔ ''ایک تو اندھیرا تھا اور دوسرے اس کی اس وقت میری طرف پیٹھ تھی اور وہ دروازے میں داخل ہو رہا تھا اس لئے اس کو میں ٹھیک طرح پہچان نہیں سکا۔ یہ ضرور کہوں گا کہ یہ چھوٹا ٹھاکر اس دوست کے بغیر کوئی ایسا کام نہیں کرتا تھا''۔

یہ مزارعہ جب بیان دے رہا تھا، اس دوران لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دی گئی تھی۔

''تم ان دونوں لڑکیوں کو جانتے ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''وہ کس کی بیٹیاں ہیں؟''

''جانتا کیوں نہیں حضور!''۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ''میں تو انہیں باہر سے ہی نہیں۔ اندر سے بھی جانتا اور پہچانتا ہوں۔ چھوٹے ٹھاکر جی جس لڑکی کو رات بلانا چاہتے تھے، اسے میں ہی جا کر بتاتا تھا۔ ایک تو اپنے ہی ایک مزارعہ کی بیٹی ہے اور دوسری ایک معمولی سے کسان کی بہو ہے۔ ہیں تو دونوں غریب گھرانوں کی لیکن حضور ان کی خوبصورتی اور ان کے گورے رنگ دیکھیں تو آپ کبھی نہ مانیں کہ یہ غریب ماں باپ کی بیٹیاں ہیں۔ ایک لڑکی اور بھی تھی۔ وہ شادی کے دوسرے سال ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ آپ جانتے ہیں ہم لوگ بیوہ کی دوسری شادی نہیں کیا کرتے نہ کوئی ہندو کسی بیوہ کو قبول کرتا ہے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت اور مالدار کیوں نہ ہو۔ اسے منحوس بلکہ چڑیل اور ڈائن سمجھا جاتا ہے۔ یہ لڑکی بیوہ ہوئی تو اس نے چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ خفیہ دوستی کر لی جو کچھ مہینے چلی تو لڑکی کے گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ وہ لڑکی کو ہردوار لے گئے اور وہاں بیوہ عورتوں کے آشرم میں بٹھا آئے''۔

زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، یہ واضح ہو گیا کہ مقتول عیاش طبع، شرابی اور عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والا تھا اور انہیں اس مکان میں رات کو بلایا کرتا تھا۔ س سے یہ سراغ ملا کہ قتل کی وجہ عورت ہی ہے۔ میں نے مزارعہ کو اور زیادہ کرید کر اس

عورت کے متعلق پوچھا جسے رات کو یہاں لائے تھے۔ مزارعہ نے بتایا کہ ایک تو اس عورت کو دھکیل کر اندر لے گئے تھے اور پھر اسے اندر سے اس عورت کے رونے کی آواز بھی آئی تھی۔ وہ کچھ کہہ بھی رہی تھی جو وہ ٹھیک طرح سن نہ سکا۔

ایک اور مشتبہ میرے ذہن میں آ گیا۔ یہ وہ شخص تھا جو رات مقتول کے ساتھ آیا تھا۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون تھا۔

ان دونوں مزارعوں کو میں نے پابند کر لیا۔ پابند کرنے کا مطلب یہ تھا کہ انہیں اپنے سٹاف کے حوالے اس ہدایت کے ساتھ کر دیا کہ یہ نہ کہیں جائیں نہ کسی کے ساتھ بات کریں..... اب مقتول کے باپ کو بلایا۔

جتنی خوبصورت اتنی ہی چالاک

غم سے نڈھال باپ میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا جوان بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ جوان بھی اور اکلوتا بھی۔ وہ اپنے پیچھے نوجوان بیوہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا تھا۔ میں اس باپ کے غم اور دکھ کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اکلوتے بیٹوں کو بگاڑنے والے اور انہیں شہزادے اور راجکمار بنانے والے ماں باپ ہی ہوتے ہیں اور ایسے ماں باپ کو یہ اکلوتے بیٹے ہی اس لغزش کی سزا دیا کرتے ہیں۔ اس باپ کو بھی اکلوتے بیٹے نے بڑی ہی سخت سزا دی تھی..... اس کی اس بری حالت میں میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے پوچھ گچھ کروں لیکن میں نے سوچا کہ اس کیفیت میں اس کے اندر سے صحیح باتیں نکلوانا آسان ہے۔ یہ سنبھل گیا تو اپنے بیٹے کی کرتوتوں پر پردے ڈالے گا۔ میں نے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی ہے؟ اس نے رعونت کے لہجے میں جواب دیا تو مجھے خیال آیا کہ رسی تو جل گئی ہے لیکن اس کا بل نہیں گیا۔

''ہمارے ساتھ کون دشمنی کر سکتا ہے!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''ہمارے ساتھ دشمنی وہ رکھے جسے اپنی جان اور اپنے بچے پیارے نہ ہوں۔ پورے خاندان کو میں فنا کر کے رکھ دوں۔ ان کی کھیتوں کا پانی روک لوں''۔

اگر میں اسے روک نہ لیتا تو وہ سب کی کھیتیاں زبانی کلامی تباہ کر دیتا اور پورے گاؤں کو بھی نیست و نابود کر دیتا..... میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا بیٹا کیسے اخلاق کا تھا۔

اس باپ نے وہی جواب دیا جو اس سے پہلے کئی باپ مجھے اپنے بیٹوں کے متعلق دے چکے تھے۔ جواب یہ کہ میرا بیٹا بڑا ہی نیک، شریف اور چپ چاپ رہنے والا لڑکا تھا۔ شرمیلا اتنا کہ گھر میں باہر کی کوئی عورت آجائے تو یہ گھر سے نکل جاتا تھا..... اس شخص کے الفاظ کچھ مختلف تھے لیکن اس کا جو اصل مطلب تھا وہ میں نے مختصر کر کے ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

میں نے ابھی اسے یہ نہ بتایا کہ اس کا نیک اور شریف بیٹا ایک عورت کے دوپٹے سے مارا گیا ہے اور اس عورت کا ایک ٹانپس اس کی لاش کے قریب پڑا ملا ہے۔ میں نے شراب کی اس بوتل کا بھی ذکر نہ کیا جو اس کمرے میں ایک تپائی پر رکھی تھی۔ یہی تاثر دیا کہ میں بھی اس کے بیٹے کو شریف اور شرمیلا سمجھتا ہوں۔

''یہ تانگہ اس کا ہے؟''— میں نے ٹھاکر سے پوچھا— ''اور اس تانگے پر وہ کہاں گیا تھا؟''

اس نے بتایا کہ یہ تانگہ اس کے بیٹے کا ہے جو اس نے بڑے شوق اور پیار سے بنوایا تھا۔ یہ تو میں نے دیکھا تھا کہ اتنا خوبصورت تانگہ اور اتنا اچھا گھوڑا دیہات میں نظر نہیں آیا کرتا۔ وہاں تھرڈ کلاس سے یکے اور ٹوٹے پھوٹے تانگے چلا کرتے تھے جن کے آگے مریل سے گھوڑے یا ٹٹو جوتے جاتے تھے۔

پھر باپ نے بتایا کہ وہ سورج غروب ہونے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے تانگہ لے کر نکلا تھا۔ اس نے باپ کو بتایا تھا کہ شہر یعنی قصبے میں جا رہا ہے اور وہاں فلم دیکھے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مقتول کا ایک دوست رام سروپ بھی اس کے ساتھ گیا تھا۔

میں نے پوچھا کہ یہ رام سروپ کیسا آدمی ہے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ بھی مقتول کی طرح شریف اور چپ چاپ سا لڑکا ہوگا۔ یقین جانیں کہ ٹھاکر نے تائید کر دی یعنی کہا کہ رام سروپ بھی شریف لڑکا ہے اور اسی لئے اس کے بیٹے کی دوستی رام سروپ کے ساتھ تھی۔

''کیا انہوں نے واپس گاؤں میں آنا تھا؟''— میں نے پوچھا— ''یا کھیتوں والے مکان میں رات گذارنی تھی؟''

''آج کل کھیتوں میں اس کا کوئی کام نہیں تھا''— اس نے جواب دیا— ''اس

نے سیدھا گھر آنا تھا لیکن ساری رات نہ آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ صبح اٹھا تو اس خیال سے اِدھر کھیتوں میں آ گیا کہ ہو سکتا ہے اس نے رات ہمیں جگانا مناسب نہ سمجھا ہو اس لئے اس مکان میں آ گیا ہوگا۔ میں یہاں آیا تو اس کا تانگہ دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی کہ وہ یہیں ہے لیکن اندر جا کر دیکھا تو اس کی لاش فرش پر پڑی نظر آئی''۔

یہ بات سنا کر وہ ایسا رویا کہ اپنے قابو میں نہ رہا۔ اس کی دھاڑیں نکلنے لگیں۔ میں نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنے وقت پر ہی سنبھل سکا۔ میں نے پھر اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ دو تین بار خیال آیا کہ اسے بتاؤں کہ فلاں فلاں لڑکی اس کے بیٹے کے پاس اس مکان میں آتی رہی ہے لیکن ہر بار یہ خیال بھی آ گیا کہ یہ شخص اپنے بیٹے کو شریف اور نیک ظاہر کر رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کھیتوں میں بیٹھا تفتیش کرتا رہوں اور یہ شخص یہیں سے اپنے آدمیوں کو حکم دے دے کہ فلاں لڑکی کو گاؤں سے غائب کر دو۔ وہ بڑے ہی غریب گھرانوں کی لڑکیاں بتائی گئی تھیں۔ اس ٹھاکر جیسے آدمی ایسے پورے کے پورے خاندان کو لاپتہ کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان لڑکیوں کو شاملِ تفتیش کرنا ہی ہے تو پھر اس ٹھاکر کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسے اس خوش فہمی میں ہی مبتلا رہنے دیا جائے کہ اس کا بیٹا بڑا ہی شریف اور خاموش طبع تھا۔

''اب صرف ایک ضروری بات بتا دیں''— میں نے سوال کیا— ''آپ کا بیٹا آخر جوان آدمی تھا۔ کسی لڑکی یا کسی عورت کے ساتھ اس کے مراسم ہوں گے''۔

''ایسی بات سوچیں بھی نہیں داروغہ جی!''— اس نے بڑے پختہ لہجے میں کہا— ''میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ عورت ذات سے تو دور بھاگتا تھا۔ وہ اس قماش کا تھا ہی نہیں''۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ شخص مجھے صحیح باتیں نہیں بتا رہا تھا۔ اس لیے اس سے صرف ایک اور بات پوچھی۔ وہ یہ تھی کہ مقتول شادی شدہ تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ اس کی بیوی کے درپردہ تعلقات کسی اور کے ساتھ ہوں گے جن کا مقتول کو پتہ چل گیا ہوگا۔ مقتول نے اپنی بیوی کو مارا پیٹا ہوگا اور اس کے آشنا کے ساتھ بھی تو تکار کی ہوگی اور آشنا نے اسے قتل کر دیا۔ ایک شک ان دونوں لڑکیوں پر بھی تھا۔ وہ اس طرح کہ وہ مقتول کا حکم مانتے ہوئے اس کے پاس آ جاتی ہوں گی۔ ضروری نہیں یہ بات دونوں کے متعلق صحیح ہو، ایک کے متعلق سچ

ہوسکتی تھی۔ وہ لڑکی اس کا حکم مانتی تھی لیکن اس کی محبت یا دوستی کسی اور کے ساتھ تھی۔ مقتول نے اس لڑکی کو رات اس مکان میں بلایا ہوگا۔ لڑکی نے اپنے دوست کو بتا دیا ہوگا اور کہا ہوگا کہ آج اسے ختم ہی کر ڈالو۔ لڑکی آئی اور کچھ دیر بعد وہ آدمی آ گیا اور اس نے دوپٹے سے ہی مقتول کو مار ڈالا اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔

پھر شک مقتول کے دوست رام سروپ پر بھی تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ دونوں کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر لے آئے اور اندر جا کر دونوں دوستوں کی اس لڑکی پر کشیدگی پیدا ہوئی جو قتل تک جا پہنچی۔ ان دونوں دوستوں نے گاؤں سے دور اس مکان میں رات کی تنہائی میں جو موقع پیدا کیا تھا، ایسے موقعوں پر آدمی حیوان بن جایا کرتے ہیں۔ یاری دوستی کے جذبات اس طرح دب جاتے ہیں جیسے مر ہی گئے ہوں۔

میں نے تھانہ کو فارغ کر دیا اور گاؤں کے نمبردار کو بلایا۔ ان علاقوں میں نمبردار کو مکھیا بھی کہتے تھے لیکن میں نمبردار ہی کہوں گا چونکہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا اس لئے نمبردار بھی ہندو تھا۔ نمبرداروں کے متعلق میں اپنی کہانیوں میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ یہ ایک سرکاری عہدہ یا رتبہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ تھانے داروں کے تو زر خرید غلام بنے رہتے تھے لیکن ان میں سے کوئی ملزم پر پردہ ڈالنے پر آ جائے تو وہ دھوکہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ یہ نمبردار میری رائے کے مطابق ٹھیک آدمی تھا۔ علاقے کے نمبردار تھانے آتے ہی رہتے تھے۔ ان کا ایک مقصد تو تھانیدار کو سلام کرنا ہوتا تھا اور دوسرا مقصد مخبری یعنی چغل خوری تھا اور ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ تھانیدار کو یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ دن رات سرکاری فرائض کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔

اس نمبردار سے میں نے مقتول کے متعلق پوچھا۔ اس نے وہی رپورٹ اور رائے دی جو مزارعہ دے چکا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ مقتول اور اس کا دوست رام سروپ بگڑے ہوئے مہاراجے یا راج کمار تھے۔ زندہ دلی کوئی برا وصف نہیں ہوتا لیکن یہ دونوں جوان لڑکیوں کے پیچھے جھک مارنے کو زندہ دلی سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں نمبردار نے ان ہی دو لڑکیوں کا ذکر کیا جن کے متعلق مزارعہ مجھے بتا چکا تھا۔

نمبردار نے کہا کہ اونچے گھرانے کے کسی آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ غریبوں کی بہو بیٹیوں کی عزتیں خراب کرتا پھرے۔ یہ بدی مقتول میں موجود تھی اور وہ اس میں بڑا فخر

محسوس کرتا تھا..... میں نے اسے کہا کہ مقتول کا باپ تو اپنے بیٹے کو اور رام سروپ کو بڑے شریف اور نیک لڑکے کہتا ہے۔

''باپ ہے نا جی!''— نمبردار نے کہا— ''اپنی اولاد کو کون برا کہتا ہے..... یہ دونوں جو کچھ تھے میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لڑکا اب کسی بڑے گھرانے کی لڑکی پر ہاتھ ڈال بیٹھا ہوگا۔ مزارعے اور غریب کسان تو بے عزتی کا کڑوا گھونٹ نگل لیتے ہیں لیکن بڑے گھرانے والے تو اتنا بھی برداشت نہیں کرتے کہ ان کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھے''۔

میں نے نمبردار سے مقتول کی بیوی کے چال چلن وغیرہ کے متعلق پوچھا۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ وہ لڑکی ایسی نہیں۔ اس نے مجھے یقین دلا دیا کہ مقتول کی بیوی شریف لڑکی ہے۔ مزارعوں کی دونوں بیٹیوں کے متعلق اس نے بتایا کہ دونوں جتنی خوبصورت ہیں اتنی ہی چالاک اور ہوشیار ہیں۔

میں نے ان لوگوں سے اور نمبردار سے کچھ معلومات لینی تھیں لیکن ان پر ہی انحصار نہیں کرنا تھا۔ میرے کچھ اور ذرائع بھی تھے اور اللہ نے عقل اور فہم و فراست بھی عطا کی تھی۔ نمبردار سے میں نے صرف ایک بات اور پوچھی۔ وہ یہ کہ مقتول کے باپ کی خاندانی دشمنی کسی کے ساتھ تھی؟..... نمبردار نے پورے اعتماد کے لہجے میں جواب دیا کہ اس شخص کی کسی کے ساتھ بھی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے نمبردار سے کہا ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے جائے اور رام سروپ کو میرے پاس لے آئے۔ میں نے ان دونوں لڑکیوں کو بھی شاملِ تفتیش کرنا تھا لیکن ایک خیال آ گیا جس کے تحت یہ پروگرام بنایا کہ ان دونوں کو اپنے پاس بلوانے کی بجائے ان کے گھروں میں جاؤں گا۔ اس علاقے میں مجھے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ میں مختلف گاؤں کے قابلِ اعتبار معزز افراد کو جانتا تھا۔ ایسے دو آدمی اس گاؤں میں بھی تھے۔ انہیں بلایا اور ان سے بھی کچھ معلومات حاصل کر لیں۔ ان سے کوئی نئی بات تو معلوم نہ ہوئی لیکن ان باتوں کی تائید اور تصدیق ہو گئی جو اس وقت تک مجھے معلوم ہو چکی تھیں۔

نوجوانی کی نادانی

اب مقتول کا جگری یار رام سروپ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مقتول کی عمر کا

خوبرو جوان تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کی پرچھائیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنی انگلیاں مسلسل چٹخائے جا رہا تھا۔ یہ گھبراہٹ کی انتہا کی علامت ہوتی ہے۔ میں نے اس کی گھبراہٹ اور ہیجانی کیفیت رفع کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ میں صرف ان لوگوں کے ساتھ مروت اور شفقت سے پیش آیا کرتا تھا جو نہایت اہم گواہ ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی سے باتیں کرتے انہیں گھبراہٹ اور پولیس کے خوف سے نجات دلا دیا کرتا تھا لیکن مجھے اس شخص پر بڑا پختہ شک تھا اس لئے سوچا کہ اسے نارمل حالت میں نہ ہی آنے دیا جائے۔

''دیکھ بھائی رام سروپ''۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ ''مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ایسی پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے کہ تم اپنے خون کے رشتوں کو بھی نہیں پہچان سکو گے۔ یہ سوچ لینا کہ میں تمہارے گاؤں کا غریب سا آدمی نہیں کہ تمہارا رعب مان لوں گا۔ سچ بول دینا اور تم پر کوئی الزام آیا تو میں گول کر دوں گا۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کرو گے تو خود ایسے دھوکے میں آ جاؤ گے جس سے نکلنا ممکن نہیں ہوگا..... یہ بتا دو کہ وہ لڑکی کون تھی جسے تم دونوں تانگے میں یہاں لائے تھے؟''

''کس لڑکی کی آپ بات کر رہے ہیں؟''۔۔۔ اس نے حیران سا ہو کر کہا۔۔۔ ''میں کچھ نہیں جانتا حضور! میں تو رات اپنے گھر میں تھا''۔

''کیا تم مقتول کے ساتھ اس کے تانگے میں کل شہر نہیں گئے تھے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا اور یہ بھی کہا۔۔۔ ''یہ سوچ کر جواب دینا کہ تمہیں مقتول کے ساتھ تانگے میں جاتے ہوئے ایک نہیں بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا''۔۔۔ میں نے جھوٹ بولا۔۔۔ ''اور تمہیں مقتول کے ساتھ واپس آتے بھی لوگوں نے تانگے میں دیکھا تھا اور پھر تمہیں رات کو اس مکان میں داخل ہوتے بھی دیکھا گیا تھا۔ میرے پاس پکی گواہیاں موجود ہیں اور بہتر ہے تم سچ بول دو''۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے میری ساری بات کی تردید کر دی۔ اس سے مجھے شک ہونے لگا کہ یہ آدمی ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ مقتول کے باپ نے بتایا تھا کہ رام سروپ اس کے بیٹے کے ساتھ قصبے میں تانگے پر گیا تھا لیکن رام سروپ انکار کر رہا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ زیادہ مغز کھپائی نہیں کروں گا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم یہ بتا

دو کہ وہ لڑکی کون تھی جسے تم اور مقتول یہاں اپنے ساتھ لائے تھے؟..... اس لڑکی کی نشاندہی کر دو اور میں تمہیں اس واردات میں سے نکال دوں گا''۔

میں سمجھتا تھا کہ وہ گھبراہٹ اور خوف کی کیفیت میں مبتلا ہے لیکن اس نے کمال خود اعتمادی سے کہا کہ وہ پہلے بتا چکا ہے کہ وہ اپنے گھر میں تھا۔

''تم نے اپنے دوست کو ایک لڑکی کی خاطر قتل دیا ہے''۔۔۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ ''فوراً لڑکی کی نشاندہی کر دو اور یہ بھی بتا دو کہ مقتول کو اس لڑکی کے دوپٹے سے تم نے پھانسی دی تھی یا لڑکی نے اور تم نے مقتول کو پکڑے رکھا تھا؟''

جیسا کہ عام مشتبہ اور ملزم کیا کرتے ہیں، رام سروپ نے بھی ویسے ہی کیا کہ تڑپ تڑپ کر اس الزام کی تردید کرنے لگا اور اس کے منہ میں جو آیا، اس نے کہا۔ میں حیران اس پر ہو رہا تھا کہ وہ تو اپنے پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔ میں واردات والے مکان کے صحن میں بیٹھا تفتیش کر رہا تھا۔ میرے لیے ایک چارپائی اور ایک تپائی اور دو تین کرسیاں صحن میں رکھ دی گئی تھیں۔

میں نے رام سروپ کو بازو سے پکڑا، اور جھٹکا دے کر اٹھایا اور اسے مکان کے کمروں کی طرف دھکیلا۔ وہ پیچھے مڑنے لگا تو میں نے اسے بڑی زور سے لات ماری وہ برآمدے میں منہ کے بل گرا۔ میں نے اس تک جا کر گردن سے دبوچا اور اٹھا لیا۔ پھر گردن پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے کمرے کے دروازے کی طرف بڑی زور سے دھکا دیا۔ اب وہ واردات والے کمرے کی دہلیز پر پڑا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اسے گردن سے ہی پکڑ کر اٹھایا اور پوچھا کہ تم نے اسے کس طرح قتل کیا تھا۔

''تم جھوٹ بولو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں تمہارے گھر کے بچے بچے کو اور عورتوں کو بھی یہاں سب کے سامنے بلاؤں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ تمہارا یہ بیٹا آدھی رات کتنے بجے گھر آیا تھا۔ انہیں کہنا جھوٹ بولیں۔ میں تمہارے گھر کی عورتوں کو سب کے سامنے ننگا کر کے کھڑا کر دوں گا''۔

میں تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن جس کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ اس نے فلاں کام کیا ہے اور یہ نہیں مان رہا تو اس اپنے ہاتھ دکھا دیا کرتا تھا۔ رام سروپ ایسے ہی بے وقوفوں

میں سے تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں مان رہا تھا کہ مقتول کے ساتھ تانگے میں قصبے کو گیا تھا..... میں اسے واردات والے کمرے میں لے گیا تھا اور اس پر زور دے رہا تھا کہ اس نے یہ واردات کس طرح کی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے یہ واردات کی ہے۔ یہ تو میں اس پر دہشت طاری کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کا انداز اور رویہ بدل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ اور تاثر آ گیا تھا اور وہ کمرے میں ہر طرف نظر گھمانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی آ رہی تھی۔ اس نے نظریں کمرے میں گھمائیں اور پھر اس کی نظریں ایک جگہ ایسے ٹھہر گئیں جیسے اسے کوئی چیز نظر آ رہی ہو جو مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے احساس ہی نہ رہا ہو کہ میں بھی کمرے میں موجود ہوں۔ چند سیکنڈ گزرے تو اس نے اس طرح چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا جیسے وہ حیران ہو رہا ہو کہ میں کس طرح اس کمرے میں آ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے جذبات امڈ آئے تھے یا اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کا جھوٹ یہاں نہیں چلے گا۔

''میں آپ کو صحیح بات بتا دیتا ہوں''۔۔۔ اس نے کہا۔ دو چار سیکنڈ چپ رہا پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔۔۔ ''ہم دونوں سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ میں اس میں شامل تھا۔ آپ مہربانی کریں میری یہ غلطی معاف کر دیں اور مجھ سے ساری بات سن لیں''۔

''تم سچ بولو اور فائدہ مجھ سے لو''۔۔۔ میں نے جھوٹا وعدہ کیا۔۔۔ ''سارا معاملہ ابھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر کہو گے کہ قتل تم نے کیا ہے تو میں اس کو بھی دبا سکتا ہوں''۔

وہ بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا تو میں اسے باہر صحن میں لے گیا جہاں بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اسے کہا کہ وہ پورے اطمینان سے اور سچے دل سے بیان شروع کر دے اور ذرا سا بھی نہ ڈرے۔ اس نے بولنا شروع کر دیا اور میں کہیں کہیں اسے روک کر کوئی بات پوچھتا تھا اور وہ جواب دیتا تھا۔ اس طرح اس کا بیان خاصا لمبا ہو گیا جو میں اپنی زبان میں سناؤں گا۔

اس نے بتایا کہ وہ مقتول کے ساتھ اس کے تانگے میں شہر یعنی قصبے میں گیا تھا۔ اس زمانے میں سینما ہال اتنے زیادہ اور اتنے اچھے نہیں ہوا کرتے تھے جتنے آج کل ہیں۔ مگر

ہری کشن میں ایک پرانے زمانے کا احاطہ تھا۔ اس کے صحن پر ٹین کی چادروں کی چھت ڈال کر سینما ہال بنا لیا گیا تھا۔ مقتول اور رام سروپ فلم دیکھنے گئے تھے۔

انہوں نے چھ سے نو بجے تک والا شو دیکھنا تھا۔ ابھی وقت خاصا زیادہ باقی تھا۔ وہ ایک دوست کے گھر چلے گئے اور وہاں وقت گذار کر فلم دیکھنے چلے گئے۔

فلم نو ساڑھے نو کے درمیان ختم ہوئی۔ فلم کے بعد انہوں نے کھانے کا سامان خریدا اور قصبے کے شراب خانے میں جا بیٹھے۔ وہاں کھانا بھی کھایا اور شراب بھی پی۔ پھر وہاں سے واپس گاؤں کو چل پڑے۔

قصبے اور گاؤں کے درمیان تقریباً آدھا میل یا اس سے کچھ زیادہ راستہ نیچے کو چلا جاتا تھا۔ ٹیلوں اور گھاٹیوں سے گزرتا تھا۔ رات تاریک تھی۔ ان کے تانگے پر چھت نہیں تھی۔ تانگہ اس اونچے نیچے علاقے میں چلا گیا۔ بڑی اچھی پگڈنڈی تھی جو خاصی چوڑی تھی۔ وہ جب اس نشیب و فراز والے علاقے میں گزر رہے تھے تو راستے میں کھڑے دو آدمیوں نے انہیں تانگہ روکنے کو کہا۔ گھوڑے کی باگیں مقتول کے ہاتھ میں تھیں۔ اس نے گھوڑا روک لیا اور رام سروپ سے کہا کہ یہ آدمی اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ کوئی سواریوں والا تانگہ ہے اور شہر سے آگے دیہاتی علاقے کو جا رہا ہے۔ وہ تانگے میں باقی سفر کرنا چاہتے تھے۔

تانگہ روکنے والے جب تانگے کے قریب آئے تو دیکھا کہ ایک جوان آدمی تھا اور اس کے ساتھ کوئی آدمی نہیں بلکہ ایک جوان لڑکی تھی۔ لڑکی کے ساتھی نے مقتول سے پوچھا کہ وہ کہاں تک جا رہا ہے۔ مقتول نے یہ نہ بتایا کہ یہ سواریوں والا تانگہ نہیں بلکہ پرائیویٹ تانگہ ہے۔ اس کی بجائے اس نے یہ کہا کہ بیٹھ جاؤ، جہاں کہو گے اتار دیں گے۔

رام سروپ مقتول کے ساتھ تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آدمی اور لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مقتول اور رام سروپ نے ان سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ وہ کہاں تک جائیں گے، اس کی بجائے یہ پوچھا کہ یہ آپس میں کیا لگتے ہیں۔ کیا وہ میاں بیوی ہیں؟..... اس آدمی نے فوراً جواب نہ دیا بلکہ ذرا ہکلا کر دو مرتبہ ہاں ہاں کہا۔ اس سے رام سروپ کو کچھ شک ہوا۔ اس نے مذاق کے لہجے میں کہا کہ تم تو بہن بھائی لگتے ہو۔ اس آدمی نے یہ کہنے کی بجائے کہ وہ بہن بھائی نہیں میاں بیوی ہیں، پھر ہکلا کر دو مرتبہ ہاں ہاں کہی۔

رام سروپ نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ ان پر شک ہونے لگا کہ یہ میاں بیوی بھی نہیں اور بہن بھائی بھی نہیں۔ رام سروپ نے ان دونوں کی کچھ حرکتیں اور باتیں سنا کر سمجھایا کہ ان دنوں پر اس طرح شک پکا ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً گھر سے بھاگ رہے تھے۔ مقتول نے اس آدمی سے پوچھا کہ تم جا کہاں رہے ہو..... اس کی بجائے اس آدمی نے پوچھا کہ وہ کہاں تک جا رہے ہیں۔ مقتول نے اپنے گاؤں کا نام لیا تو اس آدمی نے کہا کہ وہیں ذرا پیچھے اتار دینا۔

مختصر بات یہ ہے کہ مقتول اور رام سروپ کو پکا شک بلکہ یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ گڑبڑ ہے اور اس لڑکی کو اُڑا لیا جائے۔ اس واردات کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ دونوں شراب کے نشے میں تھے۔ ویسے بھی یہ دونوں یعنی مقتول اور رام سروپ اپنے آپ کو بڑے پاور والے بدمعاش سمجھتے تھے۔ نوجوانی کی نادانی بھی اس میں شامل تھی۔

لڑکی کھیتوں والے مکان میں

ایک تو رات کا وقت تھا اور وقت بھی ایسا کہ تمام تر علاقہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ویرانہ تھا جہاں سے کسی کے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔ علاقہ بھی ٹیلوں ٹیکریوں والا تھا یعنی اوٹ بڑی اچھی تھی۔ مقتول نے تانگہ روک لیا۔ اس نے رام سروپ کو اشارہ کیا اور دونوں تانگے سے اُتر آئے۔ تانگے کے پیچھے آ کر دونوں نے اس آدمی کو بازوؤں سے پکڑا اور کھینچ کر نیچے گرا دیا۔

وہ آدمی تیزی سے اٹھا تو مقتول نے اسے کہا کہ ہمارے پاس چاقو ہیں، ہم تمہیں یہیں کاٹ کر کھڈ میں پھینک دیں گے، یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ اتنے میں لڑکی تانگے سے اتری۔ رام سروپ نے اسے کمر سے دبوچ کر اٹھایا اور پھر تانگے پر سوار کرا دیا۔

لڑکی کے ساتھ جو آدمی تھا، اس نے ذرا سا بھی مقابلہ نہ کیا اور وہ سر جھکا کر پیچھے کو یعنی قصبے کی طرف چل پڑا۔ لڑکی نے اسے رو روکر اور چلا چلا کر پکارا لیکن اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ لڑکی نے اسے بے غیرت بھی کہا اور یہ بھی کہا کہ میں تمہارے پیچھے گھر سے نکلی ہوں اور تمہاری خاطر اپنے خاندان کی عزت ڈبو دی ہے لیکن مقتول نے تانگہ چلا دیا تھا اور وہ آدمی اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔

رام سروپ نے پچھلی سیٹ پر لڑکی کو دبوچا ہوا تھا۔ لڑکی نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جسے جوان مرد سمجھ کر اس کے ساتھ گھر سے نکلی تھی، وہ بلا مقابلہ غائب ہو گیا ہے اور اب وہ ان بدمعاشوں کے پنجے میں آ گئی ہے تو اس نے ان کی منت سماجت شروع کر دی اور کہا کہ وہ شریف گھرانے کی لڑکی ہے اور گھر سے بھاگنے کی غلطی کر بیٹھی ہے۔

رام سروپ نے اپنے بیان میں ایسی بات کہی تو نہیں لیکن یہ میری اپنی رائے ہے کہ ان دونوں ہندوؤں کو جب پتہ چلا ہو گا کہ یہ مسلمان لڑکی ہے تو وہ اور زیادہ شیر ہو گئے ہوں گے۔ مسلمان وہاں اقلیت میں تھے۔ ایک تو انہیں ڈر خطرہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کو پتہ چلا تو وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے اور دوسرا یہ کہ ہندو مسلمانوں کے ازلی دشمن چلے آ رہے ہیں، ان کے ہاتھ مسلمان لڑکی لگی تو یہ اپنا حق بلکہ فرض سمجھنے لگے کہ اسے خراب کرنا ہی کرنا ہے۔

یہ دونوں ہندو، لڑکی سے جو کچھ پوچھتے رہے وہ صاف صاف بتاتی رہی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی ماں اس وقت مر گئی تھی جب وہ چھ سات سال کی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی اور سوتیلی ماں نے آ کر اس لڑکی کے ساتھ بہت برا سلوک شروع کر دیا اور باپ کے کان اس کے خلاف بھرتی رہی۔ اب لڑکی کی عمر بیس اکیس سال تھی اور اس نے یہ اتنی لمبی مدت جہنم میں گذاری تھی۔ اس آدمی نے جوان دونوں ہندوؤں کا ہم عمر تھا، اسے محبت کا تحفہ دیا اور گھر سے بھاگ جانے پر اُکسایا تو گھر کے جہنم سے تنگ آئی ہوئی لڑکی اس کے ساتھ چل پڑی۔

مقتول اور رام سروپ نے اسے کہا کہ وہ اسے زیادہ دن خراب نہیں کریں گے۔ ایک یا دو دن اسے اپنے ساتھ رکھیں گے اور پھر اسے تانگے میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیں گے۔ لڑکی اور زیادہ رونے پیٹنے لگی۔ اس نے اب یہ کہنا شروع کر دیا کہ میری عزت لینے کی بجائے میرے جان لے لو۔ اب وہ ان کے ہاتھوں میں تڑپ تڑپ کر بھاگنے کی کوشش سے دستبردار ہو گئی۔ بے چاری سمجھ گئی ہو گی کہ ان سے رہائی ناممکن ہے۔

یہاں میں ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ یہ واقعہ کہ لڑکی کسی کے ساتھ جا رہی تھی تو اسے راستے میں کسی اور نے اُڑا لیا، آپ کے لیے شاید عجیب ہو گا لیکن میرے لئے اور پولیس کے کسی بھی آدمی کے لئے عجیب نہیں۔ میں نے اتنی لمبی پولیس سروس میں ایسے پانچ

واقعات دیکھے تھے جن میں سے تین کی تفتیش میں نے کی تھی۔ دیہات کے ویران علاقوں میں ایسا واقعہ عجیب نہیں ہوا کرتا۔ ہوسکتا ہے آپ نے ''حکایت'' میں ہی کسی کہانی میں ایسا واقعہ پڑھا ہو۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ گھر سے بھاگے ہوئے لڑکی لڑکا ہوتے ہی مجرم ہیں اور یہ بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ بھاگنے والا لڑکا تو اس قسم کی صورتِ حال میں پھنس کر بھاگنے کی ہی کرتا ہے اور لڑکی کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا تھا کہ اس طرح ایک لڑکی ایک جوان آدمی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ وہ بالکل ایسے ہی ویران اور کھڈ نالوں کے علاقے میں سے گزر رہے تھے کہ ایک نامور ڈاکو گھوڑے پر سوار راستے میں مل گیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو ساتھی بھی تھے۔ لڑکی لڑکے کو روک کر ڈاکو نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں تو اسے شک ہوا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ اس نے لڑکی کو پکڑا اور گھوڑے پر بٹھا لیا اور اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ میں یہ ساری کہانی نہیں سناؤں گا، دلچسپ بات اتنی سی سناؤں گا کہ لڑکی کا سراغ مل گیا اور میں نے اس ڈاکو تک رسائی حاصل کر لی اور جب وہاں پہنچا یعنی اس ڈاکو سے ملاقات ہوئی تو لڑکی نے واپس آنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس دھوکہ باز عاشق سے بہتر یہ ڈاکو ہے جو میرے لیے ایک فرشتہ ہے جس نے میرے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کیا، میرے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی ہے اور میری ہر بات مانتا ہے۔

ایسی ہر لڑکی اتنی خوش قسمت نہیں ہوتی کہ اسے اس طرح اڑا لے جانے والا آدمی اس کے ساتھ شادی کر لے۔ اکثر ایسی لڑکیاں بہت خراب ہوتی ہیں اور بعض بدقسمت عصمت فروشوں کے بازار تک پہنچا دی جاتی ہیں۔

آپ نے ایسے افسانے بھی پڑھے ہوں گے اور سچے واقعات بھی سنے ہوں گے کہ لڑکی جذبات میں آ کر کسی کے ساتھ گھر سے نکل گئی اور کسی بڑے شہر میں دونوں جا پہنچے اور ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ کوئی ذریعہ معاش نہ ملا اور پیسے ختم ہو گئے تو حضرت عاشق لڑکی کو ہوٹل میں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور واپس اپنے گھر آ گئے۔ لڑکی ہوٹل والوں کے قبضے میں آ گئی پھر آپ تصور میں لا سکتے ہیں کہ وہ بے چاری کس انجام کو پہنچا دی گئی ہوگی۔

میں نے یہ وضاحت صرف اس لئے پیش کی ہے کہ میری یہ کہانی پڑھنے والوں میں سے کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ ایسا واقعہ تو ہم نے فلاں کہانی میں پڑھا تھا اور اب یہ تھا نیدار اسی

واقعہ کو اپنی کہانی میں استعمال کر رہا ہے۔ میری نگاہ میں یہ کوئی عجیب اور ڈرامائی واقعہ نہیں تھا۔

لڑکی کو وہ کھیتوں والے مکان میں لے گئے۔ اس مکان کے باہر والے دروازے پر وہی ہوا جو مزارعہ مجھے سنا چکا تھا۔ لڑکی اندر نہیں جا رہی تھی اور یہ دونوں ملزم اسے دھکیل اور گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ اسے واردات والے کمرے میں کرسی پر بٹھایا۔ وہاں ان دونوں نے شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور گلاس بھی۔ مقتول نے شراب نکال کر گلاسوں میں ڈالی اور اس میں تھوڑا سا پانی ملایا اور لڑکی سے کہا کہ وہ بھی پیئے۔ لڑکی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ مسلمان ہے اس لئے حرام چیز نہیں پیئے گی۔ مقتول نے رام سروپ سے کہا کہ اس کا منہ پکڑو، اس مسلمان کی بچی کے منہ میں شراب ڈال کر ہی رہوں گا۔

رام سروپ نے لڑکی کو کرسی پر ہی دبوچ لیا اور اس کا منہ پکڑ کر کھولنے کی کوشش کی۔ مقتول نے بھی اس کا منہ کھولنے کے دو تین طریقے استعمال کئے اور اس کے منہ میں شراب انڈیل دی۔ لڑکی کو کھانسی اٹھی لیکن وہ جلدی سنبھل گئی۔ اس کے بعد دونوں اسے بڑے پیار سے راضی کرنے لگے کہ وہ ایک دو گھونٹ اور پی لے تو اس کے دل سے سارا بوجھ اتر جائے گا، نہ کوئی غم رہے گا نہ کسی کا ڈر۔ لڑکی نے پھر ان کی منت سماجت کی لیکن بے سود۔

اب ہر کوئی تصور میں لا سکتا ہے کہ اس مجبور اور بے بس لڑکی کے ساتھ ان دونوں نے کیا سلوک کیا ہوگا۔ رام سروپ نے اپنے بیان میں یہ کہا کہ مقتول نے اسے کہا کہ تم اب دوسرے کمرے میں چلے جاؤ اور میں تمہیں بلا لوں گا۔ رام سروپ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور مقتول نے دروازہ بند کر لیا۔ رام سروپ بہت خوش تھا کہ انہیں بڑا ہی خوبصورت اور نوجوان شکار مل گیا تھا۔ اسے وہ جتنا عرصہ چاہتے اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

رام سروپ انتظار کرتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ اس کے اندازے کے مطابق ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس نے اس کمرے کے دروازے کے ساتھ کان لگائے۔ اندر خاموشی تھی۔ خاموشی نہیں ہونی چاہئے تھی کیونکہ لڑکی اپنی مرضی سے تو نہیں آئی تھی۔ اسے زبردستی لایا گیا تھا، اسے مزاحمت کرنی چاہئے تھی اور شور شرابہ بھی۔ رام سروپ نے تقریباً آدھا گھنٹہ اور انتظار کیا لیکن کمرے کے بند دروازے کے پیچھے خاموشی چھائی رہی۔

آخر اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو کواڑ کھل گیا۔ مقتول نے اندر سے دروازہ بند

نہیں کیا تھا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی جو انہوں نے اس وقت جلائی تھی جب لڑکی کو اندر لے کر آئے تھے۔ اس لالٹین کی روشنی میں رام سروپ کو جو منظر نظر آیا، اس نے اسے چکرا دیا۔ مقتول فرش پر پڑا تھا، اس کے گلے میں دوپٹہ تھا اور لڑکی غائب تھی۔ یہ وہی منظر تھا جو میں نے اس کمرے میں آ کر دیکھا اور آپ کو پہلے سنایا ہے۔ رام سروپ نے اپنے دوست کے پاس بیٹھ کر اس کو بلایا، اور پھر زور سے جھنجوڑا لیکن مقتول نہ بولا۔ اس کی نبض دیکھی تو نبض خاموش تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ تو مر گیا ہے۔

رام سروپ دوڑتا ہوا باہر نکلا، پھر مکان سے باہر چلا گیا، لڑکی کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ وہ پھر واپس وقوعہ والے کمرے میں گیا۔ تب اس نے کمرے کا وہ دروازہ دیکھا جو پیچھے کی طرف کھلتا تھا۔ اس کی چٹخنیاں اتری ہوئی تھی اور ایک کواڑ کھلا ہوا تھا۔ رام سروپ کو یقین ہو گیا کہ لڑکی اس کے دوست کو دوپٹے سے پھانسی دے کر مار گئی ہے اور معلوم نہیں اسے یہاں سے نکلے ہوئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔

میں یہاں تھوڑی سی بات اپنے جذبات کی کروں گا۔ رام سروپ نے جس وقت مجھے بتایا تھا کہ لڑکی مسلمان تھی اس وقت سے میرا خون کھول رہا تھا۔ اگر میں تھانیدار نہ ہوتا اور یہ ہندو مجھے ویسے ہی کہانی سنا رہا ہوتا تو میں اس کا گلا دبا دیتا۔ اب سنا کہ یہ مسلمان لڑکی اس کے دوست کو قتل کر کے بھاگ گئی تو مجھے روحانی تسکین ہوئی۔

''اب بتاؤ رام سروپ!''۔۔۔ میں نے اپنے جذبات کی تسکین کے لیے طنزاً کہا۔۔۔ ''تم مسلمان کی بچی کو کمزور اور مجبور سمجھتے تھے۔ دیکھ لی ہے مسلمان عورت کی غیرت اور جرأت؟''

''دیکھ لی جناب!''۔۔۔ اس نے کھسیانہ سا ہو کر کہا۔۔۔ ''یہ تو میں پہلے ہی مانتا تھا کہ مسلمان غیرت والے ہوتے ہیں اور اپنی عزت پر جان قربان کر دیتے ہیں..... سچی بات ہے جناب! ہم جب بھی کسی مسلمان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں تو ایک مسلمان پر دس ہندو حملہ کرتے ہیں''

میں نے اسے کہا کہ اس سے آگے بتائے کیا ہوا..... اس نے کہا کہ اس کا دوست مرا پڑا تھا اور لڑکی غائب ہو گئی تھی تو اسے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ قتل کا الزام اس پر آ سکتا ہے اور مقتول کا باپ اسے یہیں قتل کر دے گا۔ رام سروپ نے یہ بھی سوچا کہ قتل کی رپورٹ

تھانے میں جائے گی تو پولیس اس کے پورے بیان کو نہیں مانے گی اور قتل کا الزام اسی پر لگائے گی۔ یہ سوچ کر وہ پچھلے دروازے سے نکلا اور وہاں سے بھاگ کر اپنے گھر جا پہنچا۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ مانے گا ہی نہیں کہ وہ مقتول کے ساتھ شہر گیا تھا۔ لڑکی کی طرف سے وہ مطمئن تھا کہ وہ شہر کی رہنے والی تھی اور بھاگ گئی تھی۔ وہ خود گھر سے بھاگی ہوئی تھی اس لئے اس نے کسی کو یہ تو بتانا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں تک ہو آئی ہے۔

''میں نے آپ کے حکم سے سچ بول دیا ہے''۔۔۔ رام سروپ نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔۔۔ ''اپنا قصور اور گناہ صاف بیان کر دیا ہے۔ اب آپ اپنا وعدہ پورا کریں، میرا یہ قصور بخش دیں۔ میں بڑا ہی پاپی ہوں۔ اتنے پاپ کئے ہیں کہ اب مجھے بھی شرم آنے لگی ہے۔ اپنے دوست کا انجام دیکھ کر میں توبہ کرتا ہوں اور آج کے بعد شریفوں جیسی زندگی گذاروں گا، بس آپ مجھے معاف کر دیں''۔

میں نے اس کی تسلی کے لیے کہہ دیا کہ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا لیکن اسے ایک دو دن میرے ساتھ تھانے میں رہنا پڑے گا۔ دراصل میں اسے کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکی چاہے اپنے گھر سے بھاگی ہی تھی لیکن جس طرح ان دونوں نے لڑکی کو زبردستی تانگے میں بٹھایا اور یہاں لائے تھے، یہ ایک سنگین جرم تھا۔ میں رام سروپ کو اس جرم کی انتہائی سزا دلوانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اسے میں نے یہ جو کہا تھا کہ میرے ساتھ دو دن تھانے میں رہے گا، وہ اس لئے کہا تھا کہ اسے ابھی استعمال کرنا تھا اور کچھ اور باتیں بھی پوچھنی تھیں، دراصل اسے میں حراست میں لے رہا تھا لیکن ابھی اسے حوالات میں بند نہیں کرنا تھا۔ میں نے یہ صورتِ حال بھی پیدا کرنے کی کوشش کرنی تھی کہ قتل کا الزام اسی پر آئے۔ ویسے بھی یہ حقیقت ہے کہ مجھے اس پر شک تھا کہ اس نے لڑکی کے متعلق کوئی جھگڑا کھڑا کر لیا ہو گا اور اپنے دوست کو قتل کر دیا۔ لڑکی کو اس نے کہیں چھپا دیا ہو گا یا واپس قصبے کو بھگا دیا ہو گا۔

میں نے پہلے اسے وہ دوپٹہ دکھایا جو مقتول کی گردن کے گرد لپیٹا گیا تھا۔ اس نے دوپٹہ شناخت کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکی کا دوپٹہ ہے۔

پھر میں نے اسے وہ ٹاپس دکھایا جو دوپٹے کے نیچے لاش کے قریب فرش پر پڑا ملا تھا۔ رام سروپ نے دیکھتے ہی بڑے پکے اور شگفتہ لہجے میں کہا کہ یہ اسی لڑکی کا ہے۔ میں

نے اسے کہا کہ اس نے اتنی جلدی کس طرح یہ ٹاپس پہچان لیا ہے؟..... اس نے بتایا کہ لڑکی اتنی خوبصورت اور اچھے جسم والی تھی کہ اس نے اسے بہت ہی غور سے دیکھا تھا اور اس نے یہ ٹاپس تو خاص طور پر دیکھے تھے۔

سوال یہ تھا کہ میں اس شخص کے اس بیان کو سچ مان لوں؟..... مجھے اتنا تجربہ تو حاصل ہو چکا تھا کہ کسی مشتبہ یا ملزم کے بولنے کے انداز سے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ ملزم سچ بول رہا ہے یا جھوٹ کی آمیزش کر رہا ہے۔ تھانیداروں کے سامنے خود اعتمادی سے جھوٹ بولنے کا تجربہ صرف پکے جرائم پیشہ افراد کو ہوتا ہے۔ وہ تو قانون کے نشیب و فراز بھی سمجھتے ہیں۔ یہ تو نوجوان دیہاتی تھا جو اپنے آپ کو راجکمار سمجھتا تھا۔ اس میں اتنی عقل تھی ہی نہیں کہ اتنی پختہ آواز میں اتنا لمبا جھوٹ ابیان دیتا۔ وہ جب جھوٹ بول رہا تھا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ مجھے چکر دے رہا ہے۔ اب میں نے اس کا بیان صحیح سمجھا پھر بھی پوری طرح اعتبار کر لینا میری حماقت ہوتی۔ بہرحال میں نے اس پر اپنا اعتماد جما لیا تھا اور اسے اعتماد میں لے بھی لیا تھا۔ وہ بڑی خوشی سے میرے ساتھ تھانے چلنے کو تیار ہو گیا۔

میں نے اس سے ان دو لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن کا ذکر مزارعہ نے کیا تھا کہ وہ اس مکان میں آیا کرتی تھیں۔ اس نے فوراً تسلیم کر لیا بلکہ دو اور جوان عورتوں کی بھی نشاندہی کر ڈالی۔ میں نے کچھ شکوک ذہن میں رکھ کر ان لڑکیوں اور ان دو جوان عورتوں کے متعلق اس سے کئی باتیں پوچھیں جو اس نے بتا دیں۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ میں نے رام سروپ اور مزارعہ کو ساتھ لیا اور چند ایک آدمیوں کو اگلی صبح تھانے آنے کو کہا اور وہاں سے قصبے کو چل پڑا۔ رام سروپ سے میں نے کہا کہ جہاں انہوں نے تانگہ روکا تھا وہ جگہ مجھے ضرور دکھائیں۔

تین ٹھاکر آ گئے

ہم اس جگہ پہنچے جہاں انہوں نے تانگہ روکا تھا تو رام سروپ نے ہمیں روک لیا۔ کچی پگڈنڈی پر ان کے تانگے کے پہیوں کے نشان اور ان کے قدموں کے نشان تو اب مل ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ سارا دن یہاں سے لوگ پاپیادہ گزرتے رہے تھے، بیل گاڑیاں اور یکے بھی گزرے تھے اور نہ جانے کتنے مویشی گزر گئے تھے۔ رام سروپ نے بتایا کہ انہوں

نے اپنا تانگہ پگڈنڈی سے ایک طرف کر کے روکا تھا۔ اس نے مجھے وہ جگہ دکھائی۔

میں نے وہ جگہ دیکھی تو یہ پگڈنڈی سے بالکل ہٹ کر ایک ٹیلے کے قریب تھی۔ وہاں ان کے تانگے کے پہیوں کے نشان تھے اور ان سب کے قدموں کے نشان بھی تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں تین چار آدمی کھڑے رہے ہیں اور ذرا ذرا آگے پیچھے اور دائیں بائیں پاؤں رکھتے رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ یقین ہو گیا کہ انہوں نے تانگہ یہاں روک کر لڑکی کو زبردستی اغوا کیا تھا اور اس کے دوست کو بھگا دیا تھا۔

تھانے پہنچے تو مجھے پوسٹمارٹم رپورٹ دی گئی۔ پوسٹمارٹم قصبے میں ہی ہو جاتا تھا۔ وہاں سرکاری ہسپتال تھا۔ کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ مقتول کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ موت کا جو وقت لکھا گیا تھا، وہ وہی وقت تھا جو رام سروپ نے بتایا تھا۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ مقتول نے شراب پی رکھی تھی۔

تھانے میں اے ایس آئی موجود تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج شہر کی کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ آئی ہے؟..... اس نے بتایا کہ کوئی ایسی رپورٹ نہیں آئی۔ ایسا تو کم ہی ہوتا تھا کہ کسی کی بیٹی رات کو لاپتہ ہوئی تو وہ لوگ اگلے روز ہی تھانے رپورٹ درج کرانے آ گئے ہوں۔ لڑکی کی گمشدگی کے معاملے میں لوگوں کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ دو تین دن خود ہی اسے ڈھونڈتے رہتے تھے تاکہ لڑکی کہیں سے مل جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لڑکی کی گمشدگی پورے خاندان کی بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔ مجھے ایسی توقع نہیں تھی کہ وادات والی لڑکی رات کو لاپتہ ہوئی اور اگلی صبح ہی اس کا باپ رپورٹ درج کرا گیا ہوگا پھر بھی سوچا شاید کوئی تعلیم یافتہ اور عقلمند آدمی ہو جس نے سب سے پہلے تھانے رپورٹ درج کروانا بہتر سمجھا ہو۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ یہ لڑکی رات کو لاپتہ ہوئی اور اغوا ہو کر پھر مقتول کو قتل کر کے بھاگی اور رات ہی رات واپس اپنے گھر پہنچ گئی۔

میں گھر چلا گیا۔ اصل تفتیش صبح شروع کرنی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک کان کا ٹاپس تھا جو سونے کا تھا۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ ایسے فینسی ٹاپس صرف شہروں کی لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔ دیہات میں ابھی ایسا فیشن نہیں گیا تھا۔ دیہات کے لوگ ڈیزائن کی خوبصورتی نہیں دیکھا کرتے تھے بلکہ وہ وزن دیکھتے تھے یعنی وزن زیادہ ہو۔ اس علاقے کی ہندو عورتیں زیادہ تر چاندی کے زیورات استعمال کرتی تھیں۔ مقتول کے خاندان جیسے

امیر لوگ سونے کے زیورات استعمال کرتے تھے لیکن پھر وہی بات کہوں گا کہ وہ دیکھتے تھے کہ مثلاً انگوٹھی ہے تو یہ کتنی بھاری ہے۔ سارے دیہات میں ایک ہی ڈیزائن استعمال ہوتا تھا۔ وہ جو لڑکیاں مجھے بتائی گئی تھیں کہ مقتول کے اس کھیتوں والے مکان میں آیا کرتی تھیں، وہ سب غریب گھرانوں کی تھیں۔ وہ گھرانے صرف چاندی کے زیورات استعمال کرتے تھے۔ میں مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ان میں سے کسی نے یہ ٹاپس بنوائے ہوں گے اور وہ بھی سونے کے!

میں صبح تھانے گیا تو پہلا کام یہ کیا کہ قصبے کے چاروں سناروں کو تھانے بلایا۔ نگر ہری کشن چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں چھ سات سنار تھے۔ ان میں چار ذرا بڑے پیمانے کے صراف تھے۔ باقی چھوٹے چھوٹے درجے کے تھے اور شاید ان سے بھی کم درجہ دو تین اور سنار تھے۔ سب کی دکانیں ایک ہی گلی میں ایک قطار میں تھیں۔ ان کے ساتھ تھانے کا رابطہ کبھی کبھار ہو جاتا تھا۔ جب کبھی کسی کے گھر چوری یا ڈکیتی کی واردات ہو جاتی اور زیورات بھی چوری ہو جاتے تھے۔

چاروں سنار دوڑے آئے۔ میں نے سونے کا یہ ٹاپس ان کے آگے رکھ دیا۔ یہ مجھے نیا نیا سا لگتا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ خود بھی دیکھیں اور دوسرے چھوٹے سناروں سے بھی پوچھیں کہ یہ کس نے بنوایا تھا۔

چاروں سناروں نے ٹاپس غور سے دیکھا اور چاروں نے کہا کہ یہ ان میں سے کسی نے نہیں بنایا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ یہ کیوں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے انہیں پوری واردات سنا ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹاپس صرف شہروں میں استعمال ہوتا ہے۔ دیہات میں یہ فیشن گیا ہی نہیں اور گیا بھی تو کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔ انہوں نے وہی وجہ بتائی جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔

میں نے اپنے آپ میں کچھ خفت سی محسوس کی۔ ایک ٹاپس سناروں کو دکھا کر پوچھنا کہ یہ کس نے بنوایا تھا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے انبار میں سے سوئی تلاش کی جا رہی ہو۔ پھر بھی تفتیش کا انداز یہی ہوتا ہے کہ باریک سے باریک تفصیل کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ معلوم نہیں یہ میری چھٹی حس تھی کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ٹاپس مجھے مطلوبہ لڑکی تک پہنچا دے گا۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ رام سروپ پر میرا شک ابھی قائم تھا اور اسے میں نے

کچھ اور کھنگالنا تھا۔ سناروں کو میں نے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ انہوں نے ٹاپس دیکھ لیا ہے، دوسرے سناروں سے بھی معلوم کر دیں۔

اس کے بعد پانچ چھ دن تفتیش چلتی رہی۔ کوئی قابل ذکر پیش رفت نہ ہوئی اس کے لئے میں اپنی ان کوششوں کو یہاں بیان نہیں کروں گا ورنہ اپنا اور آپ کا وقت ضائع کروں گا۔ مخبر رپورٹیں دیتے رہے۔ میں کوئی نئی بات نہیں تھی جس کا سہارا لے کر میں آگے بڑھتا۔ رام سروپ کو تھانے میں ہی رکھا۔ ابھی اسے حوالات میں بند نہیں کیا تھا۔ اس کا دماغ ٹھکانے آ گیا تھا اور اب اس نے اپنے آپ کو شہزادہ اور راجکمار سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اسے بڑی اہمیت دیئے رکھی جیسے اس کے بغیر میں تفتیش نہیں کر سکوں گا۔ اس سے میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پوچھتا رہا۔ وہ بڑے خلوص سے بتاتا بھی رہا لیکن سراغ والی بات کوئی بھی نہ ملی۔

قتل کے تیسرے یا چوتھے دن مقتول کا باپ تھانے آیا۔ اس کے ساتھ اسی کی عمر اور اسی کی حیثیت کے دو آدمی تھے۔ وہ معلوم کرنے آیا تھا کہ قاتل کا سراغ ملا ہے یا نہیں۔ وہ غمزدہ باپ تھا، ایک ہی ایک اس کا بیٹا تھا جو قتل ہو گیا، اس کے دکھ کو میں سمجھتا تھا اس لئے اس کے ساتھ تسلی آمیز اور حوصلہ افزا باتیں کرنا مناسب سمجھا لیکن اس کے ساتھ جو دو آدمی آئے تھے، ان میں سے ایک شاید اپنے آپ کو بہت ہی اونچی حیثیت کا آدمی سمجھتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ تحکمانہ لہجے میں بات کی اور مجھ سے جواب طلبی کرنے لگا کہ میں تفتیش میں کوتاہی کیوں کر رہا ہوں۔

میں نے اسے شریفانہ الفاظ میں ٹالنے کی کوشش کی تو مقتول کے باپ نے بھی اسی جیسا لہجہ اور رویہ اختیار کر لیا۔ شاید وہ مجھے مسلمان سمجھ کر رعب گانٹھ رہے تھے اور انہیں یہ توقع ہو گی کہ میں ان سے ڈر جاؤں گا کہ یہ ہندو مجھے سروس سے نکلوا دیں گے۔

''ٹھاکر جی!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اگر دو تین دن اور مجھے قاتل کا سراغ نہ ملا تو میں آپ کے خلاف تحریری رپورٹ پولیس کپتان کو بھیج دوں گا۔ آپ مجھے گمراہ کر رہے ہیں۔ اپنے بیٹے کے متعلق اور اس کے دوست رام سروپ کے متعلق آپ نے مجھے جو باتیں بتائیں وہ سب جھوٹی تھیں۔ اپنے بیٹے کو آپ شریف اور نیک کہتے رہے ہیں۔ اس کے دوست کو بھی آپ نے شریف بتایا تھا لیکن ان دونوں کے جو کرتوت میرے سامنے آئے

ہیں وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں''۔

میں نے اصل بات کھل کر سنا دی اور اس کے بیٹے نے رام سروپ کے ساتھ مل کر جس طرح اس لڑکی کو اغوا کیا تھا، وہ بھی سنا دیا اور ان غریب لڑکیوں کے متعلق بھی سنایا جنہیں وہ اپنے کھیتوں والے مکان میں بلاتا تھا۔ یہ سب کچھ سنا کر اسے کہا کہ تم پر اور تمہارے بیٹے پر ان غریبوں کی آہ پڑی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تم نے اپنے بیٹے کو بگاڑ کر راجکمار نہیں بلکہ اپنے علاقے کا مہاراجہ بنائے رکھا۔ اس کی بجائے اس میں عقل پیدا کرتے اور اسے شریفوں کے راستے پر چلاتے تو آج تمہیں یہ صدمہ نہ پہنچتا۔

تینوں ٹھاکر دبک گئے اور میں نے انہیں کہا کہ آئندہ وہ تھانے نہ آئیں۔ اگر انہیں کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے تو وہ بتانے کے لیے کسی بھی وقت آ سکتے ہیں اور اگر میں گھر میں سویا ہوا ہوں تو مجھے جگا بھی سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے انہیں تھانے سے چلے جانے کو کہا۔

یہاں میں ایک اور بات کہوں گا۔ کوئی مسلمان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا جنازہ پڑھا جاتا ہے اور سب اس کی بخشش کی دعا کرتے ہیں اور پھر اسے دفن کیا جاتا ہے۔ اوپر قبر بنتی ہے، قبر پکی کی جاتی ہے اور اس پر اس کا نام لکھا جاتا ہے۔ قبر میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے لیکن لوگ اس کی قبر کا احترام کرتے ہیں اور اس کی روح کی نجات کے لئے فاتحہ پڑھتے ہیں لیکن ہندو اپنے مردے کو جلاتے ہیں۔ ذرا تصور میں لائیں کہ ایک خوبرو نوجوان غریبوں کی بیٹیوں کو اس لئے خراب کرتا تھا کہ وہ امیر باپ کا بیٹا تھا اور گاؤں میں اس کا حکم چلتا تھا۔ پھر اس نے ایک لڑکی کو زبردستی اٹھایا اور خراب کرنے کے لیے لے گیا۔ اسے پہلی سزا یہ ملی کہ اسی لڑکی کے ہاتھوں قتل ہوا اور پھر اس کا مردہ لکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ کر لکڑیوں کو آگ لگا دی گئی۔ تصور میں لائیں کہ وہ کس طرح جلا ہوگا۔ اس کی ہڈیاں بھی جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔

مجھے پھانسی دے دو

اب دیکھئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اچانک کس طرح میری مدد فرمائی۔ چھٹا یا ساتواں روز تھا کہ ایک سنار کا بیٹا تھانے میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اس کی دکان پر فوراً

پہنچوں۔ وجہ یہ بتائی کہ جو ٹاپس میرے پاس تھا، اسی جیسا دوسرا ٹاپس بکنے کے لیے آیا تھا۔ اطلاع ملتے ہی میں ٹاپس جیب میں ڈال کر اٹھ دوڑا۔ صرافہ بازار قریب ہی تھا۔ میں اس دکان پر پہنچا۔

وہاں ایک عورت برقعے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سنار نے دکان کے نصف حصے میں ایک پردہ لٹکایا ہوا تھا۔ پردہ دار خواتین کو وہ اس پردے کے پیچھے بٹھایا کرتا اور زیورات دکھایا کرتا تھا۔ اس نے وہ ٹاپس مجھے دے دیا اور دکان کے دوسرے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ وہ ذرا میرے ساتھ اس پردے کے پیچھے چلے۔ وہ پہلے تو ذرا جھجکی لیکن میرے اچھی طرح بولنے کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور پردے کے پیچھے آ گئی۔ وہاں کرسیاں رکھی تھیں۔ میں نے اسے وہاں بٹھایا اور پوچھا کہ وہ یہ ٹاپس کیوں لائی ہے۔

اس نے برقعے کا نقاب اوپر کر دیا اور کچھ گھبراہٹ کے لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ میں اس سے یہ کیوں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے اسے بہت سی تسلیاں دیں اور کہا کہ وہ ذرا سا بھی ڈرے اور گھبرائے نہیں، میں کسی خاص مقصد کے تحت پوچھ رہا ہوں اور اس پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اس نے ذرا جھینپتے ہوئے جو بات بتائی وہ مختصراً یوں ہے کہ یہ اس کی بیٹی کا ایک ٹاپس ہے۔ دوسرا کہیں گم ہو گیا ہے۔ میں ایسا دوسرا ٹاپس نہیں بنوانا چاہتی کیونکہ اتنے پیسے نہیں، بہتر یہ سمجھا کہ یہ ٹاپس بیچ دوں اور بیٹی کو ہلکے پھلکے رنگ بنوا دوں گی۔

میں نے دوسرا ٹاپس اپنی جیب سے نکالا اور اسے دکھا کر کہا کہ اس کا گمشدہ ٹاپس یہ میرے پاس ہے..... میں نے دونوں ٹاپس ہاتھ میں اکٹھے رکھ کر دیکھے تو وہ بالکل ایک جیسے تھے۔ بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔

رام سروپ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اس لڑکی نے انہیں یعنی رام سروپ اور مقتول کو روتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کی ماں سوتیلی ہے جس نے اس کی زندگی جہنم بنائے رکھی اور اسے اس آدمی سے پیار ملا تو اس کے ساتھ گھر سے چل نکلی۔ مجھے یہ بیان یاد آ گیا۔

''ایک بات بتاؤ بہن!''— میں نے پوچھا— ''کیا تم اس بیٹی کی سوتیلی ماں نہیں؟''

اس عورت نے یوں بدک کر میرے منہ کی طرف دیکھا جیسے میں نے اسے اچانک

سوئی چبھو دی ہو۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں کوئی نجومی یا جوتشی نہیں تھا کہ پردوں کے پیچھے کی باتیں معلوم کرنے کی طاقت رکھتا تھا، یہ عقل کی بات تھی کہ میں نے اس وقت تک جو تفتیش کی تھی، اس کی باریک سے باریک تفصیل اور ایک ایک لفظ جس کسی نے بھی کہا تھا، میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ذہن بیدار نہ ہو تو تفتیش میں سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا..... عورت تو جیسے بت بن گئی تھی۔

''کیا لڑکی صبح سے پہلے گھر پہنچ گئی تھی؟''— میں نے اس کی طرف جھک کر ذرا دبی سی آواز میں پوچھا۔

اب تو اس عورت کے چہرے سے یوں معلوم ہونے لگا جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔ اگر میری یہ دونوں باتیں جو اس سے پوچھی تھیں، بے بنیاد ہوتیں تو وہ حیرت سے مجھے دیکھتی اور پھر پوچھتی کہ میں نے کیا جھک جھک لگا رکھی ہے۔ اس کی خاموشی اور پھر اس پر جو کیفیت طاری ہو گئی تھی، اس سے پتہ چلتا تھا بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی اسی عورت کی سوتیلی بیٹی ہے۔ آخر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن کوئی لفظ منہ سے نہ نکلا اور اس نے ایک بار پھر بولنے کی کوشش کی۔

''آپ کو کس طرح پتہ چلا ہے؟''— اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے۔

''میں ایک بار پھر کہتا ہوں ڈریں نہیں!''— میں نے شفقت کے لہجے میں کہا— ''میں جو پوچھوں وہ ٹھیک ٹھیک بتا دیں۔ بہتر یہ ہے کہ میں آپ کے خاوند کو بلوا لوں تا کہ آپ کا ڈر ختم ہو جائے''۔

وہ تو کچھ سوچنے اور کسی فیصلے پر پہنچنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی خاوند کو بلانے کے متعلق وہ دوغلی سی بات کرتی تھی۔ میں نے اپنے طور پر سوچا کہ میں وردی میں ہوں اور اس عورت کے ساتھ اس کے گھر گیا تو سارے محلے میں اس کی بے عزتی ہو گی۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس کسی کے گھر کسی اچھے کام کے لئے بھی جائے تو لوگ اپنی اپنی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔ پولیس کا کسی کے گھر جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس عورت سے کہا کہ وہ سنار کے نوکر کو اپنا گھر سمجھا دے اور یہ اس کے خاوند کو یہاں لے آئے گا۔ میں ابھی اس عورت کو تھانے بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ لے جاتا تو مجھے کوئی روک

نہیں سکتا تھا۔ میں اس عورت کی عزت کی سوچتا تھا۔ یہ میری شرافت تھی اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا اور مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ ایک مسلمان خاتون کو رسوا کروں۔

عورت نے سنار کے نوکر کو اپنا گھر سمجھایا اور یہ بھی کہا کہ اس کا خاوند اس وقت گھر میں ہو گا۔ نوکر نے گھر سمجھ لیا اور میرے کہنے پر دوڑتا گیا۔

اس کے خاوند کے آنے تک میں اس عورت کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور کچھ اس نے باتیں کیں جن سے یقین ہو گیا کہ وہ لڑکی اسی کی سوتیلی بیٹی تھی لیکن میں نے واردات کی کوئی بات نہ کی۔ اس عورت کا دراصل مطلب یہ تھا کہ میں اس کی سوتیلی بیٹی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں اور اس قصے کو یہیں گول کر دوں۔ میں گول مول سی باتیں کرتا رہا اور اسے تسلی دلاسہ بھی دیتا رہا۔ اتنے میں اس کا خاوند آ گیا۔ پڑھا لکھا معزز آدمی تھا۔

''محترم!''— میں نے بڑے اچھے لہجے میں کہا— ''میں آپ کی بیگم کو تھانے لے جا سکتا تھا لیکن آپ کی پوزیشن اور عزت کا خیال کر کے آپ کو یہاں بلایا ہے۔ میں مسلمان ہو کر کسی مسلمان کی رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس ٹاپس نے راز فاش کر دیا ہے۔ میں آپ پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ بشرطیکہ آپ ساری بات بالکل صحیح صحیح مجھے بتا دیں..... صحیح بات مجھے یہ ٹاپس دیکھنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔ آپ کی بیٹی گھر سے لاپتہ ہو گئی تھی اور اسی رات واپس آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مجھے بہت سی باتیں معلوم ہیں، بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر میرے پاس تھانے آ جائیں اور ذرا سی بھی گھبراہٹ اور بے عزتی محسوس نہ کریں۔ میں آپ پر پورا پورا اعتماد کروں گا۔ اگر آپ نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو پھر میرا رویہ تھانیداروں والا ہو گا اور آپ کے گھر پر باقاعدہ پولیس کا چھاپہ مارا جائے گا''۔

میں انہیں تھانے بلانے کا جو طریقہ اختیار کر رہا تھا یہ پولیس کے قاعدے اور ضابطے کے خلاف تھا۔ مجھے اس شخص اور اس کی بیٹی اور بیوی کو اسی وقت پکڑ کر تھانے لے جانا چاہئے تھا لیکن میں پھر کہوں گا کہ ان کی عزت کا خیال آتا تھا۔ اس معزز آدمی نے میری عزت رکھ لی۔ میں انہیں سنار کی دکان سے رخصت کر کے تھانے آ گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر تھانے آن پہنچا۔

میں نے اس کی بیٹی کو غور سے دیکھا۔ پہلی چیز یہ نوٹ کی کہ وہ واقعی بہت خوبصورت لڑکی تھی اور اس کے جسم کے تناسب میں ایک خاص کشش تھی۔ میں نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا کہ میری ریڈنگ کیا تھی۔ مختصراً یہ کہوں گا کہ یہ عام گھریلو لڑکیوں سے خاصی مختلف تھی اور اس کا چہرہ کچھ اور ہی غمازی کرتا تھا۔

اب میں ان مکالموں کو الگ رکھتا ہوں جو ان کے ساتھ میں نے بولے، میں سیدھی کہانی سنا دیتا ہوں۔ باپ کو میں نے باہر بٹھا دیا اور لڑکی کو اپنے سامنے بٹھا کر اسے تسلیاں دیں، حوصلہ دیا اور ذہن نشین کرایا کہ وہ مجھے تھانیدار نہ سمجھے، اپنا بڑا بھائی سمجھ کر میرے ساتھ بات کرے وغیرہ وغیرہ۔

''مجھے اب کسی کا ڈر نہیں''— لڑکی نے ایسے لہجے میں بات کی کہ مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کہا— ''مجھے ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں۔ اپنی عزت بچانے کے لیے میں نے ایک ہندو کو قتل کیا ہے۔ آپ سے صرف یہ درخواست کرتی ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے مجھے پھانسی دے دیں، اس لئے نہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے بلکہ اس لئے کہ میں اس زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ مجھے پھانسی نہیں دی جائے گی تو میں اپنی جان خود لے لوں گی اس جینے سے تو موت اچھی ہے''۔

مجھے توقع تھی کہ یہ نوجوان لڑکی ابھی رو پڑے گی لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں اور وہ بڑے ہی تحمل اور پورے اعتماد کے ساتھ بات کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جو دل میں آتا ہے مجھے سنا دے پھر میں دیکھوں گا کہ اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں اور اس کے لیے کیا بہتر ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر اس نے کسی کو قتل کیا بھی ہے تو ضروری تو نہیں کہ اسے سزا ملے گی۔

اس نے جب میری اس بات کے جواب میں بات کی تو میں نے نوٹ کیا کہ یہ لڑکی ذہنی طور پر نارمل نہیں۔ بہرحال وہ میری یہ بات سمجھ گئی کہ میں اس کی ساری زندگی کی کہانی سننا چاہتا ہوں۔ وہ بھی شاید اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ بولنا شروع کر دے پھر یہ نہ دیکھے کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ میں سنوں گا اور پوری توجہ سے سنوں گا۔

محبت کا ڈرامہ چل پڑا

اس لڑکی کا نام نسرین تھا۔ اس نے اپنی جو کہانی سنائی اور جو اقبال جرم کیا، اس کا اختصار یوں ہے کہ اس کی عمر آٹھ سال کے لگ بھگ تھی جب اس کی ماں فوت ہوگئی۔ اس کا ایک بھائی تھا جس کی عمر ابھی تین سال پوری نہیں ہوئی تھی۔ نسرین نے تفصیل سے بتایا کہ اس کی جذباتی حالت کیا ہوئی۔ یہ تو ہم اور آپ تصور میں لا ہی سکتے ہیں۔ نسرین دن رات روتی تھی لیکن اصل رونا تو چھوٹے بھائی کا تھا جو ابھی سمجھتا ہی نہیں تھا کہ موت کیا چیز ہوتی ہے۔ باپ نے دونوں کو پیار اور محبت سے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن بچہ ماں کو ڈھونڈتا اور پکارتا تھا۔ نسرین نے اپنی زندگی بچے کے لیے وقف کر دی۔ ہر وقت اسے اپنے ساتھ چپکائے رکھتی اور رات کو اپنے ساتھ سلاتی اور پوری کوشش کرتی کہ اسے ہنستا کھیلتا رکھے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ بچہ روتا تھا تو وہ اسے بہلاتی تھی اور ہر روز یوں ہوتا کہ وہ خود بھی رونے لگتی تھی۔ نسرین کی بچپن کی شوخیاں ختم ہوگئی تھیں اور وہ کھیل کود بھول ہی گئی۔

باپ نے ایک سال بھی نہ گزرنے دیا اور دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے نسرین اور اس کے چھوٹے بھائی کو دلی طور پر قبول نہ کیا۔ رسمی طور پر انہیں کھانے پینے کو دے دیتی اور جب بچہ روتا تو اسے بہلانے کی بجائے ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور کبھی ایک دو تھپڑ بھی جڑ دیا کرتی تھی۔ آخر نسرین نے سوتیلی ماں کو کہہ ہی دیا کہ وہ بچے کو مارا نہ کرے۔ سوتیلی ماں نے ویسا ہی ایک تھپڑ نسرین کے منہ پر مار دیا۔

شام کو باپ گھر آیا تو سوتیلی ماں نے نسرین کی شکایت کی کہ یہ بچی بہت ہی بدتمیز ہے اور اس نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ باپ نے بیٹی کو ڈانٹ دیا اور بیٹی کی ایک نہ سنی۔ کرتے کرتے یہی معمول بن گیا کہ سوتیلی ماں نسرین اور اس کے بھائی کو ڈانٹتی رہتی اور ذرا سی غلطی ہو جاتی تو دونوں کو ایک ایک تھپڑ مار دیتی، پھر ان کے باپ کے پاس رونے بیٹھ جاتی کہ بچے اسے بہت تنگ کرتے ہیں۔ باقی کسر باپ پوری کر دیتا۔

نسرین اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی مرضی کے مطابق کچھ کھانے کو بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اگر کچھ دے دیتی تو سوتیلی ماں اس کے ہاتھ سے چھین لیتی اور گالی گلوچ کرتی یا اس کی پٹائی کر دیتی..... یہ تھا وہ سلوک جو سوتیلی ماں نے آتے ہی شروع کر دیا تھا۔ اس عورت

نے دوسرا ظلم ان بچوں پر یہ کیا کہ باپ کو ان سے بیگانہ کر دیا۔ نسرین نے اپنے بیان میں کہا کہ سوتیلی ماں اس کی اپنی ماں کی نسبت خوبصورت تھی اور بے حد چالاک اور گھٹیا۔ باپ اس کا غلام بن کے رہ گیا۔

سوتیلی ماں نے پہلا بچہ پیدا کیا۔ اب تو نسرین کی حیثیت ایک نوکرانی کی سی ہوگئی۔ سوتیلی ماں نے حکم دیا کہ بچے کو وہی کپڑے بدلوایا کرے اور اس کا پیشاب پاخانہ بھی صاف کیا کرے۔ نسرین کو اسی عمر میں یہ گندے کام بھی کرنے پڑے لیکن، وہ دلی توجہ اپنے بھائی کی طرف رکھتی تھی اور یہ سوتیلی ماں کو برا لگتا تھا۔

جب سوتیلی ماں کا بچہ پیدا ہوا تھا اس وقت نسرین کی عمر گیارہ سال ہوگئی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی تقریباً چھ سال کا ہوگیا تھا۔ ایک روز نسرین کے چھوٹے بھائی کو بخار ہوگیا۔ سوتیلی ماں نے اس کے باپ کو بتایا۔ نسرین نے دو روز بعد باپ کو بتایا کہ منے کو بخار ہے اور اس کا جسم جل رہا ہے۔ باپ نے بے دلی سے دیکھا اور دوائی لے آیا۔

ایک روز بخار کے دوران نسرین بھائی کو وقت پر دوائی دینے لگی تو سوتیلی ماں نے اسے کہا کہ پہلے اس کے بچے کو سنبھالے۔ نسرین نے کہا کہ پہلے وہ اپنے بھائی کو دوائی دے گی۔ سوتیلی ماں نے اس کے ہاتھ سے دوائی چھیننے کی کوشش کی اور شیشی فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ سوتیلی ماں نے اس کی پٹائی کر دی کہ اس نے اتنی مہنگی دوائی ضائع کر دی ہے۔ شام کو اس کے باپ سے الگ پٹائی کروائی۔ دو دنوں بعد بچے کا بخار اتنا تیز ہوگیا کہ وہ غشی میں چلا گیا اور جب باپ گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ بچہ مر چکا ہے۔ سوتیلی ماں نے نسرین پر الزام دھرا کہ یہ اس کے بے توجہی سے مرا ہے۔

ماں کے صدمے کو تو نسرین نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا لیکن بھائی کی موت نے اسے پاگل کر ڈالا۔ بھائی دفن ہوگیا اور نسرین گھر میں سوائے رونے کے اور کچھ نہیں کرتی تھی۔ سوتیلی ماں نے ظالموں کی طرح اس کی پٹائی شروع کر دی۔

پھر سوتیلی ماں نے ایک اور بچہ پیدا کر دیا۔ نسرین بڑی ہوتی گئی اور اس کے لئے زندگی صحیح معنوں میں جہنم بن گئی تھی وہ پندرہ سولہ سال کی ہوگئی۔ یہ کمسنی کی عمر ہوتی ہے لیکن نسرین اس عمر میں پختہ ذہن کی عورت بن گئی تھی۔

نسرین نے بتایا کہ سوتیلی ماں نے اس کی ماں کا زیور ہضم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا

کہ وہ پرانے ٹائپ کا زیور تھا، اسے سنار کے پاس لے گئی اور اپنی پسند کے ڈیزائن کا زیور تیار کرایا اور نسرین کو خوش کرنے کے لیے اسے یہ کہا کہ یہ تمہارے لئے بنوایا ہے۔ نسرین کو مزید خوش کرنے کے لیے سوتیلی ماں نے یہ ٹاپس کی جوڑی بھی بنوائی اور نسرین کے کانوں میں ڈال دی۔ نسرین نے مجھے بتایا کہ یہ ٹاپس اس کی ماں کے زیور سے نہ بنے ہوتے تو وہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں یہ کبھی قبول نہ کرتی۔ چونکہ یہ اس کی ماں کے زیور سے بنے تھے۔ اس لئے اس نے ماں کی نشانی سمجھ کر کانوں میں ڈال لئے تھے اور کسی بھی وقت انہیں اتارتی نہیں تھی۔

نسرین جب سترہ اٹھارہ سال کی ہوگئی تو اپنے آپ میں ایک تشنگی محسوس کرنے لگی۔ اب اس کا ذہن بلکہ اس کی فطرت اس جہنم سے فرار مانگتی تھی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ بازار سے سودا سلف بھی وہی لاتی تھی، ہانڈی روٹی بھی وہی کرتی تھی اور سوتیلی ماں کے بچوں کو سکول بھی وہی لے جاتی اور چھٹی کے وقت ساتھ لاتی تھی۔ ایک روز اسے بائیس تئیس سال عمر کا خوبرو نوجوان مل گیا۔ اسے وہ اکثر دیکھا کرتی تھی اور وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کا نام حنیف تھا۔ حنیف نے آگے بڑھ کر نسرین کے ساتھ راہ رسم پیدا کر لی اور یہاں سے محبت کا ڈرامہ چل نکلا۔ نسرین نے بتایا کہ حنیف کی نیت بری نہیں تھی اور وہ پاک محبت کا اور پھر شادی کا قائل تھا۔ نسرین کو یوں تسکین سی ہوئی جیسے وہ اتنے لمبے لمبے سال ریگستان میں چلتی جا رہی تھی کہ بڑا ہی دلکش، ٹھنڈا اور پُرسکون نخلستان آ گیا جہاں پانی کا چشمہ ابل رہا تھا۔ نسرین حنیف کی ہو کے رہ گئی۔

حنیف سے ملنے میں اسے کوئی دشواری نہیں تھی۔ وہ باہر جاتی تھی اور کہیں بھی ان کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ انہوں نے ذرا لمبی ملاقاتوں کا بھی وقت نکال لیا۔

باپ کی پناہ میں

نسرین نے بلا جھجک اور بلا شرم اپنے جذبات کا اظہار میرے آگے یوں کیا کہ حنیف کی محبت میں اسے ماں کی محبت بھی مل جاتی تھی اور چھوٹے بھائی کی بھی اور پھر حنیف کی والہانہ محبت کا تو نشہ ہی کچھ اور تھا۔ نسرین نے حنیف سے کہا کہ وہ اپنے ماں باپ سے کہے کہ وہ اس کے باپ سے رشتہ مانگ لیں۔ حنیف نے ماں کو پریشان کیا تو ایک روز اس کی

ماں نسرین کی سوتیلی ماں کے پاس رشتے کی بات کرنے گئی تو سوتیلی ماں نے صاف جواب دے دیا۔ ماں نے آ کر حنیف کو بتایا اور حنیف نے نسرین سے کہا کہ دونوں طرف کے راستے بند ہو گئے ہیں۔

اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ بھاگ ہی چلتے ہیں۔ حنیف نے کہا کہ فلاں گاؤں میں اس کا ایک بڑا گہرا دوست ہے، اس کے پاس چلے چلیں گے اور وہ آگے کہیں اور بھیجنے کا بندوبست کر دے گا..... یہاں میں ایک بات کہوں گا۔ ان کا یوں بھاگ جانا ایک احمقانہ فعل تھا۔ دونوں جذباتی ہو کر فیصلہ کر رہے تھے اور خطروں کو اور دشواریوں کو سوچا تک نہیں۔ نسرین کی عمر بیس سال سے اوپر ہو گئی تھی۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ میں نسرین کا بیان بہت ہی مختصر کر کے پیش کر رہا ہوں۔ آپ خود تصور میں لائیں کہ اس لڑکی کی زندگی جس طرح گزری، اس سے اس کی ذہنی اور جذباتی حالت کیا ہو گئی ہو گی۔ وہ دراصل ذہنی طور پر نارمل رہی ہی نہیں تھی اسی ذہنی کیفیت میں ایک رات حنیف کے ساتھ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

ان کی حماقت دیکھیں کہ قصبے سے پیدل ہی چل پڑے۔ ان کا اندازہ تھا کہ رات ہی رات اس گاؤں تک پہنچ جائیں گے۔

راستے میں جس طرح مقتول اور رام سروپ نے انہیں روکا، وہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں اور رام سروپ کا بیان بھی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اب یہ سنیں کہ نسرین نے مقتول کو کس طرح قتل کیا اور وہاں سے کس طرح نکلی۔

''ان دونوں کافروں نے زبردستی میرا منہ کھول کر بہت سی شراب میرے منہ میں انڈیل دی''۔۔۔ نسرین نے بیان دیتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ایک نے میری ناک دبالی اس لئے شراب میرے حلق سے اتر گئی۔ انہوں نے دوسری بار پھر میرا منہ زبردستی کھولا اور اتنی ہی اور شراب میرے حلق میں اتار دی۔ میں کہتی تھی کہ بے شک میں مجبور ہوں لیکن یہ حرام چیز میرے اندر چلی گئی ہے تو اللہ مجھے بخشے گا نہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میرے دل سے ڈر اور خوف نکل گیا، گناہ کا خیال بھی جاتا رہا اور مجھ میں عجیب سی دلیری پیدا ہو گئی۔ تب میں نے سوچا کہ انہوں نے اچھا ہی کیا ہے کہ مجھے شراب پلا دی ہے''۔

یہ اصل شراب کا نشہ تھا جو نسرین کے دماغ کو چڑھا تو وہ دلیر ہو گئی اور تمام ڈر

خوف نکل گئے۔ البتہ یہ احساس باقی رہا بلکہ پہلے سے زیادہ ہو گیا کہ ان سے اپنی آبرو جان دے کر بھی بچانی ہے۔ نسرین اپنی عصمت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتی تھی۔ مقتول نے رام سروپ کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ نسرین سمجھ گئی کہ اب یہ شخص اس کے ساتھ کس قسم کی زیادتی کرے گا۔ مقتول رام سروپ کے جانے کے بعد دروازہ بند کر رہا تھا تو نسرین کے دماغ میں ایک روشنی چمکی۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنا دوپٹہ اتارا اور مقتول دروازہ بند کر کے ایک قدم ہی پیچھے ہٹا تھا کہ نسرین نے پیچھے سے اپنا دوپٹہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس کے سر کے اوپر سے دونوں ہاتھوں سے آگے پھینکا اور فوراً پیچھے کھینچا اور پھر دوپٹے کو دونوں طرف سے ایسی تیزی سے مروڑے دیئے کہ دوپٹہ پھانسی کا پھندہ بن گیا۔ نسرین دوپٹے کو مروڑتی گئی، مقتول تڑپنے لگا اور گھٹنوں کے بل ہو گیا۔ نسرین نے دوپٹے کو پیچھے کو جھٹکے دینے شروع کر دیئے حتیٰ کہ اس کا تڑپنا ختم ہو گیا اور وہ ایک پہلو پر لڑھک گیا۔

نسرین کا دماغ پوری طرح حاضر رہا۔ شراب کا نشہ میرے خیال میں اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا اور وہ لڑکھڑانے ڈگمگانے لگتی۔ اس نے دوپٹہ وہیں چھوڑا اور یہ دیکھ لیا کہ جس دروازے سے اسے اندر لایا گیا اس طرف دروازے سے باہر کو بھاگی تو آگے مقتول کا دوست دیکھ لے گا اور وہ باہر والے دروازے سے بھی نکل گئی تو باہر رکھوالی والا کتا تھا۔ نسرین کو پیچھے والا دروازہ نظر آ گیا جو اس نے دوڑ کر کھولا اور وہاں سے نکل گئی۔ فصل ذرا اونچے تھے اور رات بھی اندھیری تھی اس لئے اسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ کچھ آگے جا کر اس نے دوڑنا شروع کر دیا

اسے یہ اطمینان تھا کہ اس کی عزت بچ گئی ہے۔ اسے کوئی غم نہیں تھا کہ اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ اگر اسے کوئی دکھ تھا تو یہ تھا کہ حنیف اسے دھوکہ دے گیا تھا۔ اس کے دل میں حنیف کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھا۔ وہ سوچتی تھی کہ حنیف کو اس کے ساتھ دلی محبت ہوتی تو وہ اسے ان لوگوں سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دیتا۔ حنیف تو گیدڑوں کی طرح سر جھکا کر اور دم دبا کر وہاں سے کھسک گیا تھا۔

نسرین پگڈنڈی پر نہیں جا رہی تھی بلکہ کھیتوں اور ویرانوں میں سے گزرتی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ ایک آدمی کو قتل کر کے وہ بہت ہی دلیر ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اس وقت کے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ وہ تو بلاوجہ سب سے ڈرتی

رہتی تھی۔ آدمی کو مار ڈالنا تو کوئی کام ہی نہیں۔

نسرین نے دوڑنا چھوڑ دیا اور تیز قدم اٹھاتی چلتی گئی اور قصبے میں جا پہنچی اور پھر اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ اس کے باپ نے کھولا۔ وہ صبح کاذب کا وقت تھا۔

باپ نے اسے دیکھا تو وہ پھٹ پڑا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ اس کی سوتیلی ماں بھی جاگی ہوئی تھی۔ اس نے بھی واہی تباہی بکی۔ باپ نے نسرین کو مارنے پیٹنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور بیوی سے کہا کہ مجھے ڈنڈا لادو۔

''خبردار!''— نسرین نے مکمل بیداری اور دلیری سے کہا— ''میں نے تم دونوں سے بڑی مار کھائی ہے اور اس مار سے بھاگ گئی تھی لیکن اب مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے میری پوری بات سن لو ورنہ تم دونوں کو اس شہر میں ذلیل کر دوں گی''۔

لڑکی کا یہ روپ اور یہ انداز دیکھ کر باپ سن ہو کر رہ گیا اور سوتیلی ماں چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ نسرین نے باپ کو بتانا شروع کر دیا کہ اس گھر میں اس کے ساتھ اس عورت نے کیا کیا سلوک کیے ہیں، کیا کیا جھوٹ بولے ہیں اور کس طرح باپ کو اس کا دشمن بنایا ہے۔ اس نے باپ کو صاف الفاظ میں کہا کہ میں آپ کو اپنا باپ کہہ نہیں سکتی۔ کیا باپ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک عورت کی جھوٹی اور مکارانہ باتوں میں آ کر اپنی اولاد کے دشمن بن جائیں؟

نسرین ایسے انداز سے اپنی رام کہانی سنا رہی تھی کہ اس کا باپ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو غصے سے گھورنا شروع کر دیا۔ نسرین روئی نہیں۔ اس نے باپ کو بتایا کہ اس کا بھائی کس طرح ترس ترس کر اور تڑپ تڑپ کر مرا تھا اور اسے مارنے والی یہ سوتیلی ماں ہے۔ مختصر یہ نسرین نے اپنی مصیبتوں کا نقشہ ایسے پُراثر انداز سے پیش کیا کہ باپ پوری طرح متاثر ہو گیا۔

نسرین نے صاف بتایا کہ اس کی محبت ایک نوجوان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس نے حنیف کا نام نہ لیا اور باپ نے پوچھا بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ وہ پیار کی کتنی پیاسی تھی اور اسی پیار کے پیچھے وہ گھر سے نکلی۔ پھر اس نے بتایا کہ راستے میں وہ کس طرح اغوا ہوئی اور اسے کہاں لے جایا گیا اور جب اس نے بتایا کہ وہ ایک آدمی کو قتل کر آئی ہے تو باپ کو سخت

دھچکا لگا اور اس نے اٹھ کر بے ساختگی سے نسرین کو گلے لگا لیا۔ اس کے دل میں بیٹی کی محبت بیدار ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بیوی کو ایسا برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ تنگی گالیاں تک دے ڈالیں۔

باپ نے جب سنا کہ بیٹی ایک آدمی کو قتل کر آئی ہے تو اس نے نسرین سے پوچھنا شروع کر دیا کہ کسی نے دیکھا تو نہیں، کوئی تمہیں پہچان تو نہیں لے گا اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ کر یقین کرنے لگا کہ نسرین گرفتار نہ ہو جائے۔ بہرحال باپ نے بیٹی کو پناہ میں لے لیا۔

سوتیلی ماں دبک کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد نسرین نے اپنے ایک کان کو ہاتھ لگایا تو دیکھا کہ ایک ٹاپس کہیں گر پڑا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ کافر اس کا منہ زبردستی کھول رہے تھے تو ان میں سے کسی کا ہاتھ کان پر پڑا تو ٹاپس کان سے نکل کر فرش پر جا پڑا ہو گا۔ مقتول گرا اور نسرین نے دوپٹہ چھوڑ دیا تو ٹاپس دوپٹے کے نیچے آ گیا۔ وہاں نسرین کو اتنی ہوش تھی ہی نہیں کہ وہ اپنا جائزہ لیتی کہ اس کی کوئی چیز یہاں رہ تو نہیں گئی۔

اس جینے سے موت اچھی

نسرین کے بیان کی موٹی موٹی اور نہایت اہم باتیں میں نے سنا دی ہیں۔ میں خود اس لڑکی سے اتنا متاثر ہوا کہ میرے دل میں اس کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ دماغ پر بہت زور دیا کہ اس لڑکی کو کسی طرح اس واردات میں سے نکال دوں لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ وہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا اور انگریز قتل اور ڈکیتی کی واردات کی تفتیش پر ذاتی طور پر نظر رکھتے تھے۔ میں نے بہت سوچا، بہت سوچا لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی کہ اس لڑکی کو پردے میں ہی رہنے دوں۔ میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا کہ مقدمہ ایسا تیار کروں کہ لڑکی اگر سیشن کورٹ سے سزا یاب بھی لے تو ہائیکورٹ میں اپیل کر کے بری ہو جائے۔ میں نے حنیف کو بھی تھانے بلوا لیا۔ میں نے ثابت یہ کرنا تھا کہ اس لڑکی کو زبردستی اغوا کیا گیا اور زبردستی اس کی آبروریزی کرنے کی کوشش کی گئی اور لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لیے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔

یہ پولیس کی کارروائیاں ہوتی ہیں کہ مقدمہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے اور شہادت اور

ثبوت کس طرح فراہم کیے جاتے ہیں اور کس طرح خانہ پُری کی جاتی ہے۔ یہ لمبا چوڑا اور بڑا ہی خشک معاملہ سنا کر آپ کو بور نہیں کروں گا۔ میں نے رام سروپ کو حوالات میں بند کر دیا اور الزام ایک یہ لگایا کہ اس نے لڑکی کو زبردستی اغوا کیا اور اس کی عصمت دری کی کوشش کی یعنی مجرمانہ حملہ کیا۔ حنیف پر مجھے بہت غصہ تھا لیکن اس سے میں نے اپنی مرضی کے بیان دلوانے تھے جو اس نے دے دیئے تھے۔ رام سروپ کو میں نے ایسی خوبصورتی سے اُلو بنائے رکھا کہ اس نے بھی اقبالی بیان دے دیا۔ مقتول کے مزارعہ کو ڈرا دھمکا کر اپنے مطلب کے بیان دلوائے اور کچھ شہادت اپنی طرف سے شامل کی اور دن رات دماغ سوزی کر کے مقدمہ تیار کر لیا۔

میں نے عدالت میں ٹاپس بھی پیش کیے تھے۔ یہ بھی سن لیں کہ وہ ٹاپس کس طرح مجھ تک پہنچا جو نسرین کے ایک کان میں رہ گیا تھا۔ نسرین کا باپ وہ ٹاپس کسی کو دکھانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں مجھے بتایا کہ اس کی یہ بیوی بے حد گھٹیا اور لالچی عورت ہے۔ وہ نسرین کو بتائے بغیر ایک ٹاپس جو رہ گیا تھا، بیچنے کے لیے سنار کے پاس جا پہنچی۔ وہ اس ٹاپس کی قیمت خود ہضم کرنا چاہتی تھی۔ اسے تو ایک پیسہ نہ ملا، میرا کام ہو گیا۔

میں نے نسرین کے باپ سے کہا تھا کہ وہ اب اپنی اس بیوی کو گھٹیا اور لالچی کہہ رہا ہے۔ اگر روزِ اول سے ہی وہ اس بیوی پر نظر رکھتا اور اس کی باتوں پر کان نہ دھرتا تو آج اس کی جوان بیٹی اس طرح تھانے کچہری نہ چڑھتی۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ اپنی اپنی دل پسند کہانیاں گھڑیں گے۔

اس دور میں عدالتوں میں صحیح معنوں میں انصاف ملتا تھا۔ نسرین کی خوش نصیبی کہ سیشن جج ایک انگریز تھا جو اردو نہایت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے دو دو تین تین دنوں کی تاریخیں دے کر یہ کیس بڑی جلدی ختم کر دیا۔ میں نے نسرین کے وکیل کو چوری چھپے کچھ ہدایات دی تھیں۔ بہرحال قانونی موشگافیوں کو الگ رکھیں، ہوا یہ کہ سیشن جج نے نسرین کو صرف تین سال سزائے قید دی اور رام سروپ کو دو دفعات میں مجموعی طور پر سات سال سزائے قید بامشقت دی۔ اپیل میں اس کی سزا بحال رہی تھی۔

اس انگریز سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ ثابت ہو گیا ہے کہ لڑکی کو زبردستی اغوا کیا گیا اور زبردستی آبروریزی کی کوشش کی گئی اور اس سے پہلے زبردستی اسے شراب

پلائی گئی جو مسلمانوں کے لیے حرام ہے۔ اپنی عصمت کو بچانے کے لیے لڑکی نے وہی اقدام کیا جو اسے کرنا چاہیے تھے۔ اس نے آتشی اسلحہ یا تیز دھار آلہ استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے پاس دوپٹہ تھا، اس نے وہی استعمال کیا اور اپنی حفاظت (SELF DEFENCE) میں ملزم کو جان سے مار ڈالا۔ سیلف ڈیفنس کے متعلق بھی سیشن جج نے بڑی ہی دانشمندانہ بات لکھی۔ اس نے لکھا کہ سیلف ڈیفنس اپنی جان کے متعلق ہوتا ہے لیکن عورت کے لئے جان کے علاوہ عزت بچانا بھی ایک فرض ہوتا ہے اور یہ فرض اس لڑکی نے اچھی طرح ادا کیا اور دو ہٹے کٹے آدمیوں سے اپنی عزت بھی بچائی اور جان بھی۔ سیشن جج نے یہ بھی لکھا کہ لڑکی کا ایک ایسے آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگنا جسے وہ چاہتی تھی، قانون کی نظر میں جرم نہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ قانون میں ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو میں اس لڑکی کو بالکل بری کر دیتا لیکن قانون کے تقاضے پورے کرنا ایسی مجبوری ہے کہ میں ملزمہ کو تین سال سزا دے رہا ہوں۔

نسرین کے باپ نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی تو ہائیکورٹ نے سزا میں ایک سال کی تخفیف کر کے دو سال کر دی لیکن نسرین جیل سے زندہ نہ آسکی۔ اس کی سزا کے ابھی چھ مہینے ہی پورے ہوئے تھے کہ مجھے خبر ملی کہ نسرین نے جیل میں خودکشی کر لی ہے۔ جیل میں ایک روز اس کے ہاتھ میں ایک چھری آگئی تھی۔ اس نے اس چھری سے اپنی شہ رگ کاٹ لی۔ پہلے اسے جیل کے ہسپتال میں لے گئے لیکن خون نہ رک سکا۔ کسی بڑے ہسپتال میں پہنچانے میں اتنا وقت ضائع کر دیا گیا کہ وہاں پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

❋ ❋ ❋

وہ بھی باپ تھا

میری اس تفتیشی کہانی میں شاید وہ سراغ رسانی کم ہی ہوگی جس وجہ سے قارئین میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں لیکن اس واردات کے پیچھے آپ کو ایک ایسی کہانی ملے گی جو ہمارے کئی گھرانوں کی یا کئی والدین کی کہانی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ بھی انہیں والدین میں سے ہوں جو بظاہر معزز اور شرفاء ہوتے ہیں لیکن ان کی غفلت ان کی اولاد میں مجرمانہ رجحانات پیدا کر دیتی ہے لیکن والدین اس خوش فہمی اور خود فریبی میں خوش اور مطمئن رہتے ہیں — ''توبہ کرو جی، ہمارا بیٹا چور اچکا نہیں ہوسکتا، یہ تو شریفوں کی اولاد ہے''۔

میں کوئی لیکچر نہیں دوں گا، کہانی سنا دیتا ہوں، میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ اس کہانی سے آپ پر واضح ہو جائے گی۔

بھارتی یعنی مشرقی پنجاب کا ایک قصبہ تھا جو اب ایک بڑا شہر بن گیا ہے۔ حسب معمول میں اس قصبے کا نام نہیں لکھتا کیونکہ یہ لوگ پاکستان میں ہجرت کر آئے تھے اور ایک معزز خاندان کی طرح آباد ہیں۔ میں اس قصبے کے تھانے کا ایس ایچ او تھا۔ اردگرد کا کچھ دیہاتی علاقہ بھی اس تھانے کے تحت آتا تھا۔

ایک روز دن کے دو اڑھائی بجے ایک ہندو تاجر تھانے آیا اور رپورٹ دی کہ اس کے گھر ڈکیتی ہوگئی ہے۔ پہلے تو میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ڈکیتیاں رات کے وقت ہوا کرتی ہیں اور رپورٹ علی الصبح تھانے آیا کرتی ہے لیکن یہ ہندو دو اڑھائی بجے دن کو آیا اور کہا کہ اس کے گھر ڈکیتی ہوئی ہے۔ اس سے میں یہی سمجھ سکتا تھا کہ ڈکیتی دن دیہاڑے ہوئی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ڈکیتی کی واردات کس وقت اور کیسے ہوئی..... اس کے جواب نے میری حیرت رفع کر دی۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ چھ سات

دنوں کے لیے امرتسر گیا ہوا تھا اور مکان بند تھا۔ واپس آ کر دیکھا باہر کا تالا لگا ہوا تھا یعنی ٹوٹا ہوا یا کسی طرح کھولا ہوا نہیں تھا۔ اندر ایک بڑے کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔

سب سے پہلے تجوری دیکھی۔ اس کا تالا کسی مضبوط تار یا کسی اوزار سے کھولا گیا تھا۔ تجوری کھول کر دیکھا اس میں کم و بیش پندرہ ہزار روپے مالیت کے زیورات تھے۔ وہ چوری ہوگئے اور دس ہزار روپے سے کچھ زیادہ رقم تھی، وہ بھی گئی..... میں اپنی ہر کہانی میں یہ بات بتایا کرتا ہوں، اب بھی بتاتا ہوں کہ یہ دس ہزار اور پندرہ ہزار روپیہ آج کا نہ سمجھیں، آج کے حساب سے اس وقت کی یہ تھوڑی سی رقم دس لاکھ اور پندرہ لاکھ تک بنتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت سونا چوبیس یا پچیس روپے تولہ تھا۔

اس ہندو لالے نے ایک بات یہ بتائی کہ یہ زیورات اس کے اپنے نہیں تھے بلکہ ان لوگوں کے گروی رکھے ہوئے تھے جنہیں اس نے سود پر قرضہ دے رکھا تھا۔ اس نے دوسری بات یہ بتائی کہ اچھا ہوا کہ تجوری سے ہی مال گیا، ایک صندوق میں اس کی بیٹی کا زیور تھا، بیوی کا زیور بھی اور ہونے والی بہو کا بھی۔ اس کے علاوہ کچھ رقم بھی اس صندوق میں رکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ سارا مال بچ گیا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ چور کو معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں کچھ اور مال بھی ہے یا اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ صندوقوں کے تالے توڑتا اور تلاشی لیتا۔

اس ہندو نے بتایا کہ اس نے دانستہ رقم اور زیورات الگ الگ رکھے ہوئے تھے۔ اگر یہ سارا مال تجوری میں ہوتا تو سارا ہی غائب ہو جاتا۔ یہ ہندو آڑھت کے علاوہ ساہوکارہ بھی کرتا تھا یعنی زیور یا زمین یا مکان گروی رکھ کر سود پر قرضے دیتا تھا۔

یہ فیملی امرتسر سے کچھ ہی دیر پہلے واپس گھر پہنچی تھی۔ باہر کا تالہ تو ٹھیک بند تھا مگر اندر گئے تو انہیں تباہی نظر آئی جو میں نے بیان کی ہے۔ میں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کا کوئی نوکر ہوگا یا نوکرانی ہوگی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ مال کہاں ہے اور گھر والے کب واپس آ رہے ہیں۔ اس ہندو ساہوکار نے بتایا کہ اس کے گھر کوئی نوکر اور نوکرانی نہیں۔ میرا خیال یہی تھا کہ یہ کسی پیشہ ور کی واردات ہے۔ میں صحیح رائے تو موقعہ پر جا کر اور سب کچھ دیکھ کر قائم کر سکتا تھا۔

میں اس قسم کے کیس اپنے جونیئر سب انسپکٹر یا اے ایس آئی کو دے دیا کرتا تھا لیکن

ان دونوں کے پاس زیر تفتیش وارداتیں زیادہ ہوگئی تھیں۔ میں نے یہ کیس اپنے پاس رہنے دیا۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ یہ کیس اپنے پاس رکھا۔ وہ یہ کہ یہ ایک ہندو تاجر کے گھر کی واردات تھی اور میں مسلمان تھا۔ ہندو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے بہانے ڈھونڈتے ہی رہتے تھے۔ میں کوتاہی کا ملزم کہلانے سے ڈرتا تھا۔ میں اسی وقت مطلوبہ کاغذی کارروائی مکمل کر کے ہندو کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔

اس نے کہا تھا کہ باہر کا تالا بند تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملزم چھت کی طرف سے آئے یا انہوں نے کوئی اور راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ واردات گذشتہ پانچ چھ دنوں میں یعنی اس فیملی کی غیر حاضری کے دوران کب اور کس وقت ہوئی۔ مکان کی سامنے والی دیوار اتنی اونچی تھی کہ اس پر چڑھنا اور اندر کودنا ناممکن تھا۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہوسکتا ہے یہ تالہ کسی اور چابی سے کھولا گیا ہو اور وارادات کے بعد یہ پھر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔ یہ اس زمانے کا بالکل ہی عام قسم کا تالا تھا جس کی شکل ہتھکڑی کے تالے جیسی تھی..... میں اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی تھی اور آگے صحن تھا۔ صحن میں سیڑھیوں کا دروازہ تھا۔ زنجیر چڑھی ہوئی اور تالا بند تھا۔

میں نے صحن میں کھڑے ہو کر مکان کو ہر طرف سے دیکھا۔ مکان کی اونچائی اتنی تھی کہ بغیر سیڑھی کے چڑھنا اور اترنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے کوئی سیڑھی نظر نہ آئی۔ مکان کے مالک سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے گھر میں سیڑھی ہے ہی نہیں۔ یہ میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ ملزم چھت کی طرف سے آئے ہوں گے۔

میں نے باہر والا تالا اس احتیاط کے ساتھ اپنے قبضے میں لیا تھا کہ اس پر انگلیوں کے نشان ہوں گے۔ تھانوں میں کسی بھی جگہ سے اور کسی بھی چیز سے انگلیوں کے نشان اپنے پاس محفوظ کرنے کا سامان موجود رہتا تھا۔ میں اس سامان کا بکس ساتھ لے گیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اس تالے سے انگلیوں کے نشان اپنے خاص کاغذ پر منتقل کر لے۔ ڈکیتی اور چوری کی وارداتوں میں انگلیوں کے نشانات بہت مدد دیتے ہیں۔

پھر میں نے بڑے کمرے کا ٹوٹا ہوا تالا انگلیوں کے نشانات منتقل کرنے کے لئے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔ یہ تالا توڑا گیا تھا۔ میں اندر گیا اس بڑے کمرے کے ساتھ والے چھوٹے کمرے کی دیوار میں تجوری لگی ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ تجوری کا صرف دروازہ

باہر تھا اور باقی ساری تجوری دیوار میں فٹ کی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹے سائز کی تجوری تھی۔

ان تجوریوں کے تالے کھولنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ کوئی پیشہ ور ہی کھول سکتا تھا لیکن اس ہندو نے بتایا کہ اس تجوری کا تالا کچھ خراب ہو گیا تھا۔ اسے وہ بدلوانا ہی چاہتا تھا لیکن اس نے سستی کر دی۔ اس نے خود ہی بتایا کہ یہ تالا تار سے یا کسی دوسری چابی سے ذرا سی کوشش سے کھل جاتا ہے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اس تجوری کے ہینڈل سے اور دیگر جگہوں سے انگلیوں کے نشان لے لے..... مجھے یقین کی حد تک شک ہوا کہ اس واردات میں گھر بھیدی بھی شامل ہے۔ اس کے ذریعے ملزموں کو معلوم تھا کہ باہر کا تالا اور تجوری کا تالا بھی دوسری چابیوں سے کھل جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ گھر بھیدی اگر کوئی تھا تو اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک صندوق میں بھی مال پڑا ہوا ہے اور وہ مال تجوری کے مال کی قیمت سے زیادہ تھا۔

گھر میں بیوی بیٹی، میں چونکا

میں نے جو کچھ دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا۔ اپنی تفتیشی کہانیوں میں پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ چوری اور ڈکیتی کی وارادات کی تفتیش انتہائی مشکل ہوتی ہے کیونکہ اس کا کوئی سراغ یا اشارہ نہیں ملتا۔ موقعۂ واردات سے مجھے زیادہ سے زیادہ یہ اشارہ مل سکتا تھا کہ انگلیوں کے نشان مل جاتے۔ یہ بھی اگر کسی پیشہ ور کے نہ ہوں تو تفتیش میں محض بے کار ہوتے تھے کیونکہ سزا یافتہ اور پیشہ ور اکوؤں وغیرہ کی انگلیوں کے نشانات فنگر پرنٹ بیورو پھلور میں ریکارڈ میں موجود رہتے تھے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر گیا۔ اوپر بھی دو کمرے تھے لیکن دونوں میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ اس مکان کی چھت ساتھ والے مکانوں کی چھتوں سے ملی ہوئی تھی۔ ایک فصیل تھی۔ میں نے پوچھا کہ اس طرف اور پچھواڑے کون لوگ رہتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ پچھواڑے ایک ہندو رہتا ہے اور اس کے آگے بھی ایک ہندو کا مکان تھا۔ واردات والے مکان کے ایک پہلو میں ایک مسلمان کا گھر تھا اور اس سے آگے بھی ایک مسلمان کا ہی مکان تھا۔ مجھے یہ شک تھا کہ ملزم چھت کے راستے آئے تھے۔ یہ بتانا ممکن نہیں تھا کہ وہ کس طرح

آئے اور کس طرح گئے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے یہی شک تھا کہ یہ واردات مسلمانوں نے یا کسی ایک مسلمان نے کی ہے۔ ہندو بڑی ہی گھٹیا اور قابل نفرت قوم ہے لیکن اس قوم میں چورا اچکے نہ ہونے کے برابر ملیں گے۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ اس مکان کے پڑوس میں مسلمانوں کا جو گھر ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔

اب واردات والے گھر کے افراد کو دیکھنا ضروری تھا۔ ایک تو اس ہندو کی بیوی تھی پھر ایک بیٹا تھا جس کے متعلق بتایا گیا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ باپ کے ساتھ کاروبار کرتا تھا۔ میں نے اسے بڑی غور سے دیکھا تھا اور ایک دو باتیں اس سے بھی پوچھی تھیں۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کیسا آدمی ہے اور کیا اس میں کچھ زندہ دلی ہے یا نہیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ وہ بالکل ہی بنیا اور مردہ دل آدمی تھا۔ اسے میں اس وجہ سے دیکھ رہا تھا کہ میں نے ایسی واردا تیں دیکھی ہیں جن میں گھر کے بیٹے نے ہی اپنے گھر کو لوٹ لیا تھا۔ اس موٹے بھدے جوان میں مجھے کوئی ایسی بات نظر نہ آئی۔

اس کے بعد گھر میں اس سے چھوٹی ایک بیٹی تھی جس کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔ میں اس وقت چونک پڑا جب مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ بیٹی تقریباً ایک سال سے بیوہ ہے اور گھر بیٹھی ہے۔ یہ تو میری اور دوسرے انسپکٹر صاحبان کی کہانیوں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہندوؤں میں یہ ظالمانہ دستور ہے کہ لڑکی اگر شادی کے پہلے ہی روز یا کچھ ہی وقت گزار کر بیوہ ہو جائے تو اس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس پر ظلم یہ کیا جاتا ہے کہ اسے منحوس سمجھ کر گھر کے کسی کونے میں یوں بٹھا دیا جاتا ہے جس طرح کوئی بے کار چیز کاٹھ کباڑ میں پھینک دی جاتی ہے۔ اس کی چوڑیاں توڑ دی جاتی ہیں۔ وہ زیور کی کوئی چیز نہیں پہن سکتی نہ کوئی قیمتی کپڑا پہن سکتی ہے اور اس کے سر پر ہر وقت میلا دوپٹہ رہتا ہے۔

ایسی بیوہ لڑکیوں اور بڑی عمر کی عورتوں کو ہندوؤں کے مقدس مقامات ہردوار یا بنارس بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں وہ بظاہر عبادت میں مصروف رہتی ہیں لیکن خود ہندو جانتے ہیں کہ وہاں کے پنڈت وغیرہ انہیں ہوس کاری کا ذریعہ بنائے رکھتے ہیں۔ ہندوؤں نے آشرم بھی بنائے ہیں جن میں ان عورتوں کو رکھا جاتا ہے لیکن یہ آشرم عصمت فروشی کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔

بعض ہندو، بیوہ بیٹیوں کو اپنے گھروں میں ہی رکھتے ہیں لیکن اس طرح جیسے انہیں بالکل ہی دھتکار دیا گیا ہو۔ اس ہندو ساہوکار کی یہ بیٹی نوجوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس نے صرف سات آٹھ مہینے ازدواجی زندگی دیکھی اور اس کا خاوند مر گیا۔ باپ نے بتایا کہ وہ اس بیٹی کو کسی آشرم میں یا بنارس کے مندر میں چھوڑ آنا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی کے دل میں اس بیٹی کا اتنا پیار ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر سے نکالنا نہیں چاہتی۔

''اب میں اس لڑکی کو اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گا''۔۔۔ اس ہندو نے کہا۔۔۔ ''یہ اسی کی نحوست کا نتیجہ ہے کہ اتنا زیادہ مال چوری ہو گیا ہے۔ یہ تمام زیورات ان تین آدمیوں کے ہیں جنہوں نے قرضے کے عوض میرے پاس گروی رکھے تھے''۔

اس نے کہا کہ وہ اس لڑکی کو کسی آشرم میں داخل کرا آئے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بیوی نے لڑکی کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکی کھل گئی ہے اور اپنے آپ کو بیوہ سمجھتی ہی نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ یہ سن کر کہ اس گھر میں ایک لڑکی بیوہ ہے میں چونک پڑا تھا، میں اس لئے چونکا تھا کہ یہ ممکن ہے کہ اس لڑکی نے کسی مسلمان کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہو اور اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے بھاگ جانا چاہتی ہو اور دونوں نے یہ مال اسی مقصد کے لیے چوری کیا ہو۔ لڑکی نے اپنے دوست کو بتایا ہو گا کہ تجوری میں اتنا مال ہے اور تجوری کا تالا خراب ہونے کی وجہ سے آسانی سے کھل جاتا ہے اور وہ امرتسر جا رہے ہیں، اس دوران اس کا دوست یہ مال چوری کر لے۔

اس شک کے ساتھ ایک خیال یہ آیا کہ لڑکی نے اگر اس طرح گھر بھیدی کا کام کیا ہو گا تو اس نے اپنے دوست کو یہ کیوں نہ بتایا کہ فلاں صندوق میں اس سے زیادہ مال پڑا ہوا ہے!

پہلے تو خیال آیا کہ اس لڑکی کو اپنے پاس بٹھا لوں اور اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دوں کو مجھے اس پر شک ہے، یہ دیکھوں کہ لڑکی کیسی ہے یعنی چالاک اور ہوشیار ہے یا عام بیوہ لڑکیوں کی طرح مری مٹی ہوئی یا غمگین رہنے والی ہے لیکن میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ اسے شک ہو جائے گا کہ اس پر مجھے شک ہے۔ میرے پاس اور ذرائع موجود تھے جن سے میں اس لڑکی کے متعلق تمام معلومات لے سکتا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو گھر میں چلتے پھرتے

دیکھا تو میری رائے یہ ہوئی کہ لڑکی مردہ دل نہیں۔

بیوہ لڑکی مردہ دل نہیں، چالاک ہوشیار تھی

میں تھانے چلا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل انگلیوں کے لئے ہوئے نشان خاص کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ میرا ایک معزز مخبر اسی محلے میں رہتا ہے۔ یہ ان معززین میں شامل تھا جو تھانے میں تھانیدار کو ہر روز سلام کرنے کے لیے آنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ تھانیداروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ ہر گھر کی اور اپنے اپنے محلے کے ہر فرد کی پوری پوری خبر رکھتے تھے اور جب کبھی ضرورت پڑتی تو یہ تھانیدار کو پوری پوری معلومات بہم پہنچاتے تھے۔ میں نے اسے بلوایا اور وہ یوں تھانے پہنچا جیسے میرے بلاوے ہی منتظر تھا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا اور ایسا صاحب حیثیت کہ لوگ اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔

اسے یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔ اشارہ ہی کیا تھا کہ اس نے بولنا شروع کر دیا۔ تفصیلات سنانے کی ضرورت نہیں، اس سے جو کچھ پتہ چلا وہ یہ تھا کہ یہ بیوہ لڑکی جس کا نام میری ڈائری میں رادھا لکھا ہوا ہے، اس طرح آزادی سے اور ہنسی خوشی رہتی ہے جس طرح کوئی بیوہ لڑکی نہیں رہتی نہ اسے ہنسنے کھیلنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بڑی ہوشیار اور تیز طرار لڑکی ہے۔

مزید معلومات یہ تھیں کہ واردات والے گھر کے پڑوس میں مسلمانوں کا جو گھر تھا اس گھر کا ایک جوان بیٹا تھا۔ اس لڑکی کے دوستانہ مراسم اس لڑکے کے ساتھ تھے۔ میں اس لڑکے کا نام نسیم لکھوں گا جو اس کا اصلی نام نہیں اسے میں نے لڑکا لکھا ہے۔ وہ دراصل پچیس سال سے کچھ زیادہ عمر کا جوان آدمی تھا۔ وہ امرتسر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھا۔ ہفتے کے روز پچھلے پہر گھر آجاتا اور اتوار کی شام واپس چلا جاتا تھا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ نسیم کے رادھا کے ساتھ تعلقات تھے۔ میرے مخبر نے یہ بھی بتایا کہ نسیم نے اپنے دو تین دوستوں کو بھی بتا رکھا ہے کہ رادھا کے ساتھ اس کی ناجائز دوستی ہے۔ پتہ چلا کہ نسیم رات کو فصیل پھاند کر رادھا کے گھر کی چھت پر آجاتا تھا اور رادھا اتنی دلیر تھی کہ ان کی ملاقات اوپر کے ایک کمرے میں ہوتی تھی۔

میں نے اپنے مخبر سے پوچھا کہ نسیم کس ٹائپ کا آدمی ہے۔ مجھے جو جواب ملا وہ یہ تھا

کہ نسیم زندہ دل آدمی تھا اور کوئی ایسا بدمعاش نہیں تھا کہ بدنام ہوتا۔ لوگ اسے معزز گھر کا بیٹا سمجھتے تھے۔ ایک اور بات معلوم ہوئی جس سے مجھے نسیم اور رادھا پر پکا شک ہونے لگا۔ بات یہ تھی کہ دس بارہ سال پہلے نسیم کی منگنی اپنے ماموں کی بیٹی کے ساتھ کر دی گئی تھی لیکن اب نسیم اس لڑکی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے والدین کو اپنا یہ فیصلہ سنا کر پریشان کر رکھا تھا کہ یہ منگنی توڑ دی جائے۔

میں نے رادھا کو بڑی ہی اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ کوئی زیادہ خوبصورت لڑکی نہیں تھی، یہ کہہ لیں کہ شکل وصورت کچھ اچھی تھی اور اس کا رنگ ذرا گورا تھا۔ ایسی بات بالکل ہی نہیں تھی کہ کوئی دنیا جہان کو بھول کر اسی کا ہو کے رہ جاتا۔ میں نے معزز مخبر سے پوچھا کہ نسیم کی منگیتر شکل وصورت کے لحاظ سے کیسی ہے۔ اس نے بتایا کہ جیسی رادھا ہے ویسی ہی نسیم کی منگیتر ہے۔

یہ منگنی والی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ نسیم کو روپے پیسے کے ساتھ دلچسپی ہوگی۔ رادھا نے اسے بتایا ہوگا کہ وہ اسے بڑی زیادہ دولت دے سکتی ہے، وہ ذرا ہمت کرے۔ اپنے گھر کے مال دولت کا بتا کر نسیم سے کہا ہوگا کہ وہ وہاں سے چوری کر لے اور پھر دونوں کہیں بھاگ چلیں گے اور شادی کر لیں گے۔

میں نے اس مخبر سے اپنے مطلب کی ساری باتیں معلوم کر لیں۔ کچھ اس نے بغیر پوچھے بتائیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ نسیم کے دو تین دوستوں کو میرے پاس اس طرح بھیجے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ نسیم تو اس وقت امرتسر میں تھا..... میرا مخبر چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ واردات کسی پیشہ ور نے کی ہے یا کسی اناڑی نے۔ مجھے کوئی خاص کاریگری اور مہارت نظر نہیں آرہی تھی، البتہ یہ خیال آیا کہ کوئی پیشہ ور ڈکیت ہوتا تو وہ صندوق بھی کھول کر دیکھتا اور سب کچھ لے اڑتا۔ میں نسیم پر شک کرتا تھا لیکن یہ بتانا مشکل تھا کہ یہ چوری یا ڈکیتی کب اور کس وقت ہوئی۔ نسیم ہفتے کی شام آتا اور اتوار کی شام واپس چلا جاتا تھا۔ اگر یہ واردات اس نے کی تھی تو ظاہر ہے وہ مال اپنے ساتھ امرتسر لے گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے ضروری سمجھا کہ امرتسر جا کر نسیم کو دفتر سے پکڑا جائے اور اس کے گھر کی تلاشی لی جائے۔

میں نے اے ایس آئی کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔ اسے پوری واردات سنائی اور

سمجھائی اور رادھا اور نسیم کے متعلق بھی پوری باتیں سنائیں۔ میری ہدایت سننے سے پہلے ہی اس نے کہا کہ وہ امرتسر جا کر نسیم کو پکڑے گا اور جہاں کہیں وہ رہتا ہے وہاں کی تلاشی لے گا اور اسے یہاں لے آئے گا۔ میرا یہ اے ایس آئی ہندو تھا اور تجربہ کار پولیس افسر تھا۔ چونکہ وہ ہندو اور نسیم مسلمان تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ یہ اے ایس آئی پوری دلچسپی کے ساتھ اس کارروائی پر عمل کرے گا اور وہ نسیم کا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ اس نے ایک ہندو بیوہ لڑکی کے ساتھ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا اور ایک ہندو تاجر کے گھر چوری کی تھی۔ یہ ہندو مسلم عداوت تھی۔ ہندو تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے موقعے ڈھونڈتے رہتے اور موقعے پیدا بھی کرلیا کرتے تھے۔

میں نے اے ایس آئی کو مکمل ہدایات اور حکم دے دیا کہ وہ دو کانسٹیبل ساتھ لے لے اور امرتسر کو روانہ ہو جائے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ نسیم کی خانہ تلاشی میں کچھ برآمد ہو یا نہ ہو، اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ میں نسیم کو سب سے بڑا مشتبہ قرار دے کر تھانے میں پابند رکھنا چاہتا تھا۔

اے ایس آئی سے فارغ ہو کر اپنے جونیئر سب انسپکٹر کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ تمام مشتبہوں کو تھانے بلا کر تفتیش شروع کر دے۔ ان مشتبہوں میں جرائم پیشہ افراد شامل تھے۔ ان میں جو سزا یافتہ تھے ان کی انگلیوں کے نشان پھلور ریکارڈ پر تھے۔

ان جرائم پیشہ اور سزا یافتہ مجرموں سے تفتیش کا طریقہ ہم کچھ اور ہی اختیار کیا کرتے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ یہ لاتوں کے بھوت تھے جو باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ یہ ڈنڈے کی اور تشدد کی زبان سمجھتے تھے۔ سب انسپکٹر نے اسی وقت اس کارروائی پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

نسیم کے دو دوست آ گئے تھے۔ میں نے دونوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ انہیں بتایا کہ ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے اور میں ان سے جو کچھ بھی پوچھوں وہ بالکل صحیح بتا دیں ورنہ پولیس سے شہادت چھپانے کے جرم میں انہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اتنا سن کر وہ ڈر گئے۔ دونوں نے سچ بولنے کا وعدہ کیا، تب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ الگ الگ بیان دینا چاہیں گے یا اکٹھے ہی میرے پاس بیٹھنا پسند کریں گے۔

انہوں نے پوچھا کہ میں ان سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے بڑے صاف الفاظ

میں انہیں بتایا کہ میں رادھا اور نسیم کی دوستی کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔ دونوں نے بیک زبان کہا کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر ہی بات کریں گے۔ ایک نے کہا کہ اس میں راز والی کوئی بات نہیں۔ دونوں نے باری باری تصدیق کر دی کہ گذشتہ چھ سات مہینوں سے نسیم اور رادھا کی خفیہ ملاقاتیں چل رہی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس سے پہلے رادھا کی ایسی ہی دوستی ایک ہندو نوجوان کے ساتھ تھی لیکن رادھا اس سے معلوم نہیں کیوں متنفر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد رادھا نے نسیم کے ساتھ دوستی کر لی۔

نسیم اپنے ان دوستوں کو رادھا کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کی تفصیل سناتا رہتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رادھا کو وہ جہاں کہیں بھی آنے کا کہہ دے وہ جان پر کھیل کر وہاں پہنچے گی..... رادھا کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ عام قسم کی ہندو اور مسلمان لڑکیوں جیسی ڈرپوک نہیں۔ وہ تو ہر خطرہ مول لینے کو تیار رہتی تھی۔

''مجھے صرف ایک بات بتاؤ''۔۔۔ میں نے نسیم کے ان دونوں نوجوان دوستوں سے کہا۔۔۔ ''ذرا سی بھی غلط بیانی نہ کرنا..... نسیم اور رادھا یہاں سے بھاگ کر اور کہیں دور جا کر شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے؟''

''یہ صحیح نہیں!''۔۔۔ انہوں نے کہا۔۔۔ ''نسیم ہمیں صاف لفظوں میں بتا چکا ہے کہ رادھا اسے اکساتی رہتی ہے کہ یہاں سے بھاگ چلیں اور بہت دور کہیں جا کر شادی کر لیں گے۔ رادھا نے یہ بھی کہا کہ وہ گھر سے بہت ساری رقم اور زیورات ساتھ لے چلے گی لیکن نسیم یہ بات نہیں مان رہا۔ اس نے رادھا کو جھانسہ دے رکھا ہے کہ کسی بھی وقت وہ بھاگنے اور شادی کرنے کا ارادہ پورا کر سکتا ہے''۔

ان دونوں نے کچھ اور تفصیلی بات کر کے یہ بتایا کہ نسیم رادھا سے پیسے کھا رہا تھا، اگر نسیم کا ارادہ یہ ہوتا کہ رادھا کو ساتھ لے کر کہیں نکل جانا ہے تو وہ کبھی کا اس کا رادے پر عمل کر چکا ہوتا۔ انہوں نے بتایا کہ نسیم اسی پر خوش تھا کہ وہ ہندوؤں کی ایک لڑکی کو خراب کر رہا تھا اور اس سے پیسے کھا رہا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ نسیم میں اتنی عقل تھی کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ رادھا کو بھگا کر کتنی ہی دور کیوں نہ لے جاتا، ہندوؤں کو اور پولیس کو بھی اتنا سا سراغ تو ضرور ہی مل جاتا کہ رادھا کو نسیم لے گیا ہے۔ یہ دونوں پکڑے جاتے یا نہ پکڑے جاتے، ہندو نسیم کے پورے

خاندان کا بیڑہ غرق کر دیتے۔

نسیم کے ان دوستوں نے مجھ سے کچھ چھپایا نہیں اور باتیں بھی صحیح کیں لیکن میں نے ابھی ان پر اعتبار کر لینا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے سوچا کہ نسیم نے ان دوستوں کو رادھا کے ساتھ اپنے تعلقات تو سنا دیئے تھے لیکن ڈکیتی یا چوری ایک ایسا جرم ہے جو کوئی شخص اپنے کسی دوست کو نہیں بتاتا۔ یہ ممکن تھا کہ نسیم آخر ایک انسان تھا، رادھا کی باتوں اور اتنی زیادہ دولت کے لالچ میں آ گیا ہوگا اور اتنا زیادہ مال لے اڑا اور اب رادھا کو بھاگ کر اس کے پاس پہنچنا تھا۔

یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ رادھا کے گھر میں چھت کی طرف سے ہی اترا جا سکتا تھا۔ باہر کے دروازے کا تالا بند تھا۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ وہ چھت کی طرف سے اس گھر میں کس طرح اترا۔ ہو سکتا ہے رسہ لٹکا کر اترا ہو..... میرا اے ایس آئی امرتسر جانے کے لیے تھانے سے نکل گیا تھا۔

اصل بات اس ''لیکن'' کے پیچھے تھی

وہ رات گزر گئی۔ میرے جونیئر سب انسپکٹر نے رات کو ہی جرائم پیشہ مشتبہوں کو بلانا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے جو آئے ان سے اس نے تفتیش شروع کر دی تھی۔ اس تفتیش کو میں تفصیل سے بیان نہیں کروں گا کیونکہ یہ صرف سوال و جواب کا ہی طریقہ کار نہیں تھا۔

اگلے تین چار روز مخبر میرے پاس آتے رہے اور اپنی اپنی رپورٹیں دیتے رہے۔ کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی۔ انہی باتوں کی تصدیق ہوئی جو پہلے ہی مجھے معلوم ہو چکی تھیں۔ نسیم اور رادھا کی دوستی کا سب کو علم تھا۔

امرتسر وہاں سے بیس بائیس میل ہی دور تھا۔ اے ایس آئی اگلے روز پچھلے پہر چار بجے کے قریب نسیم کو ساتھ لئے امرتسر سے واپس آ گیا۔ اس نے نسیم کو ہتھکڑی نہیں لگائی تھی۔ نسیم وہاں ایک کمرے کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ اے ایس آئی نے وہاں کی تلاشی لی، کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ میں نے نسیم کو الگ بٹھا لیا۔

میں نے رادھا کے ساتھ اس کی دوستی کی بات کی تو اس نے بغیر پس و پیش تسلیم کر لیا کہ رادھا کے ساتھ اس کی دوستی ہے اور یہ دوستی شریفانہ نہیں۔ اس نے وہ ساری باتیں

میرے ساتھ بھی کیں جو اپنے دوستوں کو بتاتا رہتا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ رادھا سے وہ پیسے کھاتا تھا، اور یہ بھی کہ رادھا اسے کہتی تھی کہ اس کے گھر چوری کرے اور پھر دونوں یہ مال لے کر کہیں بھاگ جائیں گے۔ رادھا نے اسے کچھ دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ سب چھ سات دنوں کے لئے امرتسر جا رہے ہیں اور اس دوران نسیم آسانی سے چوری کر سکتا ہے۔

نسیم نے مجھے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ وہ رادھا کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا تھا کیونکہ اس سے اسے ذاتی مفاد ملتا تھا لیکن وہ ایسا خطرہ مول لینے کو بالکل ہی تیار نہیں تھا..... مجھے نسیم پر شک اس وجہ سے بھی پکا ہوتا تھا کہ اس نے اپنے ماموں کی بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ اس کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اپنی ماموں زاد کو وہ کیوں قبول نہیں کر رہا؟

''یہ لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی'' — نسیم نے جواب دیا — ''آپ میرے گھر والوں سے پوچھ لیں، میں نے یہ بات رادھا کی دوستی شروع ہونے کے بعد نہیں کہی بلکہ اپنی ماں کو میں نے اس وقت اپنا یہ فیصلہ سنا دیا تھا جب رادھا ابھی بیوہ نہیں ہوئی تھی اور رادھا کی طرف میرا ابھی دھیان ہی نہیں گیا تھا''۔

میں نے پہلے لکھا نہیں، نسیم کے دوستوں سے بھی میں نے یہ بات پوچھی تھی اور انہوں نے یہی جواب دیا تھا جو نسیم اب مجھے دے رہا تھا۔ اس کے باوجود میں ابھی نسیم کو بے گناہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ نسیم کو اگر میں نے شامل تفتیش کر لیا ہے اور اسے پولیس کی حراست میں تھانے لایا گیا ہے تو کیوں نہ رادھا کو بھی شامل تفتیش کروں۔ ایک توقع یہ بھی تھی کہ رادھا آخر عورت ذات ہے اور بدچلنی کی گناہگار بھی ہے اس لیے میں اس کے پاؤں جلدی اکھاڑ لوں گا۔

نسیم کو میں نے بتایا کہ اسے ایک دو دن تھانے میں پابند رہنا پڑے گا۔ اس نے قدرتی طور پر بہت ہی منت سماجت کی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں اس کوشش میں ہوں کہ اس واردات سے اس کا نام نکل جائے۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ رادھا کو ساتھ لے آئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد رادھا آ گئی۔ اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ وہ خاصا پریشان تھا کہ میں نے اس کی بیٹی کو کیوں بلایا ہے۔ نسیم کو میں نے کانسٹیبلوں کی بارک میں بھیج دیا تھا

اور ایک کانسٹیبل کی اس پر ڈیوٹی لگا کر کہا تھا کہ نسیم باہر نہ نکلے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ رادھا اور اس کا باپ اسے نہ دیکھ سکیں۔

میں نے پہلے رادھا کے باپ کو اپنے پاس بٹھا کر بہت تسلیاں دیں کہ وہ بیٹی کے متعلق ذہن میں کوئی پریشانی نہ رکھے لیکن وہ جاننا چاہتا تھا کہ رادھا کا اس واردات کے ساتھ کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ پولیس کا طریقۂ کار ہے جو ضروری نہیں کہ ہر کسی کو بتایا جائے۔

''لیکن مہاراج!'' — رادھا کے باپ نے کہا — ''اس میں میری بڑی بے عزتی ہے۔ لوگ پوچھیں گے کہ میری بیٹی کو تھانے کیوں بلایا گیا تھا''۔

''مجھے اپنی عزت زیادہ پیاری ہے لالہ جی!'' — میں نے کہا — ''میں اگر دوسروں کی عزت بے عزتی دیکھ کر کسی ضروری فرد کو شاملِ تفتیش نہ کروں تو میں اپنا فرض پورا نہیں کرسکتا اور اس کے نتیجے میں میرے اوپر کے آفیسر مجھ سے جواب طلبی کریں گے۔ اگر آپ کو اپنی عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو یہ لکھ کر دے دیں کہ آپ کے گھر میں ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی''۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اس کی بیٹی کی عزت کا پورا پورا خیال رکھوں گا لیکن صرف تھانے کے اندر۔ وہ میری باتوں سے مطمئن تو نہ ہوا جس کا مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اسے چلتا کیا اور رادھا کو اپنے پاس بلایا۔ ظاہر ہے کہ وہ ڈری ہوئی اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے بتایا کہ اس کی کوئی بات مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں اور وہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرے۔ مجھے اس کے جذبات سے پوری طرح واقفیت تھی۔ وہ بیوہ تھی اور اپنے گھر میں دھتکاری ہوئی تھی۔ میں نے اس کے مطابق اس کے ساتھ ایسی باتیں شروع کردیں جن کا تعلق واردات کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی ذات اور اس کے جذبات کے ساتھ تھا۔

میں نے ہندوؤں کی اس رسم کو بڑا ہی ظالمانہ کہا کہ بیوہ کو دوسری شادی نہیں کرنے دی جاتی۔ میری ان باتوں سے وہ اتنی متاثر ہوئی کہ اس کے چہرے سے گھبراہٹ ختم ہوگئی اور وہ باتیں کرنے کے موڈ میں آگئی۔ میں نے اپنے تجربے اور استادی اور چرب زبانی کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے اور زیادہ کھول لیا۔ اس کی جھجک ختم ہوگئی۔

''خدا کا شکر ہے'' — میں نے جذباتی سے لہجے میں کہا — ''کہ مسلمانوں میں

ایسی بدعت نہیں۔ تم جیسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی بیوہ ہوجائے تو اس کے ساتھ شادی کرنے والوں کی قطار لگ جاتی ہے اور لڑکی کے والدین کسی اچھے لڑکے کو پسند کر کے لڑکی کی شادی کردیتے ہیں۔ صرف تین مہینے انتظار کرنا پڑتا ہے جسے ہمارے مذہب میں عدت کہا جاتا ہے''۔

''مجھے معلوم ہے'' — رادھا نے کہا — ''میں نے تو مسلمان ہوجانے کا فیصلہ کرلیا ہے لیکن.....''

وہ چپ ہوگئی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اصل بات جو مجھے درکار تھی وہ اس لیکن کے بعد شروع ہونی تھی مگر وہ اس بات کو زبان سے واپس دل میں لے گئی۔ میری اس وقت ضرورت یہ تھی کہ اس لڑکی سے مجھے کوئی سراغ یا اشارہ مل جائے لیکن میرے دل کی بات سنیں تو یہ تھی کہ اس لڑکی کے ساتھ مجھے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ میں حیران تھا اور ہندوؤں پر مجھے غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ کس بے دردی سے اس عمر اور اس شکل وصورت کی لڑکیوں کی زندگی تباہ کردیتے ہیں، ان کے جذبات کا خون کردیتے ہیں اور پھر ان کے لیے ایسی جذباتی صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے کہ یہ اپنی جسمانی تسکین کے ناجائز ذریعے پیدا کرلیتی ہیں۔ ہندوؤں میں دراصل انسانیت مکمل نہیں ہوتی، اس کی بجائے درندگی ان کی فطرت میں شامل رہی ہے اور ابھی تک شامل ہے۔

ہندو جہاں بھی جاتا ہے وہاں اپنی اس درندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگست 1947ء میں ہندوؤں نے اپنے ملک میں مسلمانوں کو جس بے دردی سے قتل کیا تھا اس کی کہانیاں آپ ''حکایت'' میں پڑھتے رہتے ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کو بھی ان ہندوؤں نے برچھیوں سے مارا تھا۔ کشمیر میں دیکھ لیں، ہندو مسلمانوں کو زندہ جلا رہا ہے۔ یہ سب درندگی کے مظاہرے ہیں۔ ایسی درندگی میں بہادری نہیں ہوا کرتی بلکہ اسے بزدلی کہتے ہیں۔

میں اصل کہانی کو کسی اور طرف لے گیا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں نے ہندوؤں کی درندگی کے یہ مظاہرے اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ ذرا سے اشارے پر یہ سب یاد آجاتے ہیں اور جی میں آتی ہے کہ اپنی ابھرتی ہوئی نسلوں کو تفصیل سے بتاؤں کہ ہندو اصل میں کیا ہے اور مسلمان کے لیے ہندو انسان نہیں بلکہ درندہ ہے۔

وہ ہندو جو اپنی بیوہ بیٹیوں کو اجاڑ کر ہوس کار پنڈتوں کے حوالے کردیتا یا انہیں

بدکاری کی راہ پر ڈال دیتا ہے، مسلمانوں کا دوست یا ہمدرد ہو ہی نہیں سکتا۔

میں رادھا کی بات سنا رہا تھا لیکن وہ اصل بات پر آئی تو چپ ہو گئی۔ میں نے اسے اکسایا کہ وہ بات پوری کرے۔

''ڈرتی ہوں''۔۔۔ رادھا نے کہا۔۔۔ ''آپ تھانیدار ہیں، آپ کو میرے ساتھ کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میرے پتا کو پتہ چل جائے گا اور مجھے مارے پیٹے گا اور پھر بنارس یا کسی آشرم میں چھوڑ آئے گا۔ وہ ایسی بات کہہ بھی چکا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ چوری میری نحوست کی وجہ سے ہوئی ہے''۔

میں نے اسے اپنی زبان کا جادو چلا کر شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ میں اسے یقین دلا رہا تھا کہ میرے دل میں اس کی ہمدردی ہے اور وہ میرے ساتھ جو بھی بات کرے گی وہ اس کمرے میں سے باہر نہیں جائے گی اور میں اس کی ہر بات کو راز میں رکھوں گا۔

''میری یہ بات مان لو رادھا!''۔۔۔ میں نے آخر میں کہا۔۔۔ ''تمہارے ساتھ بات کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو تھانیدار نہیں سمجھ رہا۔ دل کی ہر بات میرے ساتھ کرو، ہو سکتا ہے میں تمہاری بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دوں''۔

مجھے وہ وقت آج بڑی اچھی طرح یاد ہے بلکہ یوں کہہ لیں کہ وہ مجھے آج بھی اپنے سامنے بیٹھی نظر آ رہی ہے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے سوچا کہ اس پر آخری ضرب لگا ہی دوں تو یہ دل کی بات اگل دے گی۔

''سنو رادھا!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں جانتا ہوں کہ اپنے پڑوسی نسیم کے ساتھ تمہاری ناجائز دوستی ہے اور اس کے ساتھ تمہاری ملاقاتیں تمہارے گھر کے اوپر والے کمرے میں ہوتی ہیں..... نسیم سے پہلے تمہاری ایسی ہی دوستی ایک اور آدمی کے ساتھ تھی۔ کہو تو اس کا نام بھی بتا دوں''۔

لڑکی سے دوستی مان لی واردات نہیں

رادھا نے چونک کر سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی باتیں جنہیں لوگ راز کی باتیں یا ڈھکی چھپی باتیں سمجھتے ہیں، معلوم کر لینا پولیس کے لیے کوئی مشکل کام

نہیں۔ چار دیواری کے اندر کی باتیں بڑی آسانی سے تھانے تک پہنچ جایا کرتی ہیں۔

''تمہارا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا''۔۔۔ میں نے پیار اور بے تکلفی کے لہجے میں کہا۔۔۔ ''ڈرو اور گھبراؤ نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ہمدردی اور بہتری کی توقع رکھو۔ میں جانتا ہوں تم نے نسیم کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا بڑا پکا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اگر یہ چوری نسیم نے تمہارے کہنے پر کی ہے تو مجھے صاف بتا دو تاکہ میں تفتیش کو کسی اور طرف لے جاؤں اور نسیم کو بے گناہ قرار دے دوں''۔

اس نے کہا کہ نسیم تو امرتسر رہتا ہے۔ میں نے اس کی تائید میں کہا کہ میں جانتا ہوں وہ امرتسر میں نوکری کر رہا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اس کی زبان پر نہیں آ رہے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اصل بات چھپانے کی کوشش میں ہے۔

''تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم یہ تو ضرور مانو گی کہ نسیم کے ساتھ تمہاری درپردہ دوستی ہے۔ اگر تم انکار کرو گی تو یہ نسیم کے لئے اچھا نہیں ہوگا اور یہ بات عدالت تک پہنچ جائے گی پھر تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہاری کتنی بے عزتی اور بدنامی ہوگی''۔

اس نے دبی دبی سی زبان میں اقرار کر لیا کہ نسیم کے ساتھ اس کی دوستی ہے۔ میں نے اس بات کو اپنے انداز سے آگے چلایا تو اس نے یہ بھی مان لیا کہ نسیم کو اس نے کہا تھا کہ اس کے گھر سے مال چوری کرے پھر وہ نسیم کے ساتھ گھر سے بھاگ چلے گی اور ہندوستان میں کہیں دور جا کر رادھا مسلمان ہو جائے گی پھر دونوں شادی کر لیں گے اور نئی زندگی بنائیں گے۔

''پھر نسیم نے چوری کی یہ واردات کی''۔۔۔ میں نے کہا۔

''میں یہ نہیں بتا سکتی''۔۔۔ رادھا نے کہا۔۔۔ ''ہم امرتسر سے واپس آئے تو تجوری ٹوٹی ہوئی دیکھی۔ چار پانچ دن گزر گئے ہیں۔ نسیم کے ساتھ میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر یہ چوری اس نے کی ہوتی تو وہ ان دنوں امرتسر سے آتا اور مجھے ضرور بتاتا۔ یہ جو سنیچر گزر گیا ہے، نسیم گھر آیا تھا لیکن میرے ساتھ ملاقات نہیں ہو سکی کیونکہ مجھ پر باپ نے نظر رکھ لی تھی۔ نسیم اتوار کی شام واپس چلا گیا تھا۔ ایسی بات ہوتی جو آپ پوچھ رہے ہیں تو وہ چھت پر آ کر دور سے مجھے اشارہ ہی کر دیتا یا کسی نہ کسی ذریعے سے مجھے بتا دیتا کہ اس نے یہ کام کر دیا ہے اور اب میں بھاگ چلنے کے لیے تیار رہوں''۔

میں نے اس کے ساتھ بہت جرح کی، اس کی ہر بات میں سے بات نکال کر کئی سوال کیے لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ اسے معلوم نہیں کہ یہ چوری نسیم نے کی ہے۔ میرے لئے اس کا مطلب یہ تھا کہ نسیم میری نظروں میں مشتبہ تھا لیکن اس یقین کے بغیر کہ یہ واردات اس نے کی ہے۔

رادھا نے میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے منت سماجت کے لہجے میں کہا کہ میں نسیم کے ساتھ اس کی دوستی کی بات اس کے باپ تک نہ پہنچنے دوں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھ سے باتیں چھپا رہی ہے اور مجھ سے رازداری کی توقع رکھتی ہے۔ یہ بات سن کر وہ رو پڑی۔ وہ کہتی تھی کہ اسے معلوم نہیں۔

''ایک بات بتاؤ''— میں نے کہا— ''تم نے نسیم سے کہا تھا کہ وہ تمہارے گھر سے مال چوری کرے، کیا نسیم نے تمہیں یقین سے کہا تھا کہ وہ یہ کام کرے گا؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے''— رادھا نے جواب دیا— ''میں جب بھی اسے یہ بات کہتی تھی وہ ہنس کر کہتا تھا کہ یہ واردات کرے گا لیکن اس کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے وہ میری بات پر پورا دھیان نہیں دے رہا''۔

''کیا وہ تم سے پیسے لیتا رہتا تھا؟''— میں نے پوچھا۔

''ہاں!''— رادھا نے جواب دیا— ''ہر ملاقات پر وہ مجھ سے سوڈیڑھ سو روپیہ مانگتا تھا جو میں اسے دے دیتی تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ اس نے پیسے نہ مانگے پھر بھی میں نے اسے کچھ رقم دے دی''۔

''ایک بات پر غور کرو رادھا!''— میں نے اس کے دل میں نسیم کے خلاف شک پیدا کرنے کی نیت سے کہا— ''اگر میں کہوں کہ نسیم تمہیں دھوکہ دیتا رہا ہے اور اس کی دلچسپی تمہارے جسم کے ساتھ اور اس رقم کے ساتھ تھی جو تم اسے دیتی رہتی تھیں، تو تم کیا کہو گی؟''

اس نے سوچ سوچ کر اور رک رک کر ایسا جواب دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی نہ کوئی رائے دے سکتی ہے کہ نسیم اس کے ساتھ مخلص تھا یا نہیں۔ میں نے اسے نسیم کے خلاف کرنا شروع کر دیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ رادھا کے دل میں نسیم کے خلاف فریب کاری کا شک پیدا ہو جائے۔ میں اس کی زبان سے یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ یہ

واردات نسیم نے کی ہے۔

''یہ بھی سوچو رادھا!''— میں نے کہا— ''ہو سکتا ہے یہ چوری نسیم نے کی ہے اور تمہیں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ تم نے اسے بتایا تھا کہ تجوری کا تالا خراب ہے اور عام سی تار کے ساتھ بھی کھل جاتا ہے۔ نسیم کے لیے یہ واردات بہت آسان تھی۔ وہ چھت سے اترا، کمرے کا تالا توڑا اور جس طرح تم نے اسے بتایا تھا اس نے تار سے تجوری کا تالا کھول لیا اور مال لے گیا۔ یہ واردات اس وجہ سے بھی آسان تھی کہ گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ اب تم اسے بچانے کی سوچ رہی ہو لیکن تم اس طرف دھیان نہیں دے رہیں کہ نسیم نے سارا مال ہضم کر لیا ہے اور اب تمہارے ساتھ تعلق توڑ لے گا۔ تم خود کہہ رہی ہو کہ نسیم گھر آیا تھا اور چھت پر آ کر اس نے اشارہ تک نہیں دیا کہ یہ کام کر دیا ہے اور اب تم بھاگ چلنے کی بات کرو''۔

''میری عقل تو کام نہیں کرتی''— رادھا نے کہا— ''کسی کے دل کا بھید جان لینا بڑا ہی مشکل ہے۔ یہ تو میں جانتی ہوں کہ نسیم مجھ سے پیسے کھاتا رہا ہے اور مجھے یہی لالچ دیتا رہا ہے کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے گا اور میرے ساتھ شادی کر لے گا''۔

اس طرح کچھ اور باتیں کر کے میں نے رادھا کے دل میں نسیم کے خلاف شک پیدا کر دیا لیکن رادھا یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی کہ یہ چوری نسیم نے کی ہے۔ مجھے کچھ یقین ہو چلا تھا کہ رادھا جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لڑکی کوئی سیدھی سادی لڑکی نہیں، اس میں چالاکی اور ہوشیاری تھی اور وہ ہر بات پورے اعتماد کے ساتھ کرتی تھی لیکن ایک تھانیدار کو وہ گمراہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے تو اپنے آپ کو پوری طرح میرے حوالے کر دیا تھا۔ میرے بولنے کے انداز میں دھمکی یا پولیس والا رعب اور دبدبہ نہیں تھا بلکہ میرا رویہ ہمدردانہ اور پیار والا تھا۔ آخر میں آ کر جب وہ بہت ہی پریشان ہو گئی تو اس نے واضح طور پر مجھے ایسے اشارے دیئے جیسے وہ اپنا آپ مجھے پیش کر رہی ہو اور اس کے عوض یہ چاہتی ہو کہ میں اس کے اس سارے بیان پر پردہ ڈالے رکھوں۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کس بات سے ڈر رہی ہے۔ ڈر یہ تھا کہ یہ پتہ چل گیا کہ یہ واردات نسیم نے کی ہے تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آ جائے گی کہ یہ واردات رادھا نے کروائی ہے اور رادھا کا دوستانہ نسیم کے ساتھ ہے۔ رادھا نے اپنا یہ ڈر مجھے صاف الفاظ

میں بتا دیا۔ میں نے بڑی نیک نیتی سے اسے مطمئن کیا کہ وہ مجھ سے کسی دھوکے کی توقع نہ رکھے۔

اتنا زیادہ وقت گزر گیا تھا کہ رادھا کے چہرے کا اتنا اچھا چھا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور اب تو وہ بولتی تھی تو اسے بولنے میں بھی دشواری محسوس ہوتی تھی۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے دفتر سے نکلی تو اس کا باپ اندر آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا باتیں ہوئیں۔ میں نے گول مول سی باتیں بتا کر اسے چلتا کیا۔

رادھا اور اس کے باپ کے جانے کے بعد میں نے نسیم کو اپنے پاس بلوایا۔ وہ جب میرے سامنے آیا اس وقت رادھا اپنے باپ کے ساتھ تھانے کے احاطے کے بڑے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں نے نسیم سے کہا کہ وہ باہر گیٹ کی طرف دیکھے۔ اتفاق سے عین اس وقت رادھا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''جانتے ہو وہ لڑکی کون ہے؟''— میں نے نسیم سے پوچھا— ''اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ جو آدمی اس لڑکی کے ساتھ جا رہا ہے وہ کون ہے''۔

نسیم نے رادھا کے باپ کا نام لے کر کہا کہ وہ اسے جانتا ہے لیکن اس لڑکی کو نہیں جانتا۔ اس نے اتنا ہی کہا شاید اس کی بیٹی ہے۔

''وہ تمہاری ماں رادھا ہے''— میں نے طنز اور غصے کے لہجے میں کہا— ''اور تم اسے اچھی طرح جانتے ہو اور اسی کے کہنے پر تم نے اس کے گھر ڈکیتی کی واردات کی ہے اور تجوری خالی کر دی ہے''۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ نسیم میرے سامنے کھڑا تھا۔ ابھی میں نے اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ میری بات سن کر اس نے اس طرح بدک کر میری طرف دیکھا جیسے کسی نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کا ننگا تار لگا دیا ہو۔ اس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

''تم نے بسم اللہ جھوٹ سے کی ہے''— میں نے کہا— ''میرا خیال تھا کہ تم مسلمان ہو اور میں مسلمان کی حیثیت سے تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا لیکن تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو''۔

''نہیں جناب!''— اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے ابھی رو پڑے گا— ''مجھے بولنے کا موقع دیں۔ میں نے یہ واردات نہیں کی۔ معلوم نہیں آپ کس شہادت کی بنا پر مجھ

پر یہ الزام عائد کر رہے ہیں''۔

''میں تمہیں بولنے کا پورا موقع دوں گا''— میں نے کہا— ''لیکن یہاں جھوٹ نہیں چلے گا..... بیٹھ جاؤ''۔

وہ بیٹھ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بولے، خواہ جھوٹ ہی بولے۔ جھوٹ سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ شخص کس پوزیشن میں ہے اور کیا یہ جھوٹ بول رہا ہے یا اس میں کچھ سچ بھی ہے۔ یہ تو اسے پہلے بتا چکا تھا کہ میں اس کے متعلق تمام معلومات لے چکا ہوں اور اس کی اور رادھا کی دوستی کو بھی جانتا ہوں اور اس کے لیے جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

''..... اور تم نے دیکھ لیا ہے''— میں نے آخر میں کہا— ''رادھا یہاں سے گئی ہے اور وہ تین گھنٹے میرے پاس رہی ہے۔ اس کے باپ کو میں نے باہر بٹھائے رکھا تھا۔ رادھا نے کوئی پردہ نہیں رہنے دیا..... سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ چھ سات سالوں کے لیے جیل میں بند ہو جاؤ گے''۔

اس نے بولنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ کہا کہ یہ واردات اس نے نہیں کی۔ وہ بول رہا تھا اور میں اس کی بات سے بات نکال کر کچھ نہ کچھ پوچھتا بھی جا رہا تھا اور اسے بتا بھی رہا تھا کہ میں یہ بات پہلے سے جانتا ہوں۔

اس طرح اس نے ایک تو یہ تسلیم کر لیا کہ رادھا کے ساتھ اس کا ناجائز دوستانہ تھا۔ دوسری بات یہ تسلیم کی کہ رادھا اسے اس کے گھر چوری کرنے سے اکساتی تھی اور رادھا کو خوش کرنے کے لیے اس کی بات مان لیتا تھا لیکن اس کا یہ واردات کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

میں نسیم کے بیان کو مختصر کر دیتا ہوں۔ اس نے یہ بھی مان لیا کہ وہ رادھا سے پیسے کھاتا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی دلچسپی رادھا کے ساتھ محض جسمانی تھی اور دوسری دلچسپی ان پیسوں کے ساتھ جو وہ اس سے لیتا رہتا تھا۔ وہ ایسا خطرہ مول لینے کو تیار ہی نہیں تھا کہ ڈکیتی کی واردات کرتا اور رادھا کو بھی بھگا کر لے جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ رادھا کے ساتھ وہ بھی شہر سے غیر حاضر ہو گا تو پولیس سمجھ جائے گی کہ رادھا اسی کے ساتھ گئی ہے اور رادھا کے گھر کا مال بھی اسی کے ساتھ گیا ہے۔ ایک تو پولیس کا ڈر کہ پولیس اسے ڈھونڈ نکالے گی اور رادھا کا باپ ہندوؤں کو ساتھ ملا کر نسیم کے گھر والوں سے انتقام لے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندو مسلمانوں سے کس طرح انتقام لیا کرتے ہیں۔

امرسر میں نسیم جہاں رہتا تھا وہاں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا تھا کہ نسیم نے اپنے ماں باپ کے گھر میں مال رکھا ہوگا۔ مجھے مخبروں نے بتایا تھا کہ یہ شریف اور معزز خاندان ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کر رہا؟......
میں نے یہ بات رادھا سے بھی پوچھی تھی اور نسیم سے بھی پہلے پوچھ چکا تھا۔ یہ میرا طریقۂ تفتیش تھا کہ ایک بات کئی بار پوچھتا تھا۔ رادھا نے جواب دیا تھا کہ نسیم اسے کہتا تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنی منگنی تڑوا رہا ہے لیکن نسیم نے مجھے یہ بتایا کہ ماموں کی بیٹی اسے اچھی نہیں لگتی۔ ایک تو اس کی شکل وصورت واجبی سی ہے، قد چھوٹا ہے اور جسم موٹا اور بے ڈھب سا ہے۔

نسیم نے ماموں زاد کے ساتھ شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی کہ امرتسر میں ایک بڑی شریف فیملی ہے جس کے ساتھ اس کے مراسم پیدا ہو گئے ہیں۔ اس گھرانے کا ایک نوجوان نسیم کے ساتھ ڈی سی آفس میں ملازم تھا۔ اس کے ساتھ نسیم کی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اپنے اس دوست کے گھر آتا جاتا تھا۔ اس دوست کی بہن شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ یہ لڑکی اسے اچھی لگی اور نسیم اس لڑکی کے والدین کو اچھا لگا اور اشاروں اشاروں میں یہ بات طے ہو گئی کہ وہ لوگ اپنی بیٹی نسیم کو دینے پر تیار تھے۔

''میں آپ کو ایڈریس دیتا ہوں''۔۔۔ نسیم نے کہا ۔۔۔ ''آپ امرتسر جا کر اس گھرانے میں جائیں اور پوچھیں میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ۔ میں نے ابھی صرف اپنی ماں کو بتایا ہے کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا اور آپ چل کر دیکھ لیں۔ میں نے ابھی اپنے باپ اور بھائیوں کو نہیں بتایا۔ یہ گھرانہ بھی اچھا ہے اور لڑکی میری پسند کی ہے''۔

میں نے اسی وقت جب نسیم کو امرتسر سے تھانے لائے تھے، کہہ دیا تھا کہ اس کی انگلیوں کے نشان لے لئے جائیں اور فنگر پرنٹ بیورو پھلور بھیج دیئے جائیں۔ نشانات لے لئے گئے تھے اور ایک کانسٹیبل یہ نشانات لے کر پھلور کو روانہ ہو گیا تھا۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ ڈکیتی کی یہ واردات کوئی معمولی واردات نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس واردات کے ارتکاب کے لیے ایسی سہولتیں موجود تھیں کہ کوئی بھی شخص یہ واردات آسانی سے کر سکتا تھا لیکن ان سہولتوں سے واردات کی سنگینی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی کو آسانی سے قتل کر دینے سے ایسا نہیں ہوتا کہ قاتل کو سزائے موت یا عمر قید

نہیں ملے گی۔ نسیم کو ڈکیتی کی اس واردات کی سنگینی کا اور پکڑے جانے کی صورت میں سزا کا احساس تھا۔ ایسی واردات کوئی جرائم پیشہ شخص ہی کر سکتا تھا یا کوئی بڑبولا اور ''اوچھا عاشق'' جو فلمی بڑھکوں کا عادی ہوتا۔ ایسے اشخاص نتائج سے بے خبر پھونک میں (عموماً کسی عورت کی پھونک میں) آ کر اس سے بھی زیادہ سنگین واردات کر گزرتے ہیں۔

میں نے نسیم کو ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ اس کے دوستوں سے بھی اس کے کردار کے متعلق سب کچھ پوچھا تھا۔ اپنے مخبروں سے بھی بہت کچھ معلوم کیا تھا۔ کسی ایک نے بھی ایسی بات نہیں کہی تھی کہ نسیم بدمعاش یا بدکردار آدمی ہے اور اس کا دوستانہ بدمعاشوں یا مشکوک قسم کے لوگوں کے ساتھ ہے۔ سب نے اسے ایک شریف گھرانے کا فرد کہا تھا۔ رادھا کے ساتھ ناجائز دوستی رکھنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی واردات بھی کر سکتا تھا۔ ایسی دوستیاں تو بڑے اچھے گھرانوں کے آدمی بھی لگا لیتے تھے۔

میں نے یہ جو رائے دی ہے یہ نسیم کے حق میں جاتی ہے لیکن میں اتنا کچا نہیں تھا کہ اسے اس واردات سے بری الذمہ قرار دے کر چھوڑ دیتا۔ اس پر میرا شک ابھی قائم تھا۔ ایک بات ذہن میں آئی تھی کہ امرتسر سے یہ معلوم کیا جائے کہ نسیم کی وہاں زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ ہو سکتا تھا وہ جوا یا ریس کھیلتا ہو، طوائف بازی یا شراب نوشی کرتا ہو اور اسے رقم کی ضرورت رہتی ہو۔

میں یہ کام امرتسر کے کسی تھانیدار سے کروا سکتا تھا لیکن ابھی مجھے پھلور سے انگلیوں کے نشانات کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ ویسے بھی میں ابھی نسیم کو فارغ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی بھی وقت کوئی شہادت آ سکتی تھی۔ میں نے نسیم کو پھر کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔

ایک ڈاکو ایک طوائف

تھانوں میں ایسے نہیں ہوتا تھا کہ ایک ہی واردات کے پیچھے پڑے رہتے۔ کئی تفتیشیں چل رہی ہوتی تھیں اور تھانے کے اور بھی کئی کام ہوتے تھے۔ عدالتوں میں جو کیس چلتے تھے ان میں گواہی دینے یا گواہوں کو پیش کرنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ پورا پورا دن نکل جاتا تھا۔

تین دن اور گزر گئے۔ نسیم منتیں کرتا تھا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ میں اسے کہتا تھا کہ

اللہ کا شکر ادا کرے کہ میں نے اسے مہمانوں کی طرح رکھا ہوا ہے ورنہ تھانے میں مشتبہ کے ساتھ کوئی اور ہی سلوک کیا جاتا ہے جو مشتبہ باقی عمر یاد رکھتا ہے۔

اس وقت یہ سلوک ان مشتبہوں کے ساتھ ہو رہا تھا جو جرائم پیشہ یا سزا یافتہ تھے اور میرا جونیئر سب انسپکٹر اس واردات کے سلسلے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اتنے زیادہ دن گزر گئے تھے لیکن کسی ایک نے بھی اقبال جرم نہیں کیا تھا۔ سب لاعلمی کا اظہار کرتے تھے۔

ایک روز ایک پیشہ ور ڈاکو میرے پاس آیا۔ وہ اس قصبے سے تقریباً پانچ میل دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں نے اپنی کہانیوں میں پہلے بتایا ہے کہ ہمارے وقتوں میں باقاعدہ پیشے ہوا کرتے تھے جن میں ڈکیتی اور ڈاکہ زنی بھی پیشے تھے۔ ڈاکوؤں کو لوگ جانتے تھے کہ یہ ڈاکو ہیں لیکن اپنے اپنے گاؤں میں وہ باعزت زندگی بسر کرتے اور دوسروں کی عزت کرتے تھے۔ آج ان ڈاکوؤں کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے۔ آج تو جسے دیکھو وہ ڈاکو ہے۔

یہ تو بڑا اچھا موضوع ہے جس پر بات مکمل طور پر اگر نہ کی جائے تو کسی کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ اس ڈاکو کا نام فرقان علی تھا لیکن فرقا کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے ساتھ میری بڑی اچھی سلام دعا تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے پتہ چلا تھا کہ ایک ہندو ساہوکار کے گھر تجوری ٹوٹی ہے اور خاصا مال نکل گیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بہت سے مشتبہ تھانے بٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں میرے ساتھ بات کرنے آیا تھا۔

''ملک صاحب!''— فرقا نے کہا— ''آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ ڈکیتی کی یہ واردات کسی پیشہ ور نے ہی کی ہوگی۔ کوئی اور بھی تو یہ واردات کر سکتا ہے''۔

اس وقت کے ڈاکو قانون سے بھی کسی حد تک واقف تھے اور پولیس کی تفتیش اور تفتیشی کارروائیوں سے نہایت اچھی طرح واقف تھے۔ وہ بڑے ہی ذہین لوگ ہوا کرتے تھے۔ میں نے ایسا نہیں سوچا کہ اس شخص کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتا کہ یہ تو ڈاکو ہے اسے میری عقل، اتھارٹی اور تجربے تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی بلکہ میں نے چاہا کہ اس شخص کے ساتھ پوری بات کروں اور یہ مجھے اپنا کوئی مشورہ دے یا کوئی نئی بات ہی بتا دے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

اس نے بتایا کہ امرتسر میں ایک ذرا اونچے درجے کی طوائف کے ساتھ اس کے

تعلقات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طوائف کو وہ مال کھلاتا رہتا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ وہ تین چار روز پہلے امرتسر اس طوائف کے ہاں گیا تو طوائف اس کے لئے باہر نہ نکلی۔ وہ تو اس ڈاکو کا نام سنتے ہی دوڑ کر باہر آ جایا کرتی تھی لیکن اس روز طوائف نے اندر سے پیغام بھیج دیا کہ اس کے پاس مہمان آئے ہوئے اس لئے فرقا دوسرے کمرے میں انتظار کرے۔ فرقا نے اس میں اپنی توہین سمجھی وہ طوائف کے انتظار میں بیٹھ تو گیا لیکن غصے سے بھرا ہوا تھا۔

یہ کوئی عام قسم کی طوائف نہیں تھی بلکہ اس درجے سے تعلق رکھتی تھی جس درجے کی طوائفوں نے دو چار مستقل گاہک بنا رکھے ہوتے تھے۔ ہر کوئی ان تک ذرا مشکل سے ہی پہنچ سکتا تھا۔ مشکل یہ کہ یہ بہت ہی مہنگی ہوتی تھیں، کوئی امیر زادہ ہی انہیں پوری اُجرت ادا کر سکتا تھا۔

فرقا نے مجھے بتایا کہ کچھ دیر بعد تین نوجوان لڑکے طوائف کے خاص کمرے سے نکلے اور رخصت ہو گئے۔ طوائف فرقا سے ملی۔ فرقا نے اسے گالی گلوچ کی اور کہا کہ یہ نئے لونڈے کہاں سے لا کر اس نے اپنے پاس بٹھا لئے تھے؟ طوائف ہنس پڑی اور فرقا کو بتایا کہ یہ کوئی نئے امیر زادے ہیں جو آج دوسری مرتبہ آئے ہیں۔

فرقا کے بیان کے مطابق طوائف نے اسے بتایا کہ چار پانچ روز پہلے یہ تین لڑکے آئے تو طوائف نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کہا کہ وہ بازار میں بیٹھی ہوئی گھٹیا سی طوائفوں کے گاہک نہیں اور نہ ہی وہ اس بازار میں کبھی آئے ہیں۔ وہ کسی بڑی ہی اچھی اور اچھے درجے کی طوائف کی تلاش میں تھے۔ پھر بھی طوائف نے انہیں طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ کر کے ٹالنے کی کوشش کی تو ایک لڑکے نے جیب سے سونے کی ایک وزنی انگوٹھی نکالی اور طوائف کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ایک انگلی میں ڈال دی۔ دوسرے نے سونے کے جھمکوں کی ایک جوڑی نکالی اور طوائف کو پیش کی اور تیسرے نے سونے کی ایک زنجیر نکال کر طوائف کے گلے میں ڈال دی۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ زیورات اپنے کسی آدمی کو دے کر کسی سنار کے پاس بھیج دے اور وہ بتائے کہ یہ خالص سونے کے ہیں یا نقلی ہیں۔ طوائف نے ایسے ہی کیا۔ اس نے سوچا کہ یہ چھوکرے سے ہیں، نقلی چیزیں ہی نہ اٹھا لائے ہوں۔ اس نے تینوں چیزیں اپنے ایک آدمی کو دے کر سنار کی طرف بھیج دیا اور لڑکوں کو باتوں میں لگا لیا۔ لڑکوں

نے طوائف کو اتنے پیسے پیش کیے جو کوئی امیر زادہ ہی پیش کر سکتا تھا۔ وہ آخر طوائف تھی، اتنے زیادہ پیسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے پیسے لے لئے۔ کچھ دیر بعد طوائف کا آدمی آیا اور اس نے طوائف کو بتایا کہ یہ خالص سونے کے زیورات ہیں۔ طوائف نے دیکھا لیا تھا کہ لڑکے اچھے خاصے بے وقوف ہیں اور بڑے اوچھے بھی ہیں۔ اس نے سوچا کہ انہیں اپنی مٹھی میں ہی رکھے۔ لڑکوں کو اس نے بڑا خوش کر کے رخصت کیا۔

یہ کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ اب یہی لڑکے پھر آئے ہوئے تھے کہ فرقا آ گیا۔ طوائف نے پہلی ملاقات میں ان سے نام پوچھ لئے تھے اور یہ بھی کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ لڑکوں نے اس قصبے کا نام لیا تھا جس کی میں کہانی سنا رہا ہوں۔ طوائف فرقے کو ہنس ہنس کر ان لڑکوں کی باتیں سنا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ لباس اور انداز سے کسی امیر کبیر گھرانے کے لگتے ہی نہیں تھے، معلوم نہیں یہ زیورات اور اتنی رقم کہاں سے لے آئے تھے۔

فرقے نے یہ بات مجھے سنائی اور اس نے کہا کہ جب اسے طوائف کی زبانی یہ پتہ چلا کہ لڑکے اس قصبے کے رہنے والے ہیں تو اسے ڈکیتی کی یہ واردات یاد آ گئی اسے یہ سوچ آئی کہ ایسا نہ ہو کہ یہ واردات انہی لڑکوں نے کی ہو اور لوٹا ہوا مال پھینکتے پھر رہے ہوں۔ فرقا کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس گھر میں تجوری ٹوٹی ہے وہ گھر ہندو کا تھا اور گھر والے امرتسر گئے ہوئے تھے۔

فرقا ذہین اور تجربہ کار آدمی تو تھا لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس نے یہ بات مجھے جو آن سنائی ہے اس سے وہ مجھے خوش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے پہلے بتایا کہ یہ ڈاکو اور بڑے درجے کے پیشہ ور تھانیداروں کے ساتھ سلام دعا رکھتے تھے اور ان کے انداز میں خوشامد ہوتی تھی۔

فرقے نے خواہ کسی بھی نیت سے مجھے یہ بات سنائی تھی، میں نے اسے نظر انداز نہ کیا اور سوچنے لگا کہ میں اس اشارے پر قسمت آزمائی کروں۔ فرقا کے ساتھ کچھ دیر بحث مباحثہ ہوا اور آخر یہ فیصلہ ہوا کہ فرقا مجھے اسے طوائف کے پاس لے چلے گا۔

اگلے روز فرقا میرے پاس تھانے میں آیا اور میں اس کے ساتھ امرتسر کو روانہ ہو گیا۔ امرتسر کوئی دور نہیں تھا۔ ایک گھنٹے سے پہلے پہلے ریل گاڑی نے ہمیں وہاں پہنچا دیا۔

تانگہ پکڑا اور ہم اس طوائف کے گھر جا پہنچے۔ میں وردی میں نہیں تھا۔ فرقے نے میرا تعارف کرایا۔ طوائف نے بڑی آؤ بھگت کی۔ فرقا کے کہنے پر طوائف نے زیورات کی یہ تینوں چیزیں مجھے دکھائیں۔ میں تو ان چیزوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ ان کی شناخت ہندو ساہوکار کر سکتا تھا یا ان کے اصل مالک جنہوں نے یہ زیورات اس ہندو کے پاس گروی رکھ کر قرضے لئے تھے۔ اس کا یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں اس ہندو کو اور ان اشیاء کے مالکوں کو ساتھ لے جاتا اور وہ شناخت کرتے۔

تفتیش کے قاعدے قانون کے مطابق ایسی شناخت اور برآمدگی کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے اور عدالت میں قانون صرف اس طریقے کو قبول کرتا ہے لیکن میں نے اپنا ایک طریقہ سوچ لیا اور یہ بھی سوچ لیا کہ اپنے طریقے سے پہلے شناخت کروالوں اور اس کے بعد قانون کا بتایا ہوا طریقہ اختیار کروں گا۔

میں نے طوائف سے پوچھا کہ وہ مجھے ایک دو دنوں کے لیے یہ زیورات دے سکتی ہے؟ اسے یہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرے قصبے میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے، ہو سکتا ہے یہ زیورات وہیں سے نکلے ہوں۔ فرقے کا اس طوائف پر اتنا اثر یا دعویٰ تھا کہ طوائف کی بجائے فرقے نے کہا کہ میں یہ زیورات لے جا سکتا ہوں۔ طوائف کو بھی احساس تھا کہ پولیس کو ناراض نہیں کیا جا سکتا۔ طوائف کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ زیورات اگر چوری کے نکلے تو پولیس لے جائے گی اور یہ اس طوائف کا نقصان ہوگا۔ یہ بات طوائف نے اپنی زبان سے کہی بھی تھی لیکن ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ وہ یہ زیورات ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس نہیں کرے گی۔ فرقا نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ چیزیں اس کے ہاتھ سے نکل بھی گئیں تو فرقا اس کا یہ نقصان پورا کرے گا۔

میں یہ چیزیں لے کر فرقا کے ساتھ امرتسر سے واپس آ گیا۔

اوچھے لڑکے اور طوائف کا دلال

میرے سوچنے والی بات یہ تھی کہ ان لڑکوں کو پکڑا کس طرح جائے۔ یہ طوائف شناخت کر سکتی تھی۔ فرقا نے ان کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی جب یہ لڑکے طوائف کے کمرے سے نکل کر باہر جا رہے تھے اگر ان لڑکوں کے نام معلوم ہوتے تو بھی انہیں ڈھونڈ

نکالنا آسان نہ تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ تینوں مسلمان ہیں۔ ایسے کام مسلمان ہی کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلے تو زیورات کی شناخت ضروری تھی۔ میں نے رادھا کے باپ کو بلوایا۔ وہ تو دوڑتا پہنچا۔ اس کا مال چوری ہوا تھا، اسے تو دوڑ کر ہی پہنچنا تھا۔ میں نے تینوں چیزیں اس کے آگے رکھ دیں اور کہا کہ اسے اگر یقین ہے تو کہے کہ یہ اس کی چیزیں ہیں، شک شبے میں بات نہ کرے۔

''میں سچی بات کروں گا مہاراج!''— اس نے کہا— ''یہ زیور میرا نہیں، یہ میرے پاس گروی رکھا ہوا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان میں سے یہ دو چیزیں ایک آدمی کی ہیں اور تیسری چیز دوسرے آدمی کی۔ میں ان کے نام پتے بتاتا ہوں، آپ انہیں بلوا لیں''۔

میں نے اس ہندو سے ان دونوں آدمیوں کے نام پتے معلوم کر کے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے یہ دونوں گھر سمجھا کر کہا کہ ان آدمیوں کو فوراً تھانے لے آئے۔ ہندو کو میں نے باہر بٹھا دیا۔

اب میں سوچنے لگا کہ ان لڑکوں کی نشاندہی کس طرح ہو۔ میں نے فرض کر لیا تھا کہ یہ زیورات اس ہندو کے گھر سے ہی چوری ہوئے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ زیورات ان لڑکوں نے اپنے گھروں سے چرائے ہوں۔ البتہ یہ سوچ کر شک پکا ہوا تھا کہ یہ تین چار دنوں کے وقفے سے اتنی مہنگی طوائف کے پاس گئے اور اتنے زیادہ پیسے دیئے۔

میں نے امرتسر میں ہی ایک ترکیب سوچ لی تھی لیکن فرقا کے کہنے پر میں نے اس پر عمل نہ کیا۔ سوچا یہ تھا کہ امرتسر کے اس علاقے کے تھانیدار سے ملوں اور یہ سارا وقوعہ سنا کر یہ انتظام کروں کہ یہ تینوں لڑکے پھر کبھی اس طوائف کے پاس آئیں تو طوائف انہیں اپنے پاس بٹھا لے اور اپنے آدمی کو تھانے بھیج دے۔ تھانیدار اپنے آدمیوں کو بھیج کر ان تینوں کو تھانے لے جائے اور مجھے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دے دے۔

فرقا جہاندیدہ جرائم پیشہ تھا اور خصوصی ذہانت رکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ اپنا کیس کسی اور تھانے میں نہ جانے دیں۔ آخر عدالت میں گواہوں کی ضرورت ہوگی، ایسا نہ ہو کہ اس تھانے کے آدمی کسی وجہ سے کوئی گڑبڑ کر دیں..... اس کے اس مشورے کو صرف میں ہی سمجھ

سکتا تھا۔ یہ پولیس والوں کی باریکیاں ہوتی ہیں جو کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں بڑے سے بڑے نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔

فرقا بھی تھانے میں ہی موجود تھا۔ میں نے اسے اندر بلایا اور اس مسئلے پر بات چیت ہونے لگی۔ میرے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی جو یہ تھی کہ یہ لڑکے طوائف کے پاس جائیں تو طوائف کا آدمی ان کے ساتھ دوستانہ کر لے اور بے تکلفی بھی پیدا کر لے۔ پھر ان سے کہے کہ اس کا ان کے قصبے کے تحصیلدار کے پاس ایک کام رکا ہوا ہے، یہ لڑکے وہ کام کروا دیں۔ طوائف کے اس آدمی سے کہا جائے کہ وہ ان لڑکوں کو اتنی پھونک دے جیسے وہ جاگیرداروں کے امیرزادے ہیں اور وہ سب کچھ کروا سکتے ہیں۔

فرقا نے میری اس تجویز پر غور کیا تو کہنے لگا کہ وہ کل امرتسر چلا جائے گا اور طوائف کے ہاں جا کر اس کے آدمی کو اچھی طرح سمجھا دے گا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ان لڑکوں کے گھروں کی نشاندہی ہو جائے۔ یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ طوائف کا یہ آدمی اس قصبے میں آ کر ان لڑکوں سے ملے۔

یہ طے کر لیا گیا کہ فرقا اگلے ہی روز امرتسر چلا جائے گا اور یہ انتظام کر دے گا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کل مجھے مل کر امرتسر جائے۔ فرقا اپنے گاؤں کو چلا گیا۔ اتنے میں وہ دو آدمی آ گئے جنہیں میں نے زیورات کی شناخت کے لیے بلایا تھا۔

انہیں اندر بلا کر یہ تینوں چیزیں ان کے آگے رکھیں اور کہا کہ وہ اپنی اپنی چیزیں شناخت کر لیں۔ انہوں نے ذرا سی بھی دیر نہ لگائی۔ ایک نے انگوٹھی اور زنجیر اٹھا لی اور دوسرے نے جھمکے اٹھا لئے۔ ان میں سے جس نے دو چیزیں اٹھائیں اور کہا تھا کہ یہ اس کی ہیں، وہ عقل والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''ایک عرض کروں گا صاحب!''— اس نے کہا— ''میں نے یہ تو کہا ہے کہ یہ دونوں چیزیں میری ہیں لیکن ایسی ہی یہ چیزیں کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں، سنار ایک ہی جیسے زیورات بناتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں مجھ سے غلطی نہ ہو جائے، میرا کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اگر ان لالہ جی کے گھر سے چوری ہوئی ہیں تو یہ میری ہیں، میں نے ہی ان کے پاس یہ گروی رکھوائی تھیں اور کچھ زیور اور بھی تھا جو لالہ جی کے پاس پڑا ہوا تھا''۔

میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ یہ تینوں اشیاء ان دونوں آدمیوں کی ہیں اور یہ اس ہندو

ساہوکار کی تجوری سے چوری ہوئی ہیں۔ اس ہندو اور ان دونوں آدمیوں کو میں نے سختی سے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کسی کے ساتھ ذکر نہ ہو کہ یہ اشیاء کہیں سے برآمد ہوئی ہیں۔ ہندو لالہ بہت خوش تھا کہ چوری کا سراغ مل گیا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ باقی مال بھی برآمد ہوا ہے یا نہیں۔ میں نے اسے ذرا ترش لہجے میں چپ کرا دیا اور کہا کہ وہ ابھی چلا جائے۔

نسیم ابھی تھانے میں ہی تھا اور تین چار پیشہ ور مشتبہ بھی تھانے میں تھے۔ میں نے اپنے جونیئر سب انسپکٹر سے کہا وہ ابھی تفتیش روک لے اور ان سب کو ذرا آرام کرنے دے۔ مجھے امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔

اگلی صبح فرقا آ گیا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ امرتسر کو جاتے ہوئے مجھے ملتا جائے۔ یہ اس لئے کہا تھا کہ زیورات کی یہ تینوں چیزیں لے جائے اور طوائف کو دے دے اور اسے کہا کہ یہ چیزیں اس کے پاس موجود رہنی چاہئیں۔ کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔

غور کریں کہ میں نے سونے کے قیمتی زیورات ایک ڈاکو کو دے دیئے تھے۔ بعد میں وہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھ سے ایسی کوئی چیز نہیں لی۔ وہ زیورات اپنے قبضے میں رکھ سکتا تھا لیکن ان وقتوں کے ڈاکو اور رہزن وغیرہ بھی قابل اعتماد ہوا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے بعض قارئین سمجھ نہ سکیں کہ میں نے یہ زیورات طوائف کو کیوں واپس کر دیئے تھے۔ یہ تو چوری کا مال تھا جو میرے قبضے میں رہنا چاہئے تھا۔

زیورات طوائف کو واپس کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قانون شہادت کے مطابق مال ملزم کی نشاندہی پر اس جگہ سے برآمد کرایا جاتا ہے جہاں اس نے چھپا کر رکھا ہوتا ہے یا کسی کو دیا ہوتا ہے۔ اس قانون کے مطابق میں نے چوری کا یہ مال طوائف کے گھر سے برآمد کروانا تھا اور پھر عدالت میں طوائف کا بیان دلوانا تھا کہ اسے یہ زیورات ان ملزموں نے دیئے تھے۔

فرقا یہ چیزیں لے کر چلا گیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ طوائف کا آدمی مجھے ان لڑکوں کے نام اور گھر بتائے گا۔ میں نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ یہ ضروری نہیں کہ لڑکے پھر کبھی اس طوائف کے پاس جائیں گے۔ وہ کسی اور طوائف کے پاس بھی جا سکتے تھے..... یہ سوچ مجھے کچھ پریشان کرنے لگی۔ میں نے دوسرے طریقے سوچنے شروع کر دیئے۔

فرقا اگلے روز امرتسر سے واپس آیا اور مجھے بتایا کہ وہ زیورات طوائف کو واپس کر آیا ہے اور اسے اور اس کے آدمی کو اپنی ضرورت کے مطابق تیار کر آیا ہے۔

تین یا چار دن گزرے ہوں گے کہ دو اڑھائی بجے طوائف کا آدمی میرے پاس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ان تینوں میں سے ایک لڑکے کے گھر سے ہو آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ لڑکے ایک روز پہلے اس طوائف کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے طوائف کو کھل کر بے دریغ پیسے دیئے۔ طوائف کے اس آدمی نے ان تینوں کو اپنے پاس بٹھایا اور اس طرح بات کی جیسے وہ ان سے بہت ہی مرعوب ہوا ہے۔ اس نے ان کی خاطر مدارات کی اور انہیں ایسی ہوا دی جیسے وہ بڑے ہی اونچے اور امیر کبیر خاندانوں کے امیر زادے ہوں۔ اس نے کہا کہ ان کا اتنا اثر و رسوخ ہو گا کہ وہ اس کا کام کرا دیں گے۔

اس شخص نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکے پھوٹک میں آ گئے اور اسے کہا کہ وہ کسی دن ان کے ہاں آ جائے۔ انہوں نے صرف ایک لڑکے کا ایڈریس دیا اور کہا کہ وہ اس کے گھر پہنچ جائے اور پھر دیکھیں گے کہ اس کا کام کس طرح کروانا ہے۔ مجھے تو ڈر تھا کہ طوائف کا یہ آدمی ان پر یہ ظاہر کرے گا کہ وہ امیر زادے ہیں تو یہ لڑکے اسے اپنے گھروں کے ایڈریس نہیں بتائیں گے کہ ان کی اصلیت بے نقاب ہو جائے گی لیکن اس شخص کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے بہت ہی چھوٹے ذہنوں والے تھے اور وہ یہ کہنے میں اپنی توہین سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی اثر و رسوخ نہیں نہ وہ امیر کبیر والدین کے بیٹے ہیں۔

طوائف کا یہ آدمی اگلے ہی روز اس قصبے میں پہنچ گیا اور گلی محلہ پوچھ کر اس لڑکے کے گھر تک جا پہنچا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لڑکے اس لئے بہت خوش ہوں گے کہ اتنی خوبصورت طوائف کا دلال ان کا دوست بن گیا ہے وہ کسی کی منت سماجت کر کے تحصیل کے دفتر میں اس کا کام کروا دیں گے اور پھر یہ طوائف ان سے اتنے زیادہ پیسے نہیں لیا کرے گی۔

یہ آدمی اس لڑکے کے گھر گیا تو لڑکا اسے مل گیا۔ لڑکے نے اسے گھر میں بٹھانے کی بجائے چھوٹے سے ایک ہوٹل میں جا بٹھایا اور اس کی خاطر تواضع کی۔ اس دوران اس آدمی نے جھوٹ موٹ اپنا ایک مسئلہ بیان کر دیا اور کہا کہ کاغذات تحصیلدار کے آفس میں ہیں۔ لڑکے نے اسے کہا کہ وہ معلوم کرے گا کہ یہ کاغذات کس کے پاس ہیں اور پھر وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے کام کروا دے گا۔ لڑکے نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ واپس امرتسر

چلا جائے اور لڑکا خود امرتسر آ کر اسے بتائے گا کہ کام ہو گیا یا نہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔

یہ آدمی اس لڑکے سے رخصت ہو کر میرے پاس آ گیا اور اس لڑکے کا نام اور گھر کا اتا پتہ دے دیا۔ میں نے اس آدمی کو رخصت کر دیا اور اس کا بہت ہی شکریہ ادا کیا۔

بدکردار بیٹے کا عظیم باپ

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر اس لڑکے کا گھر سمجھایا اور کہا کہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔

کوئی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اکیس بائیس سال عمر کا ایک لڑکا ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ میرے دفتر میں داخل ہوا۔ ہیڈ کانسٹیبل اسے میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکے کی یہ حالت تھی جیسے وہ گر پڑے گا اس کے چہرے کا رنگ گھبراہٹ اور خوف سے لاش جیسا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو نہ کہا بلکہ نظریں اس کی آنکھوں میں ڈالے رکھیں۔ اب تو صاف نظر آتا تھا کہ اس کا سارا وجود کانپ رہا ہے۔ میں نے اس ڈر سے کہ یہ بے ہوش ہی نہ ہو جائے اسے بیٹھنے کو کہا اور وہ نظریں میرے چہرے پر گاڑے اس طرح ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھا جیسے اس کرسی میں بجلی کی کرنٹ آ رہی ہو۔

''اتنا ڈرتے کیوں ہو؟''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں تم سے ایک دو باتیں پوچھوں گا، وہ سچ سچ بتا دینا اور میں تمہیں گھر بھیج دوں گا۔ مجھ سے نہ ڈرو۔ بھول جاؤ کہ میں تھانیدار ہوں میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں''۔

اس کے چہرے پر دہشت زدگی کے آثار اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ اگر وہ اس واردات میں ملوث نہ ہوتا تو میری اتنی سی بات پر اس کا اعصابی تناؤ بہت کم ہو جاتا لیکن وہ تو اور ہی زیادہ ڈر گیا۔

''کیا کام کرتے ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''گھر میں ہی رہتا ہوں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''دس جماعتیں پاس ہوں، نوکری نہیں ملتی''۔

''تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''سکول ٹیچر ہے''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''مسلم ہائی سکول میں پانچویں اور

چھٹی جماعتوں کو اردو اور تاریخ پڑھاتا ہے''۔

''امرتسر طوائف کے پاس جانے کے لیے اتنی رقم کہاں سے لاتے ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا اور ساتھ ہی کہا۔۔۔ ''اگر تم نے کہا کہ تم اس طوائف کے پاس کبھی نہیں گئے تو پھر پچھلے کمرے میں الٹا لٹکا دوں گا اور جب تک سچ نہیں بولو گے چھت سے لٹکا ہی رہنے دوں گا''۔

اب تو مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ بے ہوش ہو جائے گا۔ میں نے اپنا رویہ اور لب و لہجہ نرم کر لیا۔ اسے پیار سے سمجھایا کہ وہ دل سے سب خوف اتار دے اور میرے ساتھ صحیح بات کرے پھر میں اس پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلنے دوں گا کہ اسے تھانے بلایا گیا تھا۔

''بولو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میرے سوال کا جواب دو اور دلیری سے کہو کہ تم اس طوائف کے پاس جاتے رہے ہو''۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اس کے ہونٹ کانپے لیکن اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ میں نے کہا کہ وہ طوائف کے ہاں جاتا ہے، یہ بتا دے کہ اتنے پیسے کہاں سے لاتا ہے۔

''پیسے جمع کیے ہوئے تھے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اب ختم ہو گئے ہیں۔ اب نہیں جاؤں گا''۔

میں پوری تفصیل سے نہیں سناؤں گا، مختصر بات یہ ہوئی کہ وہ میرے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے رہا تھا۔ ہر بات ادھوری سی کرتا تھا۔ پولیس کے پاس بڑا سیدھا اور چھوٹا راستہ ہوتا ہے جسے تشدد یا تھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے لیکن میں کم از کم اس دبلے پتلے سے لڑکے پر یہ ظلم کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس واردات کے ساتھ اس لڑکے کا گہرا تعلق ہے جو یہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔

میں آخر اس کے اس انداز اور رویے سے تنگ آ گیا اور سوچا کہ اسے اپنا ہاتھ دکھا ہی دوں۔ میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک معزز سا آدمی میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس سال سے کچھ کم ہی ہو گی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی داڑھی تھی۔ سر پر سفید پگڑی تھی جو نہایت معمولی سے کلے پر لپٹی ہوئی تھی۔ کپڑے بالکل معمولی سے تھے لیکن لحاف

ٹھہرے۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔

اس نے میرے دفتر میں داخل ہوتے ہی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر السلام علیکم کہی اور پوٹلی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے احترام سے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہ کیا ہے۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

''جناب ملک صاحب!''۔۔۔ اس شخص نے کہا۔۔۔ ''یہ میرا بیٹا ہے۔ گھر آیا تو میری بیوی نے مجھے بتایا کہ اسے ایک پولیس حوالدار تھانے لے گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے بلاوجہ تھانے نہیں بلایا گیا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ یہ تو مجھے دھڑکا لگا ہی رہتا تھا کہ میرا یہ بیٹا کوئی رنگ دکھا کر ہی رہے گا''۔

''اس کے متعلق آپ نے یہ کیوں سوچا تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''بدبخت آوارہ ہو گیا ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''غلط سوسائٹی میں چلا گیا۔ میں اسے ٹیچنگ لائن میں لے جا رہا تھا لیکن یہ ایسا ہڈحرام نکلا کہ کسی لائن پر آتا ہی نہیں۔ آوارگی میں خوش رہتا ہے''۔

میں کچھ حیران سا ہو رہا تھا کہ یہ بھی باپ ہے جو عام باپوں کی طرح نہیں کہہ رہا کہ اس کے بیٹے کو تھانے کیوں بلایا گیا ہے۔ یہ تو بڑا شریف لڑکا ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے اور یہ تو اللہ کی گائے ہے۔ اس وقت کے لوگوں کا کردار کچھ اور تھا۔ یہ معزز آدمی اپنے بیٹے کی وکالت نہیں کر رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟''۔۔۔ میں نے وہ پوٹلی اپنی طرف سرکاتے ہوئے جو اس نے میرے سامنے رکھی تھی، پوچھا۔۔۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''کھول کر دیکھیں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوٹلی کھولی تو اس میں زیورات کی تین چار چیزیں تھیں۔ دس دس کے نوٹوں کے دو بنڈل تھے۔ پانچ روپے کے بھی بہت سے نوٹ تھے۔ روپے روپے کے سکوں کی ایک چھوٹی سی تھیلی تھی۔ مختصر یہ کہ اچھا خاصا مال تھا۔ میں نے اس سکول ماسٹر کی طرف دیکھا اور پوچھا کچھ بھی نہیں۔

سکول ماسٹر نے بتایا کہ اسے جب بیوی سے پتہ چلا کہ اس کے بیٹے کو ایک پولیس حوالدار تھانے لے گیا ہے تو یہ ماسٹر سوچنے بیٹھ گیا کہ وجہ کیا ہو سکتی ہے تھانے کسی کو بلاوجہ

نہیں بلایا جاتا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ وہ بہت سے دنوں سے دیکھ رہی ہے کہ یہ لڑکا بھوسے والی کوٹھڑی میں جاتا اور نہ جانے وہاں کیا کرتا اور پھر باہر نکل جاتا ہے۔ ماسٹر نے بتایا کہ یہ تو وہ دیکھ رہا تھا کہ تین چار مرتبہ لڑکا صبح نکلا اور شام کو واپس آیا۔

بیوی زیادہ زور اس بات پر دے رہی تھی کہ بیٹا بھوسے والی کوٹھڑی میں کیا کرنے جاتا ہے۔ ماسٹر نے گھر میں دودھ کے لئے گائے رکھی ہوئی تھی۔ اس گائے کے لئے وہ بھوسہ خرید کر اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں رکھتا تھا۔ اس نے بیوی کا یہ شک دیکھا تو اٹھ کر بیوی کے ساتھ بھوسے والی کوٹھڑی میں گیا اور اِدھر اُدھر کوٹھڑی کی تلاشی لی۔ ماسٹر نے اسے بتایا کہ اسے شک یہ ہوا کہ لڑکے نے جوئے میں پیسے جیتے ہوں گے اور وہ اس کوٹھڑی میں چھپا کر رکھے ہوں گے۔

ایک کونے میں چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی ایک ٹوکری رکھی تھی۔ ماسٹر نے ٹوکری ہٹائی تو وہاں سے کوٹھڑی کا کچا فرش کچھ نرم نرم سا لگا۔ ماسٹر نے ہاتھ سے وہ جگہ محسوس کی تو وہاں سے جگہ کھودی ہوئی تھی۔ وہاں سے یہ پوٹلی برآمد ہوئی۔ ماسٹر نے کہا کہ یہ چوری کا مال ہے اور اسی لئے اس لڑکے کو تھانے بلوایا گیا ہے۔ ماسٹر نے پوٹلی اٹھائی اور تھانے آن پہنچا۔

''یہ مال میرا نہیں ملک صاحب!''۔۔۔ اس معزز سکول ماسٹر نے مجھ سے کہا۔۔۔ ''اگر آپ نے اس مال کی وجہ سے تھانے بلایا ہے تو یہ رہا مال اور بیٹا پہلے ہی آپ کے پاس ہے، میں سمجھوں گا کہ میرے لیے یہ بیٹا مر گیا۔ میں اپنے گھر میں چوری کا مال برداشت نہیں کر سکتا نہ اس بیٹے کی موجودگی گھر میں برداشت کر سکتا ہوں جو چور ہے..... میں بچوں کو تعلیم دیتا ہوں اور انہیں اخلاقیات کے سبق دیتا ہوں لیکن اپنے بیٹے کا یہ حال ہے۔ یہ زیورات اور رقم جو میں نے آپ کے آگے رکھی ہے یہ مال میرا نہیں''۔

وہ اٹھا اور سلام کر کے باہر کو چل پڑا۔ میں نے اسے روک لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اسے اپنے ایک بازو میں لپیٹ کر بڑے احترام اور پیار سے باہر لے گیا۔ اس شخص نے مجھے اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ میں نے اس کی مدد کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ برآمدہ میں لے جا کر اسے کہا میں اس کے بیٹے کو بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا اور پھر اسے اتنا ڈرا دوں گا کہ یہ صحیح راستے پر آ جائے گا۔ اس طرح اسے تسلیاں اور دلاسے دے کر رخصت کر دیا۔

میں اپنے کمرے میں آیا اور اس لڑکے کو ایک ہی سانس میں جتنی گالیاں دے سکتا تھا دے کر کہا کہ وہ اس عظیم باپ کا بیٹا ہو کر اس راستے پر جا رہا ہے پھر اسے کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے، اپنے ساتھیوں کو پکڑوا دے اور میں اسے وعدہ معاف گواہ بنا کر سزا سے بچا لوں گا۔ اسے اچھی طرح سمجھایا کہ وعدہ معاف گواہ کیا ہوتا ہے اور اسے کس طرح معافی ملتی ہے۔

اس نے روتے ہوئے اقبالی بیان دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میں نے اس کی رہنمائی کی وہ بولتا رہا، میں اسے لقمے دیتا رہا، کچھ سوال پوچھتا رہا اور اس طرح اس کا بیان مکمل ہو گیا۔

اس نے اپنے دو دوستوں کے نام بتائے۔ یہ اس نے بیان کے آغاز میں ہی بتا دیئے تھے اور میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ایک کانسٹیبل کے ساتھ دوڑا دیا تھا کہ ان دونوں کو تھانے لے آئے۔ اس لڑکے کا بیان جاری تھا جب دونوں لڑکے آ گئے۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ یہ دونوں لڑکے گھروں میں نہیں تھے۔ ان کے محلے میں سب کو پتہ چل گیا تھا کہ سکول ماسٹر کے بیٹے کو تھانے لے گئے ہیں۔ یہ دونوں لڑکے غالباً یہ سنتے ہی غائب ہو گئے تھے۔

ہیڈ کانسٹیبل بڑا تیز اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے ایسا نہ کیا کہ تھانے میں آ کر مجھے بتاتا کہ لڑکے نہیں ملے، اس نے انہیں اِدھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس تلاش میں ہیڈ کانسٹیبل کو کسی نے بتایا کہ یہ دونوں لڑکے ریلوے سٹیشن پر دیکھے گئے ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل سمجھ گیا کہ لڑکے فرار کی کوشش میں ہیں۔ اس وقت کوئی ریل گاڑی نہیں گزرتی تھی۔ لاری اڈے پر کوئی لاری بھی تیار نہیں تھی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح بسیں زیادہ نہیں تھیں۔ ایک لاری تیار ہوتی تو چلتی تھی۔

ہیڈ کانسٹیبل ریلوے سٹیشن گیا۔ چھوٹا سا یہ سٹیشن ویران پڑا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو دونوں لڑکے ایک جگہ چھپے ہوئے مل گئے اور وہ انہیں تھانے لے آیا۔ میں نے ماسٹر کے بیٹے کا اقبالی بیان لے کر سمجھایا کہ اسے ایک مجسٹریٹ کے پاس بٹھا دیا جائے گا اور وہ یہی بیان مجسٹریٹ کو قلمبند کرا دے۔ پھر اسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا۔ مقدمہ عدالت میں جائے گا اور وہ یہ بیان عدالت میں دے گا۔ دوسرے ملزموں کو سزا مل جائے گی اور اسے آزاد کر دیا جائے گا۔

مجھے وعدہ معاف گواہ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس کے بغیر ہی تینوں ملزموں پر الزام ثابت کر کے سزا دلا سکتا تھا۔ ویسے بھی میں وعدہ معاف گواہ کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جرم میں پوری طرح شامل ہوتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کے خلاف بیان دے کر سزا سے بچ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے جرم کیا ہے اسے پوری سزا ملنی چاہئے۔ تھانیدار اگر محنت کریں تو وہ وعدہ معاف گواہ کے بغیر ہی ملزموں کو سزا دلا سکتے ہیں۔

میں نے اس لڑکے کو صرف اس لئے وعدہ معاف گواہ بنایا تھا کہ اس کے باپ نے جس دیانتداری کا مظاہرہ کیا اور میرا مسئلہ حل کر دیا تھا، میں اسے انعام دینا چاہتا تھا۔ اس سے بڑا اور انعام کیا ہو سکتا تھا کہ اس کا بیٹا چار پانچ سالوں کے لیے جیل میں بند ہونے سے بچ جائے۔ ایسے نوعمر لڑکے جیل میں سے پکے مجرم بن کر نکلا کرتے ہیں۔

اس لڑکے کو سمجھا بجھا کر اور تسلیاں دلاسے دے کر حوالات میں بند کر دیا۔

ماں باپ کا گناہ، سزا بیٹے کو ملی

بات آگے چلنے سے پہلے آپ سننا چاہیں گے کہ اس لڑکے نے کیا بیان دیا تھا۔ یہ تینوں لڑکے آوارگی اور بدی کے راستے پر چل پڑے تھے۔ انہیں پہلے تو کھانے پینے کا چسکا پڑا مثلاً مٹھائی کھانے، ہوٹل میں جا کر کھانا پینا اور امیروں کے بیٹوں کی طرح پیسے اڑانا۔ تینوں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ان میں ایک لڑکا جسے فرخ کہہ لیں (اصل نام کچھ اور تھا) زیادہ تیز طرار اور نڈر تھا۔ وہ ان کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ ان کی تمام غلط حرکتوں کی ہدایت کاری فرخ ہی کرتا تھا۔ یہ اپنے اپنے گھر سے پیسے چوری کر لیا کرتے تھے پھر انہوں نے چھوٹی چھوٹی چوریاں دوسری جگہوں سے بھی کرنی شروع کر دیں۔ ماسٹر کے بیٹے نے ان چوریوں کی تفصیل سنائی تھی جو میں اس لئے نہیں سنا رہا کہ کہانی میں اس کی ضرورت نہیں۔

یہ تینوں پکے فراڈیئے بن گئے تھے۔ زیادہ پیسے فرخ لاتا تھا جو اپنے ماں باپ سے دھوکے سے لے لیتا تھا۔ یہ تینوں لڑکے شریف اور عزت دار گھرانوں کے تھے۔ انہوں نے جوا کھیلنا بھی شروع کر دیا تھا اور پھر جوئے میں فراڈ کھیلنے کا ڈھنگ بھی انہیں آ گیا تھا۔ مختصر یہ کہ یہ پکے جرائم پیشہ بن گئے تھے لیکن ایسی سطح پر رہے جہاں ان پر شک نہیں ہوتا تھا اور نہ

پکڑے نہیں جا سکتے تھے۔

فرخ نے اپنے دونوں ساتھیوں کو بتایا کہ یہ ہندو سا ہوکار پوری فیملی کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے اور گھر بند ہے، چلو اس کے گھر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ان تینوں میں عقل کی کمی تھی ہی، انہیں پیسوں کی ضرورت تھی اس لئے اس واردات کے لیے تیار ہو گئے۔

فرخ نے باہر کا تالا دیکھا۔ اس کے گھر میں ایسا ہی تالا تھا۔ اس نے اس کی چابی لے لی۔ ایک مضبوط تار بھی لے لی اور ہتھوڑی بھی لے لی۔ اگر اس ہندو کے گھر کے تالے صحیح ہوتے تو یہ لڑکے اور تالے توڑ لیتے لیکن تجوری کبھی نہ کھول سکتے۔ اللہ کے حکم سے اس واردات نے ہونا تھا اس لئے حالات ان لڑکوں کے حق میں ہو گئے۔ باہر کا تالا فرخ کی چابی سے کھل گیا۔ اندر بڑے کمرے کا تالا تار ڈالنے اور ہتھوڑی کی دو تین ضربیں لگانے سے ٹوٹ گیا اور تجوری کے تالے کے اندر تار دو تین بار گھمائی تو تجوری کا دروازہ کھل گیا۔

لڑکوں نے مال سمیٹا اور نکل آئے۔ انہوں نے یہ واردات آدھی رات کے وقت کی تھی۔ اپنے گھروں کو جانے سے پہلے وہ کھیتوں کی طرف نکل گئے اور ایک جگہ بیٹھ کر زیورات اور رقم آپس میں تقسیم کر لی۔

میں حیران تھا کہ باہر کا تالا صحیح طریقے سے بند تھا پھر ملزم کس راستے سے اندر گئے۔ یہ فرخ کا کمال تھا۔ اس کی چابی سے تالا کھل گیا تھا۔ واردات کر کے باہر نکلے تو فرخ نے سوچا کہ یہ تالا بند کر دیا جائے تاکہ باہر سے کسی کو پتہ نہ چلے کو تالا کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی چابی سے تالا بند کر دیا۔

لڑکوں نے اپنے اپنے حصے کا مال اپنے اپنے گھر میں چھپا لیا اور پھر یہ تینوں امیر زادے بن گئے۔ سب سے پہلے تو انہوں امرتسر کی سیر کا پروگرام بنایا اور وہاں گئے۔ چونکہ ان کے ذہنوں میں بدی کے سوا کچھ بھی نہ تھا اس لئے طوائفوں کے بازار میں چلے گئے۔ ایک پان سگریٹ والے کی دکان سے انہوں نے بوتلیں پیں اور پان لئے۔ فرخ ان کا لیڈر تھا۔ اس نے اس دکاندار سے پوچھا کہ یہاں سب سے اچھی طوائف کون سی ہے۔ دکاندار نے انہیں اس طوائف کے گھر کا راستہ بتا دیا جس طوائف کا میں اوپر ذکر کرتا آیا ہوں۔ وہ اس کے ہاں جا پہنچے۔

انہوں نے طوائف بازی کا پروگرام امرتسر جانے سے پہلے ہی بنا لیا تھا۔ فرخ نے

اپنے دوستوں سے کہا کہ کسی بہترین اور سب سے اونچی طوائف کے پاس جائیں گے اور اسے خوش کرنے کے لیے پیسوں کے علاوہ تحفے بھی دیں گے۔ یہ سوچنے لگے کہ تحفے کیا ہوں تو ماسٹر کے بیٹے نے کہا کہ زیور کی ایک ایک آئیٹم دے دیتے ہیں۔ سب اس پر متفق ہو گئے اور زیور کی ایک ایک آئیٹم اپنی جیبوں میں ڈال لی۔

میں نے فرخ کا بیان لیتے ہوئے اسے دلی افسوس سے کہا کہ اتنا ذہین اور اچھا لڑکا ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔ اس کے آلسو نکل آئے اور اس نے کہا اسے عیاش اور فضول خرچ بنانے والے اس کے والدین ہیں۔ اپنے والدین کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ بھی کھانے پینے کے، فضول خرچی کے اور دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کے عادی ہیں کہ وہ بڑے امیر لوگ ہیں۔

فرخ نے اپنے متعلق اور اپنے والدین کے متعلق تو بہت کچھ بتایا لیکن صحیح بات ان کے محلے کے ایک معزز آدمی نے بتائی تھی جو تھانے مجھ سے ملنے آتا رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ فرخ کی ماں چھوٹے سے گھرانے کی لڑکی تھی اور اس کی شادی مالی لحاظ سے ایک اچھے گھرانے میں ہو گئی۔ اس کی ماں یعنی فرخ کی نانی دوسروں سے مال بٹورنے اور کھانے کی عادی تھی۔ فرخ کا نانا بظاہر معزز آدمی تھا لیکن پکا فراڈیا تھا۔ وہ بھی دوسروں کو اُلو بنا کر روپیہ پیسہ بٹورنے کا عادی تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی سچ بولنے کو گناہ اور جھوٹ بولنے کو بڑا ہی نیک کام سمجھتے تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ فراڈ جھوٹ کے بغیر نہیں چلا کرتا۔

فرخ کی ماں نے ہوش سنبھالا تو ماں باپ کو جھوٹ بولتے اور دوسروں کو دھوکے اور فریب دیتے دیکھا تو جھوٹ اور فریب کاری اس کی فطرت کا ایک حصہ بن گئی۔ اسی ماحول میں وہ جوان ہوئی اور ایک باعزت خاندان کے خاوند کی بیوی بن گئی۔ اس شخص کو بھی اس نے دھوکے میں رکھا۔ چال چلن کے لحاظ سے تو ٹھیک رہی لیکن جھوٹ اور فریب کاری کو اپنا ایمان بنائے رکھا۔ اس کے بچے پیدا ہو کر جوان ہونے لگے تو ماں نے انہیں بھی کردار کی یہی تصویر دکھائی جو اس کا اپنا تھا اور اس کے ماں باپ کا تھا۔

فرخ کی ماں اور اس کے باپ میں بھی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اپنے آپ کو امیر کبیر کہلانے میں دلی تسکین محسوس کرتے تھے۔ فرخ نے اسی کو جائز سمجھا اور فضول خرچی کا عادی ہو گیا۔ ماں باپ خوش ہوتے رہے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ امیروں کا بیٹا ہے۔ ماں

نے اسے جھوٹ بولنا سکھا دیا اور ایسا تاثر دیا کہ اپنے فائدے کے لیے اور اپنی بات منوانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔

یہ تھا یہ وہ گھویلو ماحول جس میں فرخ پل کر جوان ہوا اور زندگی کا وہ راستہ اختیار کیا جو اسے سیدھا جیل میں لے گیا۔ میں نے آپ کو ایک وہ باپ دکھایا ہے جو سکول ماسٹر تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پکڑوا دیا اور چوری کا مال میرے آگے رکھ دیا اور کہا کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا بیٹا مر گیا ہے۔ اس نے اپنے اور اپنے خاندان کے وقار پر زد نہ پڑنے دی۔ وہ ایسے بے وقار بیٹے سے دستبردار ہو گیا۔ یہ تو میرے جذبات تھے کہ میں نے اسے کہا تھا کہ میں اس کا بیٹا اسے واپس دے دوں گا اور یہ بیٹا انشاء اللہ صحیح راستے پر چلے گا۔

دوسرا باپ فرخ کا باپ تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے جواب طلبی کرنے لگا کہ میں نے اس کے بیٹے کو کیوں پکڑا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے ڈکیتی کی واردات کی ہے۔ اس باپ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔۔۔ ''توبہ توبہ، میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے نہیں جانتے ہم تو بڑے عزت والے خاندان کے لوگ ہیں۔ آپ ذرا غور سے دیکھیں، کسی دشمن نے میرے بیٹے کو پھنسا دیا ہے''۔

میں نے اس شخص کو ٹالنے کی کوشش کی تو وہ ٹلتا نظر نہ آیا، آخر مجھے کھری کھری باتیں کرنی پڑیں اور اسے چلتا کیا۔ فرخ نے تو اپنی گمراہی کا ذمہ دار اپنی ماں کو ٹھہرایا تھا جس نے عملی طور پر سبق دیئے تھے کہ جو کچھ ہے وہ روپیہ پیسہ ہے اس کے لئے جھوٹ اور فریب کاری جائز ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ فرخ نے ان دونوں لڑکوں کا لیڈر بن کر وہ واردات کی جو خاندانی جرائم پیشہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

مقدمے کا آخر فیصلہ یہ ہوا کہ فرخ اور اس کے ساتھی کو چار چار سال سزائے قید ہوئی اور ماسٹر کے بیٹے کو وعدہ معاف گواہ بننے کے عوض بری کر دیا گیا۔

اس مقدمے کے فیصلے کے فوراً بعد مجھے سی آئی اے میں بھیج دیا گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ سٹر کا بیٹا راہِ راست پر آیا تھا یا نہیں اور فرخ اور اس کا ساتھی کس حال میں جیل سے نکلے تھے۔

خواب اور حقیقت

کوئی ایک مہینہ گذرا، بڑے لمبے عرصے بعد اپنی نہری زمینیں دیکھنے کے لئے گیا۔ وہاں ایک بڑے ہی پرانے یعنی جوانی کے ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ ہندوستان کے ایک تھانے میں میرے ماتحت محرر ہیڈ کانسٹیبل ہوا کرتا تھا۔ پھر جب مجھے سی آئی اے میں بھیجا گیا تو میرا یہ ساتھی وہاں پہلے سے موجود تھا اور اے ایس آئی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ یہ ملاقات سات آٹھ سال بعد ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال وہاں ساتھ رہا۔ وہاں سے جدا ہوئے تو آدھی صدی بعد اب ملاقات ہوئی۔ بوڑھا تو میں بھی ہو گیا، لیکن میرے اس پرانے ساتھی کے چہرے کو بڑھاپے اور پریشانیوں نے بالکل ہی بدل ڈالا ہے۔ جہاں میری زمینیں ہیں وہاں سے وہ گذر رہا تھا تو اس نے مجھے دیکھ لیا اور مجھے پہچان بھی لیا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا رات وہیں گذارنے کے لیے اسے روک لیا۔

رات کو ہم جوانی کی اور سروس کی یادیں تازہ کرتے رہے۔ یہ شخص زندہ دل جوان ہوا کرتا تھا۔ اس نے ایک تفتیش کے دوران ایک معاشقہ بھی لڑایا تھا۔ یہ دلچسپ داستان آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔

''ملک صاحب!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''آپ کو سی آئی اے کا وہ کیس یاد ہے جس میں ایک ہندوانی ماری گئی تھی؟''

''ذرا اور یاد کراؤ نواز بھائی!''۔۔۔ میں نے اس سے کہا۔۔۔ ''ہندوانیاں تو کئی ماری گئی تھیں''۔

میرے اس پرانے ساتھی نواز خان نے اس کیس کے متعلق ایک دو باتیں ہی کیں تو مجھے سارا کیس یاد آ گیا اور یہ بھی یاد آ گیا کہ یہ کیس میری ذاتی ڈائری میں درج نہیں بلکہ ان کاغذات میں ہے جو میں نے پٹواریوں کی طرح بستے میں باندھ کر رکھے ہوئے ہیں۔

بارہ چودہ دن وہاں جیل میں گذار کر واپس اپنے گاؤں آیا تو یہ بستہ کھولا۔ یہ کیس میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ پرانے بوسیدہ کاغذوں میں سے چار فل سکیپ لکیر دار کاغذ نکلے۔ یہ اس کیس کا اختصار تھا۔ چند فقرے ہی پڑھے تو مجھے سارا کیس یاد آ گیا۔ پھر میں نے یہ کیس جو اپنی یادداشت کے لیے لکھا تھا۔ سارے کا سارا پڑھا تو مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی اس طرح یاد آ گئیں جیسے میں نے ابھی ابھی اس کی تفتیش ختم کی ہو۔

یہ دلی کے پہاڑ گنج کے علاقے کا کیس تھا۔ میں اس وقت سی آئی اے کے سٹاف میں تھا۔ ایک جوان ہندو لڑکی قتل ہو گئی تھی۔ متعلقہ تھانے میں تفتیش ہوتی رہی، لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ اگر یہ لوگ معمولی سے لوگ ہوتے تو قاتل پکڑا جاتا یا کیس عدم پتہ قرار دے دیا جاتا، لیکن مقتولہ کا باپ اور اس کے خاوند کا باپ بہت بڑے سیٹھ تھے اور دونوں سیاسی میدان کے آدمی تھے۔ مطلب یہ کہ دونوں بڑی اونچی سوشل حیثیت والے تھے۔ مقتولہ کے باپ کی کوشش سے یہ کیس سی آئی اے کو دیا گیا تھا۔

اس کی تفتیش مجھے اور ایک انگریز انسپکٹر کو دی گئی۔ ہم سب سے پہلے متعلقہ تھانے میں گئے اور ایس ایچ او سے کیس کی فائل لی جو پہلے انسپکٹر والٹر نے دیکھی، لیکن تمام تر ضمنیاں اردو میں لکھی ہوئی ہونے کی وجہ سے اس نے فائل مجھے دے دی۔ دوسرے انگریز افسروں کی طرح والٹر بڑی اچھی اردو بول سکتا تھا، لیکن پڑھ نہیں سکتا تھا۔ کیس پڑھ کر میں نے انسپکٹر والٹر کو سنایا پھر ہم دونوں نے متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او انسپکٹر نروتم داس سے سوال جواب کئے جیسے اس واردات کا وہ مشتبہ ہو۔

انسپکٹر والٹر انگریز ہونے کی وجہ سے ہمارا بادشاہ تھا اس لئے اس کے منہ میں جو بات آتی تھی وہ کہہ ڈالتا تھا۔ اس نے انسپکٹر نروتم داس کے منہ پر کہہ دیا کہ یہ اس تھانے کی گڑبڑ ہے ورنہ تفتیش کوئی مشکل نظر نہیں آتی۔ مجھے یہ مشکل نظر آ رہی تھی کہ واردات کو ایک مہینہ گذر گیا تھا اس لئے اب ہمیں اسی ہندو انسپکٹر کی مدد لینی تھی۔ یہ تو پولیس کی دلچسپی کی باتیں تھیں، میں آپ کو یہ سناتا ہوں کہ واردات کیا تھی۔

ایک سیٹھ خاندان کی ایک لڑکی جس کی شادی کو ابھی ایک ہی سال گذرا تھا اس طرح قتل ہو گئی کہ ڈبل بیڈ پر رات کو مردہ پائی گئی۔ انسپکٹر نروتم داس کے بیان اور ایف آئی آر کے مطابق ہمیں یہ معلوم ہوا کہ خاوند باہر گیا ہوا تھا۔ وہ رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے

کے درمیان واپس آیا تو اس کی بیوی پلنگ پر مردہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے خاوند نے دیکھا کہ ایک اٹیچی کیس کھلا ہوا تھا۔ اس میں اس کی بیوی کے زیورات رکھے ہوئے تھے اور اسی اٹیچی کیس میں چند ہزار روپے نوٹوں کی صورت میں بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب مال غائب تھا۔ پوسٹمارٹم رپورٹ میں موت ہاتھوں سے گلا گھونٹنے سے لکھی گئی تھی اور یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مقتولہ کے ساتھ اور کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قتل کا باعث ڈکیتی ہے۔

انسپکٹر نروتم داس نے یہ تصدیق کرالی تھی کہ مقتولہ کا خاوند اپنے باپ کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ اس کے باپ کا بیان بھی شامل تھا۔ وہ کوئی اپنا حساب کتاب کرتے رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتولہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کے ماں باپ سے الگ ایک مکان میں رہتی تھی۔ یہ بھی واضح تھا کہ مقتولہ کی اپنے سسرال کے ساتھ کوئی ناراضگی نہیں تھی۔ اس کا خاوند اپنے ماں باپ کی رضامندی سے اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہتا تھا۔

تھانہ انچارج انسپکٹر نروتم داس نے اسے ڈکیتی کی واردات یا قتل برائے ڈکیتی لکھ کر تفتیش کو اس لائن پر ڈال دیا تھا۔ اس نے پیشہ ور ڈکیتوں اور مشتبہوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ تفتیش ٹھیک کر رہا تھا، لیکن مقتولہ کا باپ کہتا تھا کہ یہ صرف قتل کی واردات ہے اور مقتولہ کو اس کے خاوند نے قتل کیا ہے۔ اسی کی کوششوں سے کیس سی آئی اے کے حوالے کیا گیا تھا۔ ہمارے پاس کیس آنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ مقتولہ کے باپ کے پاس کوئی ایسی قابلِ یقین شہادت تھی جسے متعلقہ تفتیشی افسر نظر انداز کر رہا تھا یا اس شخص کا اثر و رسوخ اتنا تھا کہ اسنے کیس سی آئی اے کے حوالے کروا دیا۔ ہمیں سب سے پہلے مقتولہ کے باپ سے ملنا تھا۔ ہم نے اسے اور مقتولہ کے خاوند کو بلوانے کا حکم جاری کر دیا۔

میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ اس تفتیش کا کریڈٹ صرف مجھے نہیں ملنا چاہئے۔ انسپکٹر والٹر سراغرسانی اور تفتیش کی خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس سے دو تین ایسے ڈھنگ سیکھے تھے جو کبھی میرے ذہن میں نہیں آئے تھے۔

مقتولہ کا باپ جلدی آ گیا۔ ہم دونوں انسپکٹروں کے لئے تھانے کا ایک کمرہ الگ کر دیا گیا تھا۔ ہم نے مقتولہ کے باپ کو اس کمرے میں بٹھایا۔ اس سے پہلا سوال یہ پوچھا کہ وہ کس بناء پر کہتا ہے کہ اس کی بیٹی کو اس کے خاوند نے قتل کیا ہے۔

''کیا آپ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کے داماد کے گھر سے زیورات اور اچھی خاصی رقم چوری ہو گئی ہے؟''۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ تو پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا''۔۔۔ اس نے طنزیہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''پھر آپ کیوں کہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی کا قاتل آپ کا داماد ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کیا آپ اسے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس گھر میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے؟..... اور کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ ڈاکوؤں نے آپ کی بیٹی کو اس لئے قتل کیا ہے کہ اس نے شور مچانے یا مزاحمت کرنے کی کوشش کی ہو گی؟''

''آپ نہیں جانتے کہ یہ لوگ کتنے فریب کار اور دھوکہ باز ہیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اگر آپ یہ پوچھیں کہ میں جانتا تھا کہ یہ فریب کار لوگ ہیں تو میں نے ان کے بیٹے کو اپنی بیٹی کیوں دے دی تھی..... میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ صرف کاروبار میں دھوکہ بازی کرتے ہیں اور دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مخلص رہتے ہیں۔ میرے ساتھ تو یہ لوگ بہت ہی اچھے تھے مگر میری بیٹی کی شادی ان کے ساتھ ہو جانے کی دیر تھی کہ انہوں نے نظریں پھیر لیں۔ میرے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ میں نے بیٹی کو تو بہت سارا جہیز دینا ہی تھا لیکن ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے میں نے بیٹی کو بہت سا کیش بھی دیا لیکن یہ لوگ خوش ہونے والے نہیں''۔

''سیٹھ صاحب!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ ہمارے اس سوال کا جواب پہلے دے دیں کہ آپ کو اپنے داماد پر شک کیوں ہے؟ وجہ ٹھوس ہونی چاہیے۔ ہم آپ کو پورا موقع دیں گے کہ آپ بیک گراؤنڈ کو اچھی طرح بیان کر سکیں''۔

''میں نے کوئی زیادہ لمبی چوڑی بیک گراونڈ بیان نہیں کرنی''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں صرف یہ بتا رہا تھا کہ یہ باپ اور بیٹا جھوٹے اور دھوکہ باز ہیں میرا داماد عیاش آدمی ہے۔ ہم لوگ یعنی میرے اور ان کے خاندان کے افراد میں وہ گھٹن نہیں جو مشہور ہے کہ ہندوؤں میں پائی جاتی ہے۔ ہم سب تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ہمارے لڑکے اور لڑکیاں سوسائٹی میں گھومتے پھرتے ہیں۔ آپ یوں کہہ لیں کہ ہم روشن خیال لوگ ہیں۔ میرے داماد نے میری بیٹی کو خود اپنے ساتھ لے کر دوستوں سے متعارف کرایا۔ اسے بڑے ہوٹلوں اور مختلف دعوتوں وغیرہ میں بھی لے جاتا رہا۔ پھر اس نے خود ہی اس پر الزام لگانے شروع

کر دیئے کہ یہ خراب ہو گئی ہے''۔

''کیا وہ کسی خاص آدمی کا نام لیتا تھا؟''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔۔۔ ''یا وہ کہتا تھا کہ یہ دوستیاں لگاتی پھرتی ہے''۔

''وہ کسی کا نام نہیں لیتا تھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میری بیٹی جب بھی گھر آتی تھی تو یہی رونا روتی تھی کہ خاوند اس کے چال چلن پر شک کرتا ہے۔ اسی پر ان کی آپس میں جھک جھک ہوتی رہتی تھی''۔

''کیا خاوند نے اس پر یہ پابندی عائد کی تھی کہ باہر نہ جایا کرے؟''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔

''نہیں''..... اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں آپ کو وہ باتیں بتا رہا ہوں جو بیٹی اپنی ماں کے ساتھ یا اپنے بھائی کے ساتھ کرتی تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا تھا کہ خاوند نے اس پر کوئی ناروا پابندی تو عائد نہیں کی۔ بیٹی نے بتایا تھا کہ باہر جانے سے وہ نہیں روکتا''۔

''سیٹھ صاحب!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''قتل معمولی جرم نہیں۔ اس کے لیے غیر معمولی طور پر حوصلہ چاہئے یا کسی کے لیے ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں جن پر اس کا اختیار نہ ہو اور وہ کچھ دیر کے لیے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ کیا کوئی ایسی بات ہوئی تھی؟''

''کیا آپ کی بیٹی کو اس کے خاوند نے کسی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا؟''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔۔۔ ''یا ایسے ہوا تھا کہ آپ کی بیٹی اپنے خاوند کے ساتھ لڑ جھگڑ کر آپ کے پاس آ گئی ہو اور خاوند اسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا؟''

''نہیں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ یہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ میری بیٹی اس کی بات نہیں مانتی تھی''۔

اس شخص نے خاصی لمبی بات کی تھی۔ کچھ اس نے بتایا۔ کچھ ہم نے پوچھا۔ اس سے یہ صورت سامنے آئی کہ مقتولہ تیز طرار لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور جرأت بھی رکھتی تھی باپ سے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے تھے کہ وہ یہ کہتا کہ اس کی بیٹی کے کسی کے ساتھ قابل اعتراض تعلقات تھے۔ ابھی تو ہم نے بہت سے لوگوں کے بیان لینے تھے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ ایسے حالات تو پیدا نہیں ہوئے تھے کہ مقتولہ کے خاوند نے غصے سے بے قابو ہو کر اسے قتل کر دیا ہو، لیکن یہ معلوم نہیں کہ مقتولہ کے خاوند میں قتل کی جرأت ہے یا نہیں۔ ہم

نے اس سے پوچھا کہ اس معاملے میں اس کی کیا رائے ہے۔

''خان صاحب!''— اس نے کہا— ''آپ کیسی جرأت کی بات کرتے ہیں! گھر میں دولت ہو اور یاری اونچی قسم کے غنڈے بدمعاشوں کے ساتھ ہو تو جرأت آ ہی جاتی ہے''۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ اونچی قسم کے غنڈے بدمعاش کون ہیں۔ اس نے جو تشریح کی اس سے یہ پتہ چلا کہ یہ وہ غنڈے نہیں جو گلیوں اور بازاروں میں چرس کا کش لگا کر اور جیب میں چاقو ڈال کر گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور تکیوں پر جا کر جوا کھیلتے ہیں اور جن سے کرائے کی غنڈہ گردی بھی کرائی جا سکتی ہے۔ ان غنڈوں کو سیاسی لیڈر اور دیگر امیدوار الیکشن کے دنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

مقتولہ کا باپ جنہیں غنڈے بدمعاش کہتا تھا۔ انہیں ہم امیرزادے اور شہزادے کہا کرتے تھے۔ یہ اندھی دولت والے سیٹھوں، جاگیرداروں اور اعلیٰ افسروں کے بیٹے ہوتے تھے۔ ان میں نوابوں کے بیٹے بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ عیش و عشرت میں پڑے رہتے اور کہیں غنڈہ گردی کرنی ہوتی تو خود نہیں کرتے تھے بلکہ گھٹیا درجے کے بازاری غنڈوں کو پیسے دے کر غنڈہ گردی کرواتے تھے۔ یہ نسل پاکستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ مقتولہ کا خاوند اسی قسم کا امیرزادہ تھا اور اس کی عادتیں ویسی ہی تھیں جیسی میں نے بیان کی ہیں۔ ایسے امیرزادے شراب پیتے اور اونچی قسم کی گانے اور ناچنے والیوں کے ہاں جاتے تھے۔

اونچی قسم کی ناچنے والیاں

مقتولہ کے باپ کو ہم نے بہت کھنگالا۔ اس کے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں تھی جو اس کے داماد کے خلاف الزام ثابت کرتی، لیکن اس نے جو دلیلیں دیں اور جس انداز سے باتیں کیں اس سے ہمیں یہ تاثر ضرور ملا کہ اس کے داماد پر شک کیا جا سکتا ہے اور اسے مشتبہ کی حیثیت سے شاملِ تفتیش ہونا چاہئے۔

''اس بات پر غور کریں انسپکٹر صاحب!''— اس نے کہا— ''میں نے سنا ہے کہ میرے داماد نے پولیس سٹیشن میں یہ بیان دیا ہے کہ قتل کی رات وہ اپنے باپ کے پاس تھا اور وہ کوئی حساب کتاب کرتے رہے تھے اور اسی میں آدھی رات ہو گئی تھی..... میں نے اس رات دس بجے کے بعد اپنے داماد کے باپ کو چاندنی چوک میں دیکھا تھا۔ وہ ایک آدمی کے

ساتھ تانگے پر جا رہا تھا۔ میں تانگے پر گھر کی طرف آ رہا تھا۔ وہ گھر کی طرف نہیں آ رہا تھا بلکہ کہیں جا رہا تھا''۔

میں نے اس کیس کی فائل کھولی اور وہ بیان پڑھا جو مقتولہ کے خاوند نے دیا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ وہ نو بجے کے قریب باپ کے گھر گیا تھا اس میں یہ نہیں لکھا تھا کہ اس وقت اس کا باپ اُسے گھر مل گیا تھا یا وہ گھر میں نہیں تھا اور کچھ دیر بعد آیا تھا۔

انسپکٹر والٹر نے دروازے کے باہر بیٹھے ہوئے کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ انسپکٹر نروتم داس کو بلا لائے۔ نروتم داس فوراً آ گیا۔ ہم نے مقتولہ کے باپ کو باہر نکال دیا۔ نروتم داس کو بٹھا کر مقتولہ کے خاوند کا بیان اس کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ بیان تم نے لیا تھا''— انسپکٹر والٹر نے کہا— ''تم نے کئی سوال پوچھے ہوں گے۔ جرح بھی کی ہوگی''۔

''ہاں صاحب بہادر!''— نروتم داس نے کہا— ''میں نے اپنی پوری تسلی کر کے یہ بیان قلمبند کیا اور اس شخص کے دستخط لئے تھے''۔

انسپکٹر والٹر نے مجھے کہا کہ میں مقتولہ کے سسر کا بیان کھول کر پڑھوں۔ میں نے اس کا بیان پڑھ کر اسے سنایا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے گھر میں تھا جب اس کا بیٹا اس کے پاس آیا تھا اور وہ کچھ کاروباری معاملات اور حساب کتاب کی باتیں کرتے رہے تھے اور اس نے اس کام کے لیے بیٹے کو بلایا تھا۔ اس بیان سے یہ صاف ظاہر تھا کہ جس وقت مقتولہ کے باپ نے اس شخص کو چاندنی چوک میں تانگے پر سوار کہیں جاتے دیکھا تھا اس وقت یہ اپنے گھر میں اپنے بیٹے کے ساتھ کاروباری باتیں کر رہا تھا۔

انسپکٹر والٹر نے نروتم داس سے کہا کہ وہ چلا جائے۔ وہ پہلے تو اٹھا ہی نہیں۔ ہم دونوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ میں اور انسپکٹر والٹر اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے وہ اٹھنا نہیں چاہتا اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں اس کے چہرے پر ایک تبدیلی سی دیکھ رہا تھا۔

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟''— میں نے دوستانہ لہجے میں کہا— ''کہہ دو یار! انسپکٹر والٹر بھی اپنا یار ہے''۔

''ہاں ہاں!''— انسپکٹر والٹر نے پوچھا— ''کیا بات ہے؟''

انسپکٹر نروتم داس آہستہ آہستہ اٹھتے یکلخت سیدھا ہو گیا اور کھسیانی سی مسکراہٹ سے کہنے لگا۔

''کچھ نہیں صاحب بہادر! کچھ نہیں''۔۔۔ وہ انسپکٹر والٹر کو سلیوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

انسپکٹر THIS BASTARD HAS FIDDLED THE INVESTIGATION والٹر نے انگریزی میں کہا، پھر اردو پر آ گیا۔۔۔ ''کیا تم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا؟''۔

''بہت غور سے دیکھا تھا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اس نے تو اچھا خاصا شک پیدا کر دیا ہے''۔

''مقتولہ کے خاوند کو بلاؤ''۔۔۔ والٹر نے مجھے کہا۔

کانسٹیبل کو بلانے کی بجائے میں خود ہی باہر گیا۔ مقتولہ کا خاوند برآمدے میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ مقتولہ کے خاوند تم ہی ہو؟ اس نے پختہ سے لہجے میں جواب دیا کہ وہی مقتولہ کا خاوند ہے۔ میں اسے اندر لے آیا۔

''قتل کی رات تم شام کا کھانا کھا کر اپنے باپ کے گھر چلے گئے تھے''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے اسے کہا۔۔۔ ''تمہیں باپ نے بلایا تھا۔ تم جب وہاں گئے تو باپ تمہیں گھر پر ہی ملا ہو گا''۔

''ہاں صاحب!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میرا باپ گھر ہی تھا۔ اس نے کہا جانا تھا۔ اسی نے تو مجھے بلایا تھا''۔

''تم آٹھ ساڑھے آٹھ بجے وہاں گئے ہو گے؟''

''ہاں صاحب!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''یہی وقت تھا''۔

''تم نے بیان دیا تھا کہ تم تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک وہاں رہے!''

''ہاں صاحب!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''یہی وقت تھا''۔

''ساڑھے آٹھ سے ساڑھے گیارہ بجے تک تم اپنے باپ کے ساتھ رہے''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔۔۔ ''کیا تم اپنے باپ کے ساتھ تانگے پر کہیں گئے تھے؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کے چہرے پر جو تاثرات آئے وہ اس کے خلاف گواہی دیتے تھے۔

''صاحب کے سوال کا جواب دو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یہ کوئی اتنی پرانی بات نہیں کہ اس وقت تمہارے ذہن سے اتر گئی ہو''۔

''میں باپ کے ساتھ اس رات باہر نہیں گیا تھا''۔۔۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''تمہارا باپ اس رات گھر نہیں تھا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تمہارا تحریری بیان ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے مطابق تم ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک اپنے باپ کے ساتھ رہے''۔

''میرے سوال کا جواب بعد میں دینا''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟''

''آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میرا باپ.....''

''پوچھنے والا کام ہم کریں گے''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''تم صرف جواب دینے والا کام کرو..... بولو..... ہم نے کیا پوچھا ہے؟''

''میں پہلے بیان دے چکا ہوں صاحب!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں اسی بیان پر قائم رہوں گا۔ میں اپنے باپ کے گھر گیا تھا اور اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہا تھا''۔

''اور تمہارا باپ اس دوران باہر نہیں گیا تھا!''۔۔۔ میں نے کہا۔

''نہیں!''۔۔۔ اس نے کہا۔

پہلے تو اس کی زبان کانپ گئی تھی لیکن بعد میں وہ شیر ہو گیا اور دلیرانہ لہجے میں جواب دینے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ یہی سچا ہو سکتا ہے۔ اس کا سسر جھوٹ بول رہا ہو گا۔ وہ اسے پھنسانا چاہتا تھا۔ انسپکٹر والٹر کو میں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ اسے ذرا باہر بھیج دے تاکہ ہم آپس میں اس کے جھوٹ اور سچ کے متعلق بات کر سکیں۔

بدمعاشی کرتی تھی

اس کے جانے کے بعد میں نے انسپکٹر والٹر کو اپنے تاثرات بتائے۔ میں ابھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔ ہم دونوں نے اس شخص کے جواب دینے کے انداز اور چہر۔

کے بدلتے ہوئے جو تاثرات دیکھے تھے ان کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ ہم نے اس نتیجے پر پہنچنا تھا کہ مقتولہ کا خاوند جھوٹا تھا یا باپ۔ اگر خاوند جھوٹا تھا تو اس پر قتل کا شک کیا جا سکتا تھا یا یہ معلوم کرنا تھا کہ خاوند نے اگر جھوٹ بولا تھا تو کیوں بولا تھا۔ جھوٹ بلاوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر ہم دونوں نے مقتولہ کے سسر کو بلانے کا فیصلہ کیا۔

کچھ دیر بعد وہ آ گیا۔ میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ اس قسم کے روائتی ہندو نہیں تھے جن کی دھوتیاں، توندیں اور سر پر لمبی لمبی بودیاں مشہور ہیں۔ یہ کوٹ اور پتلونیں پہننے والے ہندو تھے۔ مقتولہ کا سسر آیا تو اسے ہم نے کوٹ پتلون میں ملبوس دیکھا۔ اس نے ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اس کی چال ڈھال اور اس کے بولنے کا انداز ہندوستانیوں جیسا فدویانہ نہیں تھا کہ ایک انگریز پولیس انسپکٹر سے مرعوب ہو کر جھک جھک کر باتیں کرتا۔ اس نے آتے ہی ایسے لہجے میں ہم سے پوچھا کہ ہم نے اسے کیوں بلایا ہے جیسے وہ ہم سے جواب طلبی کر رہا ہو۔

''آپ تشریف رکھیں''۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو اس سے بہت چھوٹا ثابت کرنے کے لیے کہا۔۔۔ ''تھوڑا سا وقت ہمیں بھی دے دیں۔ یہ ہے تو آپ کی بہو کے قتل کے سلسلے میں، لیکن یہ کام ہمارے سپرد کر دیا گیا ہے قاتل کا سراغ لگائیں۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے''۔

''میں تو اس گھڑی کو روتا ہوں جب میں اس لڑکی کو اپنے بیٹے کے لیے بیاہ کر لایا تھا''۔۔۔ اس نے کہا۔

''کیوں؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کوئی بدمعاشی کرتی تھی وہ؟''

''میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ بدمعاشی کرتی تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے تعلقات کس کے ساتھ تھے یا کتنے آدمیوں کے ساتھ تھے''۔

''بات اور صاف کرو''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے جو اسے اتنی دیر سے گھور رہا تھا، پوچھا۔۔۔ ''کیا بدمعاشی کرتی تھی؟''

''خاوند کے قابو سے باہر ہو گئی تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''اور سیر سپاٹے کی عادی تھی''۔

''آپ کا بیٹا آپ سے الگ کیوں رہتا تھا؟''۔۔۔ میں نے سے پوچھا۔

''میرے بیٹے کا دماغ خراب ہو گیا تھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''اس لڑکی کے حسن اور شوخیوں نے اس کے دل سے ماں باپ کی محبت نکال دی تھی''۔

''پھر آپ کے بیٹے کو کب ہوش آیا کہ اس کی بیوی اسے بیوقوف بنا رہی ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''اسے اب ہوش آیا ہے۔ جب وہ قتل ہو گئی ہے''۔۔۔ باپ نے جواب دیا۔

''آپ نے یہ تو سوچا ہو گا کہ قاتل کون ہے؟''

''سوچنا کیا تھا!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میرے بیٹے کے گھر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو میری بہو کو جان سے مار کر چلے گئے؟''

''میری بات غور سے سنو اور سوچ کر جواب دو''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''تم تعلیم یافتہ آدمی ہو۔ تم جانتے ہو کہ سوچنے کا مطلب کیا ہوتا ہے..... تم نے لڑکی کی بدمعاشی کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے اس کے قتل کا باعث اس کی اپنی بدمعاشی ہو اور ساتھ ہی یہ کہتے ہو کہ اسے ڈاکوؤں نے قتل کیا ہے''۔

''اس کی بدمعاشی کا معاملہ الگ ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اور ڈکیتی کی واردات کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہے کہ مقتولہ کیسی لڑکی تھی''۔

''مقتولہ ایسی لڑکی تھی کہ اس پر قابو پانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ تمہارے بیٹے نے اس کو قتل کر دیا''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا اور تھانے کی فائل میری طرف پھینکتے ہوئے مجھے کہا۔۔۔ ''مسٹر ملک! اس کا پہلا بیان مجھے پڑھ کر سناؤ''۔

میں نے اس کا وہ بیان جو اس نے پہلے انسپکٹر نروتم داس کو دیا تھا۔ پڑھ کر والٹر کو سنایا۔ اس میں اس شخص نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی کہ لڑکی بدمعاش تھی۔

''آپ میری سوشل پوزیشن کا خیال رکھیں''۔۔۔ مقتولہ کے سسر نے انسپکٹر والٹر سے انگریزی میں کہا۔۔۔ ''آپ جس پر قتل کا الزام لگا رہے ہیں اس کی سوسائٹی میں اور سیاسی حلقوں میں قابل عزت حیثیت ہے''۔

''میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا مسٹر!''۔۔۔ والٹر نے کہا۔۔۔ ''ہم تفتیش کر رہے ہیں اور یہ تفتیش سی آئی اے کر رہی ہے جس میں تمہاری پتلون بھی اتر سکتی ہے''۔

معلوم نہیں یہ شخص جھوٹا تھا یا سچا۔ اسے انسپکٹر والٹر یہ تاثر دے رہا تھا کہ اس تفتیش میں

اس کی حیثیت معمولی سے ایک گواہ کی ہے جو مشتبہ بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے ان کی باتیں توجہ سے نہیں سنیں کیونکہ میرا دھیان ایک اور طرف چلا گیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اتنے امیر کبیر گھر میں نوکر یا نوکرانی کا ہونا لازمی ہے۔ انسپکٹر والٹر اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور میں کیس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ اس میں مجھے کسی نوکر یا نوکرانی کی موجودگی نظر نہ آئی۔ ڈکیتی کی واردات میں گھر کے نوکر کو خاص طور پر شامل تفتیش کیا جاتا ہے کیونکہ نوکر گھر بھیدی کا کام کرتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واردات نوکر نے ہی کی ہو۔ یہ جنگ عظیم دوم کے وقت کا واقعہ ہے۔ دلی کی رونق امریکی اور برطانوی فوجوں کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ ان لوگوں کے پاس جنہیں فوجی سامان سپلائی کرنے کی ٹھیکیداریاں مل گئی تھیں، بہت دولت آ گئی تھی۔ اس سے گھروں میں نوکریاں کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ بعض آدمی چوری کرنے یا ڈکیتی کی وارداتیں کرانے کے لیے ہی امیر گھروں میں نوکریاں کرتے تھے۔

''سیٹھ صاحب!''— میں نے اس سے پوچھا— ''آپ کے بیٹے کے گھر نوکرانی تھی یا نوکر؟..... ایک نوکر تھا یا زیادہ؟''

اس سوال پر وہ پریشان ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ ہر سوال کا فوراً جواب دیتا تھا لیکن اب اس کا ردعمل ایسا ہوا جو پولیس کی نگاہ میں بلاوجہ نہیں تھا۔

''اتنے اونچے گھرانے میں دو تین نوکر تو ضرور ہوں گے''— میں نے کہا۔

''ایک نوکرانی تھی''— اس نے جواب دیا۔

''کیا آپ نے اس کا بیان نہیں دلایا تھا؟''

''اس کے بیان کی ضرورت ہی نہیں تھی''— اس نے کہا— ''وہ صبح آتی تھی اور شام کے بعد چلی جاتی تھی''۔

''آپ عقل اور ہوش والے آدمی ہیں''— میں نے کہا— ''کیا آپ کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ نوکرانی گھر بھیدی ہوسکتی ہے، آپ کا ہزاروں کی مالیت کا مال چوری ہوگیا ہے اور آپ نے نوکرانی پر شبہ نہیں کیا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ نوکرانی مجرموں کے ساتھ تھی اور اس وجہ سے آپ کی بہو کو قتل کیا گیا کہ اس نے اپنی نوکرانی کو پہچان لیا تھا''۔

''اس سے کیا پوچھتے ہو!''— انسپکٹر والٹر نے مجھے کہا— ''اسے باہر الگ بٹھاؤ

انسپکٹر نروتم کو بلاؤ''۔

فوراً بعد انسپکٹر نروتم داس ہمارے سامنے کھڑا تھا اور مقتولہ کے سسر کو اس ہدایت کے ساتھ ایک کانسٹیبل کے حوالے کر دیا گیا تھا کہ کسی کے ساتھ بات نہ کرے۔

''کیا اس گھر میں کوئی نوکر یا نوکرانی نہیں تھی؟''— انسپکٹر والٹر نے انسپکٹر نروتم داس سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ نوکر بھی نہیں تھا اور کوئی نوکرانی بھی نہیں تھی''— نروتم نے ایسے انداز سے جواب دیا جیسے سکول کا کوئی نالائق بچہ ماسٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ یقین نہ رکھتا ہو کہ اس کا جواب صحیح ہوگا۔

''اور میرے خیال میں تم نے یہ ساری تفتیش اپنے خیالوں کے مطابق کی ہے''— انسپکٹر والٹر نے اسے طنزیہ کہا— ''میں یہ نہیں مانوں گا کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ڈکیتی کی واردات میں سب سے پہلا مشتبہ گھر کا نوکر ہوسکتا ہے..... کیا تم نے ان سے پوچھا تھا کہ گھر میں کوئی نوکر ہے؟''

''پوچھا تھا صاحب!''— نروتم داس نے جواب دیا— ''یہ کہتے تھے کہ نوکر نہیں ہے''۔

انسپکٹر والٹر کے کہنے پر میں نے مقتولہ کے سسر کو اندر بلایا۔

''کیا اس پولیس انسپکٹر نے تم سے پوچھا تھا کہ گھر میں کوئی نوکر ہے؟''— انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔

''ہاں صاحب!''— اس نے انسپکٹر نروتم داس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا— ''انہوں نے پوچھا تھا اور میں نے کہا تھا کہ نوکر نہیں ہے''۔

''اور اب تم کہتے ہو کہ گھر میں نوکرانی تھی''— انسپکٹر والٹر نے کہا۔

''لیکن انسپکٹر نروتم داس نے نوکر پوچھا تھا''— اس نے کہا— ''انہوں نے نوکرانی نہیں پوچھی تھی''۔

''دونوں باہر نکل جاؤ''— انسپکٹر والٹر نے کہا۔ پھر مجھے کہا— ''اس آدمی کو الگ بٹھاؤ''۔

میں اسے باہر بٹھا آیا۔

''مسٹر ملک!''—— انسپکٹر والٹر نے مجھے کہا—— ''تم مسلمان لوگ بیوقوف ہوتے ہو۔ ان دونوں ہندوؤں کی عقلمندی اور عیاری دیکھی ہے؟ دیکھا، یہ کتنی صفائی سے اور کتنی دلیری سے جھوٹ بول گئے ہیں۔ تم مسلمان لوگ ہندوؤں کی مکاری تک نہیں پہنچ سکتے۔ اب ایسے کرو کہ نوکرانی کو بلاؤ..... مقتولہ کے سسر کو بلاؤ''۔

مقتولہ کا سسر آ گیا۔ انسپکٹر والٹر نے اس سے پوچھا کہ قتل کی رات دس ساڑھے دس بجے کے درمیان وہ ایک آدمی کے ساتھ کہاں جا رہا تھا۔

''میں؟''—— اس نے حیران سا ہو کر جواب دیا—— ''میں تو کہیں نہیں گیا تھا''۔

''تم جس آدمی کے ساتھ گئے ہو وہ اس پولیس سٹیشن میں موجود ہے''—— انسپکٹر والٹر نے جھوٹ بولا اور کہا—— ''اور جنہوں نے تمہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا ان میں سے ایک آدمی یہاں موجود ہے اور تین آدمی ابھی آ جائیں گے۔ اگر تم سچ بول دو تو ان آدمیوں کے سامنے اپنی بے عزتی سے بچ جاؤ گے''۔

وہ سمجھ گیا کہ مقتولہ کے باپ نے انہیں بتایا ہے کہ کہیں وہ جا رہا تھا۔ اس نے مقتولہ کے باپ کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ ہم نے اس کی یہ واہی تباہی بھی غور سے سنی۔

''تمہارے بیٹے کی نوکرانی اس وقت کہاں ہوگی؟''—— انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں''—— اس نے جواب دیا۔

ہم نے مقتولہ کے خاوند کو بلایا۔ اس سے نوکرانی کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گھر ہوگی۔ ہمارے ساتھ اپنے دو ہیڈ کانسٹیبل تھے جو ہماری طرح بغیر وردی کے تھے۔ سی آئی اے کا سٹاف بغیر وردی کام کرتا تھا۔ ان میں سے ایک ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ اس تھانے کا ایک ہیڈ کانسٹیبل بھیجا کہ وہ ان کے گھر سے نوکرانی کو لے آئے۔

نوکر اور نوکرانی کا جھگڑا

نوکرانی آ گئی۔ وہ ادھیڑ عمر کی غریب سی عورت تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کیسی عورت ہے یا کس قماش کی عورت ہے، میں نے اور انسپکٹر والٹر نے اس کے ساتھ مختلف باتیں کیں جیسے گپ شپ لگائی جاتی ہے۔ اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں نے اسے کہا کہ وہ کرسی پر بیٹھے تو اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اس کی اتنی حیثیت نہیں۔ ہماری

کوشش کے باوجود اس پر ہمارا ڈر سوار رہا۔ اتنی زیادہ باتوں سے یہ جان گئے کہ یہ کوئی چالاک عورت نہیں اور یہ ہیرا پھیری نہیں کرے گی۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جس دن چھوٹا سیٹھ یعنی مقتولہ کا خاوند اسے اس مکان میں لایا تھا۔ اس کے اگلے دن سے وہ اس گھر میں ملازم ہے۔ نوکرانی کو معلوم تھا کہ یہ اپنے ماں باپ سے الگ ہو کر اس مکان میں آیا ہے۔ پہاڑ گنج میں یہ ان کا اپنا پرانا مکان تھا۔ اس کے باپ نے بڑے اچھے علاقے میں اپنی کوٹھی بنوالی تھی۔

ہم نے اس سے اپنے مطلب کی تمام باتیں پوچھیں جن میں سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میاں بیوی کے آپس کے تعلقات کیسے تھے؟ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں اور انسپکٹر والٹر ڈکیتی کی واردات کو نظر انداز کر رہے تھے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے سامنے شکوک آتے جا رہے تھے۔ اس نوکرانی نے بتایا کہ شروع شروع میں مقتولہ اور اس کے خاوند کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ تقریباً روزانہ شام دونوں باہر چلے جاتے اور رات دیر سے واپس آتے تھے۔ نوکرانی رات کو اپنے گھر چلی جاتی تھی۔

نوکرانی نے یہ بھی بتایا کہ چار پانچ مہینے ہی گزرے تھے کہ میاں بیوی میں تھوڑا تھوڑا کھچاؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ مقتولہ نوکرانی کی رائے کے مطابق پہلے ہی آزاد خیال تھی۔ اب خاوند نے اسے باہر گھما پھرا کر اور زیادہ آزاد کر دیا تھا۔ یوں ہونے لگا کہ خاوند اکیلا باہر جاتا اور مقتولہ اکیلی نکل جاتی۔ پھر ان میں تلخ کلامی شروع ہو گئی۔ پھر ان میں لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دو دو تین تین دن ان کی آپس میں بول چال بند رہتی تھی۔

''جس رات وہ قتل ہوئی ہے کیا اس روز یا اس شام ان کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی؟''—— میں نے پوچھا۔

''اس روز نہیں''—— نوکرانی نے بلا جھجک جواب دیا—— ''اس سے ایک رات پہلے ان کی جو لڑائی ہوئی تھی وہ بڑی ہی سخت تھی۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ چھوٹا سیٹھ اپنی بیوی کی پٹائی کر دے گا''۔

''اس لڑائی کی کچھ باتیں سناؤ''—— انسپکٹر والٹر نے کہا۔

''وہ تو صاحب بہادر، ایسی لڑائی تھی جیسے دو دشمن لڑتے ہیں''—— اس نے جواب

دیا۔ ''مالکن (مقتولہ) نے چھوٹے سیٹھ کو یہاں تک کہہ دیا کہ میں تو تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ چھوٹے سیٹھ نے کہا کہ یہ مت سمجھ کہ میں تم سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ میں تمہیں زمین کے تختے سے اٹھا دوں گا۔ چھوٹے سیٹھ نے یہ بھی کہا تھا کہ زندہ رہنا چاہتی ہو اور اس گھر میں رہنا ہے تو آئندہ تم اپنے اس یار سے نہیں ملوگی۔ مالکن نے کہا تھا کہ میں اس سے ملتی ہوں یا نہیں، لیکن اب ملوں گی اور مجھے روک کر دیکھو'۔

اس کے علاوہ نوکرانی نے جو باتیں ان کی اس لڑائی کے متعلق سنائیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ فیصلہ کن معرکہ تھا۔ ہم نے نوکرانی سے پوچھا کہ وہ کون تھا جس سے مقتولہ کا خاوند اسے ملنے سے منع کر رہا تھا۔ نوکرانی نے بتایا کہ باہر کی کوئی بات وہ نہیں بتا سکتی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مقتولہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی تھی۔

نوکرانی نے سر جھکا لیا۔ ایک آدھ منٹ بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کے آنسو بہہ رہے تھے جو اس نے دوپٹے سے صاف کر لیے۔

''وہ تو صاحب یوں سمجھو کہ میری اپنی بیٹی تھی'' ــــ نوکرانی نے آنسو بہاتے ہوئے جواب دیا ــــ ''مجھ پر وہ بھروسہ کرتی تھی۔ سیدھی بات ہے کہ وہ مجھے اپنی ماں جیسا سمجھتی تھی میرے ساتھ اس نے اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی جس طرح مالک نوکروں کے ساتھ بولتے ہیں''۔

''کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ زیور کہاں رکھتی تھی؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''ہاں جی!'' ــــ اس نے جواب دیا ــــ ''ایک ٹرنک کے اندر بائیں طرف خانہ بنا ہوا ہے۔ سارے زیورات اس خانے میں رکھے رہتے تھے۔ اس خانے کا الگ تالا ہے جو خانے کے اندر بنا ہوا ہے۔ اسی میں مالکن کچھ رقم بھی رکھتی تھی۔ روزمرہ پہننے کے لئے وہ تھوڑا سا زیور سنگھار میز کی دراز میں رکھتی تھی''۔

''کیا مالکن نے تمہیں کبھی ٹرنک کا زیورات والا خانہ دکھایا تھا؟'' ــــ میں نے پوچھا ــــ ''یا تم نے ویسے ہی کبھی دیکھ لیا تھا؟''

''اس نے خود دکھایا تھا'' ــــ اس نے جواب دیا ــــ ''دو بار ایسا ہوا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی شادی پر گئی تو اسے زیادہ زیور پہننا پڑا۔ اس نے میرے سامنے ٹرنک کھول کر زیور پہنا اور واپس آئی تو اس نے مجھے سارا زیور دے کر کہا کہ یہ وہیں خانے میں رکھ کر

چابیاں مجھے دے دو''۔

تھانے کی فائل میں مسروقہ مال کی جو تفصیلات لکھی تھیں ان میں یہ تحریر تھا کہ تمام زیورات ایک اٹیچی میں تھے جو چمڑے کا تھا اور چھوٹے سائز کا تھا۔ رقم بھی اسی میں تھی۔ یہ اٹیچی ٹرنکوں کے اوپر پڑا رہتا تھا۔ اسے تھانے کے ایگزیبیٹ کے طور پر رکھا گیا تھا لیکن نوکرانی کہہ رہی تھی کہ زیورات ایک ٹرنک میں رکھے رہتے تھے اور یہ ٹرنک تین ٹرنکوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ ذہن اسی کو قبول کرتا تھا۔ لوگ گھروں میں زیورات اور رقم والے ٹرنک دوسرے ٹرنکوں کے نیچے رکھتے ہیں۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ زیورات اور رقم چمڑے کے ایک اٹیچی کیس سے چوری کیے گئے ہیں؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''معلوم ہے صاحب!'' ــــ نوکرانی نے جواب دیا ــــ ''میں کیا بتاؤں۔ اس اٹیچی کیس میں مالکن اپنی کتابیں، رسالے، پیڈ وغیرہ رکھا کرتی تھی۔ اگر اس نے اس رات زیورات اس اٹیچی کیس میں رکھ دیئے ہوں جس رات وہ قتل ہوئی تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اس رات جب تک میں اس گھر میں رہی، مالکن نے ٹرنک سے زیورات نہیں نکالے تھے''۔

''تم کتنے بجے اس گھر سے فارغ ہو کر اپنے گھر گئی تھیں؟'' ــــ انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔

''میں نے وقت نہیں دیکھا تھا صاحب!'' ــــ نوکرانی نے جواب دیا ــــ ''نو بج چکے ہوں گے''۔

''کیا چھوٹا سیٹھ (مقتولہ کا خاوند) تمہاری موجودگی میں باہر نکلا تھا؟'' ــــ انسپکٹر والٹر نے پوچھا اور کہا ــــ ''وہ شاید آٹھ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلا تھا''۔

''نہیں!'' ــــ اس نے جواب دیا ــــ ''وہ تو شام سے پہلے گھر سے نکلا تھا۔ وہ کھانے پر واپس گھر نہیں آیا تھا۔ مالکن نے اکیلے کھانا کھایا تھا۔ میں روزمرہ کے وقت پر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ صبح آئی تو آگے گھر ہی اجڑا ہوا دیکھا''۔

''گھر میں کون تھا؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''پولیس کا سپاہی باہر بیٹھا ہوا تھا'' ــــ اس نے کہا ــــ ''اس نے مجھے اندر نہیں

جانے دیا۔ محلے کی عورتوں سے مجھے پتہ چلا کہ.....''

''تمہیں تھانے نہیں بلایا گیا تھا؟''—— میں نے پوچھا—— ''یا کسی نے تمہیں کچھ کہا یا پوچھا تھا''۔

''نہ تھانے بلایا گیا نہ کسی اور نے کچھ پوچھا''—— اس نے جواب دیا—— ''ہاں..... چھوٹے سیٹھ کے پتا جی نے دوسرے دن مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ کوٹھی میں بہت دور رہتے ہیں۔ میرے لئے انہوں نے تانگہ بھیجا تھا۔ وہاں گئی تو انہوں نے بتایا کہ چھوٹے سیٹھ کے گھر چوری ہوگئی ہے اور رانی (مقتولہ) کو چوروں نے قتل کر دیا ہے۔ پھر بڑے سیٹھ جی نے مجھے اس مہینے کی تنخواہ پچیس روپے فالتو دے کر کہا کہ تم گھر کی کوئی بات کسی کو نہ بتانا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ پولیس تمہیں بھی شک میں پکڑنا چاہتی تھی لیکن میں اس تھانیدار کو بتایا ہے کہ یہ نوکرانی بہت ہی شریف اور دیانتدار عورت ہے۔ میں تمہیں کسی اور گھر میں نوکری دلا دوں گا۔ تم خاموش رہنا''۔

دُرلی کا شعبدہ

یہ عورت ہمارے لیے بہت قیمتی ثابت ہوئی اس کے بیان سے یہ سراغ تو نہیں ملتا تھا کہ قاتل کون ہے البتہ ہمارا یہ شک پختہ ہوگیا کہ اس تھانے کے ایس ایچ او انسپکٹر نروتم داس نے تفتیش میں گڑبڑ کی ہے۔ نروتم داس کوئی نالائق تفتیشی افسر نہیں تھا۔ اس نے میرے شک کے مطابق رشوت لی ہوگی۔ اگر قاتل مقتولہ کا خاوند ہی تھا تو اس کا باپ اثر ورسوخ والا آدمی تھا۔ اس نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرلیا ہوگا۔ یہ بات بھی تھی کہ ہندو خاندان تھا۔ انسپکٹر نروتم داس بھی ہندو تھا۔ ہندوؤں میں ویسے بھی قتل جیسی سنگین وارداتیں نہیں ہوا کرتی تھیں، یہ تو اونچے نام والا خاندان تھا اور اس خاندان کے پاس دولت تھی۔ مقتولہ کے سسر نے اس ہندو تھانیدار کو خرید لیا ہوگا۔ اس نے اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے اپنی دولت اور اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے انتہائی کوشش کی ہوگی۔

نوکرانی کے سینے سے جو باتیں باہر آگئی تھیں یہ ہمارا کمال تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے مقتولہ کے ساتھ بہت پیار تھا۔ اس کے آنسو رکتے ہی نہیں تھے۔ اسے اچانک یاد آگیا کہ اسے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر منت شروع کر دی کہ میں ان

سیٹھوں کو نہ پتہ چلنے دوں کہ اس نے ہمیں یہ باتیں بتائی ہیں۔ میں نے اسے جھوٹی تسلیاں دیں کہ اس کا نام ظاہر نہیں کیا جائے گا۔

سی آئی اے نے نہ کبھی کسی تھانے میں بیٹھ کر تفتیش کی تھی نہ اب کرتی ہے۔ پولیس کی اس برانچ کا الگ ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے جہاں تفتیش میں تھرڈ ڈگری یعنی ایذا رسانی کو خاص مقام حاصل ہے، وہاں سوال وجواب کم اور دستی کارروائی زیادہ چلتی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں پنجاب کے دوآبہ کے علاقے میں جہاں ڈکیتی اور قتل کی وارداتیں روزمرہ کا معمول تھا سی آئی اے کو دُرلی جتھہ کہا جاتا تھا۔ دُرلی چمڑے کا بنا ہوا چھتر سا ہوتا تھا۔ ملزم یا مشتبہ کو مرغا بنا کر اس کے جسم کے پچھلے حصے پر یہ درلی ماری جاتی تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی، قوی ہیکل ڈاکو دُرلی کی دو تین ضربیں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آج کل تو تھرڈ ڈگری کے سائنسی طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ بعض مشتبہوں کو ہلکی سی اذیت بھی نہیں دی جاتی۔ انہیں کھانے میں امریکہ کی سی آئی اے کی بنائی ہوئی دوائیاں دے دی جاتی ہیں جو برین واشنگ کا کام کرتی ہیں۔

انسپکٹر والٹر نے جب یقین کرلیا کہ تفتیش میں گڑبڑ ہوئی ہے اور اس میں جھوٹ کی آمیزش اتنی زیادہ ہے کہ اصل قاتل کو بچانے کی کوشش واضح ہے تو اس نے کہا کہ ان سب کو اپنے ہیڈ کوارٹر لے چلو۔

اس کیس کی فائل ہم نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ انسپکٹر نروتم داس کو بھی ساتھ لے لیا اور ہم اپنے ہیڈ کوارٹر جا پہنچے۔ انسپکٹر والٹر نے مجھے کہا کہ میں مقتولہ کے خاوند اور اس کے سسر کو بتا دوں کہ یہاں تفتیش کیسی ہوگی اور ان کے لیے بہتر کیا ہے۔

''سیٹھ صاحب!''—— میں نے مقتولہ کے سسر کو الگ لے جا کر کہا—— ''یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ میں ایک ہندوستانی اس انگریز انسپکٹر کے ساتھ ہوں۔ میں نہ ہوتا تو اب تک آپ اور آپ کا بیٹا تفتیش والے کمرے میں الٹے لٹکے ہوئے ہوتے۔ ان کمروں میں انگریز پولیس افسروں کے ہاتھوں کئی ہندوستانی مارے گئے ہیں اور کئی ایذا رسانی سے ہمیشہ کے لیے دماغی لحاظ سے معذور ہوگئے ہیں''۔

''آپ مجھے یہ دھمکی کیوں دے رہے ہیں؟''—— اس نے ڈرنے کی بجائے عجیب رعونت سے مجھ سے پوچھا—— ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی بہو کو میں نے قتل کیا

ہے؟''

''میں آپ کو یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں بالکل علم نہیں کہ آپ کی بہو کو کس نے قتل کیا ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میری گذارش یہ ہے کہ آپ کو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ بالکل صحیح بتا دیں۔ جھوٹ نہ بولیں اور جو جھوٹ آپ پہلے بول چکے ہیں وہ اب یہاں آ کر نہ دوہرائیں ورنہ آپ کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر بات کچھ اور ہے اور تھانے میں کچھ اور بنائی گئی ہے تو مجھے اب بتا دیں۔ میں آپ کا ہندوستانی بھائی ہوں اور اتفاق سے اس انگریز انسپکٹر کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم ہیں''۔

میں اس شخص کے ساتھ سچے دل سے ہمدردی نہیں کر رہا تھا۔ میری ہمدردی اور وفاداری اپنی ڈیوٹی کے ساتھ تھی، لیکن وہ پکا ہندو تھا اور اس کے پاس دولت بھی تھی اور اثر و رسوخ بھی تھا۔ وہ سیاسی کا آدمی تھا۔ اس کے رویے سے پتہ چلتا تھا کہ اسے کسی کا ڈر نہیں۔ وہ جس طرح دلیری اور خود اعتمادی سے بولتا تھا اس سے مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ اس نے تفتیش میں گڑبڑ نہیں کرائی اور اسے اور اس کے بیٹے کو معلوم ہی نہیں کہ قاتل کون ہے۔

میں اس کے ساتھ باتیں کر ہی رہا تھا کہ انسپکٹر والٹر نے مجھے بلا لیا اور پوچھا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ میں نے اسے وہ ساری گفتگو سنائی جو اس سیٹھ کے ساتھ ہوئی تھی۔ میں نے اپنی رائے یہ دی کہ اس شخص کے دماغ پر پیسہ سوار ہے۔ اس کا دماغ درست ہونا چاہئے''۔

''ہمارے پاس وقت نہیں''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''فالتو بات بند..... امرناتھ کو اندر لے آؤ''۔

وہ فوراً تفتیش کا اگلا اور اہم مرحلہ شروع کر رہا تھا۔ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ان لوگوں پر شک پختہ ہو گیا تھا۔ امرناتھ مقتولہ کے خاوند کا نام تھا۔ میں اسے اندر لے گیا۔ انسپکٹر والٹر نے اسے فرش پر اکڑوں بٹھا دیا۔ ایک امیر زادے کے لیے فرش پر بیٹھنا ہی ایک اذیت تھی۔ انسپکٹر والٹر نے مجھے اشارہ کیا اور ایک کو ڈ لفظ بولا۔ یہ سی آئی اے کے سٹاف کے خفیہ کوڈ تھے۔

میں باہر نکلا اور پہلوانوں جیسے جسم کے ایک کانسٹیبل کو اندر لے گیا۔ اسے امرناتھ کے کندھوں پر اس طرح بٹھا دیا، جس طرح سٹول پر بیٹھا جاتا ہے۔ کانسٹیبل کی ادھر پیٹھ تھی

جدھر امرناتھ کا منہ تھا وہ اکڑوں بیٹھا تھا جسے پاؤں پر بیٹھنا کہتے ہیں۔ کانسٹیبل کے وزن سے وہ جھک گیا۔ کانسٹیبل کے پاؤں فرش پر تھے۔ امرناتھ کراہنے لگا۔ میں اور انسپکٹر والٹر اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔

ہم دونوں نے باری باری اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ہم اس کے منہ سے یہ کہلوانا چاہتے تھے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے کہ قتل کی شام اس نے گھر کھانا کھایا تھا اور اس کے بعد اپنے باپ کے گھر چلا گیا تھا اور دونوں کوئی حساب کتاب کرتے رہے تھے۔ اس نے یہ بھی جھوٹ بولا ہے کہ اس کا باپ گھر ہی تھا۔ سچ یہ تھا کہ وہ کہیں اور چلا گیا تھا۔

وہ جوان آدمی تھا۔ اس میں ابھی برداشت تھی۔ وہ یہی کہتا رہا کہ اس نے انسپکٹر نروتم داس کو جو بیان دیا ہے وہی صحیح ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں باہر نکلا تو امرناتھ کا باپ میرے پاس آیا۔

''آپ مجھے کچھ دیر کے لیے جانے کی اجازت دیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں اپنے وکیل کو یہاں لانا چاہتا ہوں''۔

''آپ شامل تفتیش ہیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی..... سیٹھ صاحب! یہ تھانہ نہیں اور یہ کسی مجسٹریٹ کی عدالت بھی نہیں۔ اگر نوبت مقدمے تک پہنچ گئی تو آپ کو وکیل کرنے اور صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ ابھی آپ تفتیش بھگتا لیں''۔

احمقوں کا ٹولہ

امرناتھ کو اسی کمرے میں رہنے دیا۔ دو ہیڈ کانسٹیبلوں کو اس کمرے میں بھیج دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ امرناتھ کو سونے نہ دیں اور اس کی ''خاطر تواضع'' کرتے رہیں۔ انہوں نے اسے زدوکوب نہیں کرنا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل جانتے تھے کہ آج کی رات کیا کرنا ہے۔ اسے سوائے پانی کے کچھ دینا نہیں تھا۔

ہم دونوں انسپکٹر تفتیش کے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور انسپکٹر نروتم داس کو وہاں بٹھا لیا۔ پہلے تو اسے سمجھایا کہ اس نے جو گھپلا کیا ہے وہ بتا دے اور ہم اس پر پردہ ڈال دیں گے۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس انسپکٹر پردہ ڈالنے پر آ جاتے تو پہاڑ بھی نظروں سے اوجھل کر

سکتے ہیں لیکن نروتم داس کو اتنی شہ حاصل تھی کہ وہ ہماری بات پر آ ہی نہیں آ رہا تھا۔

''تم نے چمڑے کا ایک اٹیچی کیس اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''تمہیں بتایا گیا تھا کہ زیورات اور رقم اس میں سے نکلی ہے۔ کیا تم نے اس پر انگلیوں کے نشان دیکھے تھے؟''

''نشان نہیں ملے تھے''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں نے دیکھنے کی کوشش کی تھی''۔

''تم نے گھر کی نوکرانی کو شاملِ تفتیش کیوں نہیں کیا تھا؟''

''اس سے پوچھ گچھ کی تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''باقاعدہ شاملِ تفتیش نہیں کیا تھا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا''۔

''نروتم بھائی!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کیا تمہیں اپنی سروس کی کوئی فکر نہیں؟''

''سروس کی بات مت کرو مسٹر ملک!''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''جیل کی بات کرو۔ یہ شخص اپنے ہاتھ سے اپنے لیے جیل کا گیٹ کھول رہا ہے۔ ہم اسے نہیں روک سکتے..... انسپکٹر نروتم داس! اپنے آپ کو لائن حاضر سمجھو۔ اِدھر ہی رہو۔ ہم ابھی تمہیں گرفتار نہیں کریں گے''۔

انسپکٹر نروتم داس نے مظلوم بن کر فریادیں شروع کر دیں۔ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر رہا تھا۔

''انسپکٹر والٹر صاحب بہادر!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں نے ابھی تفتیش ختم نہیں کی۔ میں مانتا ہوں کہ وقت زیادہ گزر گیا ہے لیکن تفتیش جاری ہے۔ ابھی تو میں نے معلوم نہیں کس کس کو شاملِ تفتیش کرنا تھا''۔

''تم نے کیس کو آخر میں عدم پتہ لکھنا تھا''۔۔۔ میں نے کہا۔

اس نے اپنے بچاؤ کے لیے بڑا اچھا نکتہ پیدا کر لیا تھا۔ اسے وہ اپنی صفائی میں عدالت میں بھی استعمال کر سکتا تھا مگر اس کا یہ نکتہ اس جہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا کہ تفتیش میں اس نے ایک مہینے سے زیادہ دن گزار دیئے تھے اور یہ تو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے قاتل کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کی تفصیلات سنا چکا ہوں۔

میں اور انسپکٹر والٹر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ہم نے صبح پانچ بجے واپس آنا تھا۔ ہمیں

صرف یہ کامیابی ہوئی تھی کہ یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس واردات کی تفتیش میں گڑبڑ کی گئی تھی۔ یہ معلوم کرنا ابھی باقی تھا کہ قاتل کون ہے۔ یہی اصل مسئلہ تھا۔

صبح پانچ بجے ہم دونوں واپس آئے۔ ہمارے دماغ تر و تازہ تھے، اور جب میں نے امرناتھ کو کمرے میں جا کر دیکھا تو اس کا دماغ بھی ٹھکانے آ چکا تھا۔ جسمانی طور پر اس کی حالت بہت بُری تھی۔ اسے سب سے زیادہ جو اذیت ملی وہ یہ تھی کہ وہ سگریٹ بہت پیتا تھا۔ صرف سگریٹ نوشی کے عادی حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ پندرہ سولہ گھنٹوں میں تین پیکٹ سگریٹ پینے والے کو اتنا عرصہ سگریٹ کا ایک کش بھی نہ ملے تو اس کی حالت کیا ہو جاتی ہے۔ ہمیں ہیڈ کانسٹیبلوں نے بتایا کہ امرناتھ ساری رات ان سے سگریٹ کے ایک کش کے لیے منتیں کرتا رہا اور ایک بار رو بھی پڑا تھا۔ اسے ہلکی ہلکی اذیتیں بھی دی جاتی رہی تھیں اور ہیڈ کانسٹیبل اسے بتاتے رہے تھے کہ اسے ایذا رسانی کے کیسے کیسے مرحلوں سے گزارا جائے گا۔ اسے وہ بڑی ہی ہیبت ناک باتیں سناتے رہے تھے۔ ایک ہی رات میں اس کا حلیہ اور رنگ روپ بگڑ گیا۔

''ایک سگریٹ پلا دو''۔۔۔ مجھے اور انسپکٹر والٹر کو دیکھتے ہی اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''پوری ڈبیا ملے گی''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''سچ بول دو''۔

سگریٹ کی طب کے علاوہ اس میں مزید اذیت برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ ٹوٹ چکا تھا۔

''میں سچ بولوں گا تو بھی آپ نہیں مانیں گے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''مجھے بالکل علم نہیں کہ میری بیوی کو کس نے قتل کیا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ تفتیش غلط ہوئی ہے اور چوری نہیں ہوئی تھی''۔

''میرا خیال ہے کہ تم ہوش میں نہیں ہو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یا تمہاری زبان تمہارے قابو میں نہیں''۔

''میں ہوش میں ہوں انسپکٹر صاحب!''۔۔۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے بہت دور کھڑا بول رہا ہو۔۔۔ ''ایک سگریٹ دے دو۔ میں آپ کو صحیح واقعہ بتاؤں گا''۔

''خالی پیٹ سگریٹ نہیں دینا''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''پہلے اسے کچھ کھانے کو

دو''۔

اس کے لیے انڈے، مکھن ٹوسٹ، جام اور چائے منگوائی گئی جو وہ اس طرح کھانے لگا جیسے اسے ہماری موجودگی کا احساس نہ ہو۔ اس کے بعد اسے سگریٹ دیئے گئے۔

زیرو پاور، بیڈروم اور وہسکی

''میں اس رات اپنے باپ کے گھر نہیں گیا تھا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب میں واپس آیا۔ بیوی سوئی ہوئی تھی۔ زیرو کا بلب بیڈروم میں جل رہا تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور سو گیا۔ دوستوں کے ساتھ وہسکی پی تھی۔ اس کا بھی اثر تھا کہ میں نے بیوی کو اچھی طرح نہ دیکھا کہ وہ سوئی ہوئی یا مری ہوئی ہے۔ یہ میں نے تین بجے دیکھا۔ میری آنکھ کھلی۔ بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی جس طرح میں نے اسے پہلے دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو مجھے اس کا منہ کھلا ہوا نظر آیا اور آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی بتی جلائی۔ بیوی کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ مری ہوئی تھی.....

''میں نے اپنے باپ کو ٹیلیفون پر بتایا۔ وہ دور رہتا ہے۔ وہ جب آیا تو انسپکٹر نروتم داس اور اس کے سٹاف کے تین آدمی اس کے ساتھ تھے۔ انسپکٹر نروتم نے مجھ سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ اس نے لاش دیکھ کر کہا تھا کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے، پھر اس نے لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دی۔ اس نے میرے باپ سے کہا کہ قاتل باہر سے نہیں آیا۔ مقتولہ کو اپنے خاوند نے قتل کیا ہے.....

''اس نے مجھ پر قتل کا الزام لگا دیا۔ میں نے اور پتا جی نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ الزام غلط ہے لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ مجھے گرفتار کرے گا۔ آخر ہم نے اسے رشوت پیش کی۔ اس نے دس ہزار روپیہ مانگا۔ یہاں سوال میری عزت کا تھا۔ پتا جی نے سودا منظور کر لیا۔ نروتم داس نے کہا یہ رپورٹ لکھواؤ کہ اٹیچی کیس سے زیورات چوری ہو گئے ہیں اور رقم بھی اور میں اسے ڈکیتی کی واردات لکھ لوں گا اور یہ ظاہر کروں گا کہ تمہاری بیوی کو چور قتل کر گئے ہیں۔ اس نے شور مچانے کی کوشش کی ہوگی یا چوروں کے پیچھے دوڑ پڑی ہو گی''۔

''زیورات اور روپے کہاں تھے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''ٹرنک میں تھے یا اس اٹیچی میں جو تھانے میں رکھا ہے؟''

''ٹرنک میں!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''وہ تو اب بھی اسی ٹرنک میں رکھے ہوئے ہیں۔ چوری تو نہیں ہوئے..... اور رقم کی جو آپ بات کرتے ہیں وہ بھی چوری نہیں ہوئی۔ ہم اتنی زیادہ رقم گھر میں رکھتے ہی نہیں۔ ہماری رقمیں بنک میں جاتی آتی رہتی ہیں۔ یہ تو انسپکٹر نروتم داس نے کہا تھا کہ کہنا کہ مال جو گیا ہے وہ اس اٹیچی میں تھا''۔

اس شخص نے ذرا لمبا بیان دیا تھا۔ میں نے اور انسپکٹر والٹر نے اس پر بہت جرح کی تھی۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسپکٹر نروتم داس نے اس پر قتل کا جھوٹا الزام لگایا تھا اور دس ہزار روپیہ رشوت لے کر واردات کی نوعیت بدل دی تھی۔

امرناتھ انسپکٹر والٹر کے ایک سوال کا جواب دے رہا تھا کہ میری ہنسی نکل گئی۔ انسپکٹر والٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ کام کے دوران وہ مکمل طور پر سنجیدہ رہا کرتا تھا۔ اسے میری ہنسی اچھی نہ لگی لیکن اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

''کیا یہ احمقوں کا ٹولہ نہیں انسپکٹر والٹر؟''۔۔۔ میں نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس کا ذہن جو کچھ گھڑتا جاتا ہے وہ ہمارے سامنے آ جائے''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔

امرناتھ چپ ہو گیا۔ اگر وہ یہ کہانی اپنے دوستوں کو سنا رہا ہوتا تو وہ دلچسپی سے سنتے اور اسے سچی کہانی کہتے۔ اس بدبخت کو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ سی آئی اے کے دو انسپکٹروں کو بیان دے رہا ہے جن میں ایک انگریز ہے۔ انگریز اپنے قانون کی توہین برداشت نہیں کیا کرتے تھے اور میں تو تفتیش کے معاملے میں انگریزوں سے بھی بدتر تھا۔ آج اپنے قانون کی دھجیاں اڑتی دیکھتا ہوں تو دل کو بہت دکھ ہوتا ہے اور انگریزوں کا کردار یاد آتا ہے کہ اپنے قانون کی بے حرمتی کرنے والوں کو سزا دلانے کے لیے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیا کرتے تھے۔

امرناتھ نے آدھا پردہ اٹھایا تھا۔ یہ تو ہم نے اپنی پیشہ ورانہ ذہانت سے معلوم کر لیا تھا کہ تفتیش میں سنگین قسم کی گڑبڑ کی گئی ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاتل پر پردہ ڈالا جائے۔ امرناتھ نے انسپکٹر نروتم داس کو تو ننگا کر دیا لیکن ایسا بیان دے کر کچھ حقائق کو

چھپانے کی کوشش کی جسے کوئی بھی تفتیشی افسر صحیح تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ میں کہانی کو طوالت سے بچانے کی خاطر امرناتھ کا پورا بیان نہیں سنا رہا اور جن باتوں پر ہمیں شک ہوا میں وہ بھی الگ الگ کر کے نہیں سنا رہا۔

ایک بات ضرور سناؤں گا۔ امرناتھ نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی کی لاش پلنگ پر پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ ہمارے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کی بیوی سوئی ہوئی لگتی تھی۔ اس کے جسم پر پورے کپڑے تھے۔ پلنگ پر زبردستی اور مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پوسٹمارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ کا گلا گھونٹا گیا تھا لیکن جسم پر تشدد کا کوئی ایک بھی نشان نہیں تھا۔

یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ چوری یا ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی تھی۔ اگر ہوئی ہوتی اور چور مقتولہ کے قاتل ہوتے تو لاش پلنگ پر نہ ہوتی۔ اسے فرش پر اور ٹرنکوں والے کمرے میں ہونا چاہئے تھا کیونکہ مقتولہ نے پلنگ سے اٹھ کر شور مچانے یا مزاحمت کرنے کی کوشش کی ہو گی۔

اگر باہر سے کوئی مقتولہ کو قتل کرنے کے لیے آیا تھا اور اس کی نیت ڈکیتی کی نہیں تھی تو مقتولہ کی لاش یوں پُرسکون طریقے سے پلنگ پر نہ پڑی ہوتی۔ وہ خوبصورت بلکہ زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اس پر مجرمانہ حملہ قدرتی اور لازمی تھا۔ اگر چوری بھی نہ ہوئی اور مجرمانہ حملہ بھی نہ ہوا ہو تو یہ قتل انتقامی تھا۔ قاتل قتل کی نیت سے ہی آیا تھا۔

''تمہاری ایسی دشمنی کس کے ساتھ ہے کہ وہ تمہاری بیوی کو قتل کر گیا؟''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے امرناتھ سے پوچھا۔

''جواب دینے سے پہلے سوچ لو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ہم نے ابھی کئی اور لوگوں سے پوچھ گچھ کرنی ہے، پھر ہم اس آدمی کو تمہارے سامنے لائیں گے جس کا تم نام لو گے''۔

''ایسی دشمنی تو کسی کے بھی ساتھ نہیں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

''تم نے کسی کی بیوی کے ساتھ ناجائز دوستی بنا رکھی ہو گی''۔

''نہیں جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔

''تمہارا باپ کہتا ہے کہ تمہاری بیوی بدمعاش تھی''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے پوچھا۔۔۔ ''تمہاری کیا رائے ہے؟''

''آزاد خیال تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''مجھے اتنی زیادہ آزادی پسند نہیں تھی''۔

''کیا وہ تمہارے قابو سے نکل گئی تھی؟''

''یہی سمجھ لیں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

''تم اس کو کس سے ملنے سے روکا کرتے تھے؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا کہ جیسے اسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ اس کی نوکرانی نے ہمیں مقتولہ کے ساتھ اس کے تعلقات کی بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ ہم دونوں انسپکٹران باتوں کو ذہن میں رکھ کر اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

''میں نے اسے کبھی.....''

''تم نے اسے کبھی روکا نہیں تھا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم یہی کہنا چاہتے ہو نا!..... وہ تم سے نفرت کرتی تھی۔ اس کا دل کسی اور کے ساتھ تھا۔ تم اس پر بدچلنی کے الزام لگاتے رہتے تھے''۔

اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔

''قتل سے ایک روز پہلے تمہاری اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''بولو، ٹھیک ہے یا غلط؟''

''میرا خیال ہے میری نوکرانی نے آپ کے کان بھرے ہیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میری بیوی اس نوکرانی کو کھلاتی پلاتی رہتی تھی اس لیے نوکرانی اسی کی طرف داری کرتی تھی۔ اب اس عورت نے آپ کو میرے خلاف جھوٹی باتیں بتا دی ہیں''۔

''بکومت!''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''اپنی بیوی کے ساتھ تمہاری لڑائی کیوں ہوئی تھی؟''

انسپکٹر والٹر نے اسے بتایا کہ اس لڑائی میں مقتولہ نے امرناتھ سے کیا کچھ کہا تھا اور امرناتھ نے کیا کہا تھا۔

''لیکن اس سے آپ کو یہ شک نہیں ہونا چاہئے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے''۔۔۔ امرناتھ نے ایسی آواز میں کہا جیسے رو رہا ہو۔۔۔ ''پہلے انسپکٹر نروتم داس نے مجھ پر الزام عائد کیا تھا کہ اپنی بیوی کو میں نے خود قتل کیا ہے، اب آپ وہی الزام عائد کر رہے ہیں''۔

''پولیس کا کوئی بھی افسر یہ کیس سنے گا تو سب سے پہلے تم پر شک کرے گا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میری بات غور سے سنو چھوٹے سیٹھ امرناتھ جی! جہاں تم نے اتنے سچ بولے ہیں تو یہ بھی بتادو کہ تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے''۔

اس نے بڑی شدت سے انکار کیا۔

''انسپکٹر نروتم داس نے مجھ سے دس ہزار روپیہ لیا تھا''۔۔۔ امرناتھ نے کہا۔۔۔ ''آپ بارہ ہزار لے لیں''۔۔۔ اس نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھا جیسے ہماری بولی کا انتظار کر رہا ہو، پھر بولا۔۔۔ ''آپ خود بتائیں..... پندرہ ہزار''۔

یہ دس بارہ اور پندرہ ہزار روپے آج کے نہیں تھے۔ انہیں آج کے لاکھ، ڈیڑھ اور دو لاکھ سمجھیں۔

''تم ابھی اپنے ٹھکانے پر چلو''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے امرناتھ سے کہا۔

''اب کیا ہوگا؟''۔۔۔ اس نے پوچھا۔

''ہم تمہیں سوچنے کی مہلت دے رہے ہیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کچھ خود سوچنا کچھ ہم تمہاری مدد کریں گے''۔

اسے اسی کمرے میں بھیج دیا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ اسے اب پھر سگریٹ کے بغیر رکھو اور اپنا ''عمل'' جاری رکھو لیکن شدید نہیں۔

خواب اور حقیقت

ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے انسپکٹر نروتم داس کو بلایا۔

''ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں اور تم اپنے آپ کو بہت ہی ہوشیار اور چالاک سمجھ رہے ہو''۔۔۔ میں نے انسپکٹر نروتم داس سے کہا۔۔۔ ''یہ لوگ عادی مجرم اور ڈکیت نہیں جو کئی کئی دن سی آئی اے کی مار کھا سکتے ہوں۔ یہ تو صرف ایک رات میں بول پڑا ہے۔ ایک سگریٹ کے عوض اس نے تمہارا پردہ اٹھا دیا ہے''۔

''اچھا!''۔۔۔ اس نے بڑی آہستہ سے کہا اور پوچھا۔۔۔ ''اقبالی ہو گیا؟''

''اس جگہ کون اقبالی نہیں ہوتا؟''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم پر ابھی تک دس ہزار کا نشہ سوار ہے۔ ہوش میں آؤ لالہ! شہادت کو موڑنے توڑنے اور اپنی مرضی کی شہادت پیدا

کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لینا تھا کہ مقتولہ کے وارث بھی موجود ہیں اور وہ بھی انہی کے پائے کے لوگ ہیں اور تم بھول گئے تھے کہ سی آئی اے بھی موجود ہے''۔۔۔ میں نے اسے تین چار باتیں بتائیں جو وہ سمجھتا ہوگا کہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکیں گی۔

''ٹھہرو ملک!''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''کیا تم بولو گے یا نہیں؟..... بولو ہاں یا نہیں..... جلدی بولو''۔

اس نے سر جھکا لیا۔

''تمہارا بیان چار روز بعد ہوگا''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''اور تم جانتے ہو تمہارے یہ چار روز کس طرح گزریں گے''۔

''ایک عرض کروں؟''۔۔۔ اس نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھ کر پوچھا۔

''بولو''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔

''میرے خلاف مقدمہ نہ بنائیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''محکمانہ کارروائی کرا دیں''۔

محکمانہ کارروائی میں اسے زیادہ سے زیادہ یہ سزا ملتی کہ نوکری سے سبکدوش کر دیا جاتا۔ مقدمے میں اسے دو چار سال سزائے قید ملنی تھی۔ یہ فیصلہ ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا۔ شہادت میں گڑبڑ کر کے ایک قاتل کو بچانا سنگین جرم تھا۔

''تم بیان دو''۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ ''انسپکٹر والٹر میری بات نہیں ٹالے گا''۔

''ہاں ہاں!''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''پہلے یہ پوری بات بتا دے۔ ہم مدد کریں گے''۔

''میں آپ کو پوری بات بتا دیتا ہوں''۔۔۔ انسپکٹر نروتم داس نے کہا۔۔۔ ''مجھے اس لڑکی کے قتل کی اطلاع امرناتھ کے باپ نے تھانے میں آ کر دی۔ میں اس سیٹھ کو جانتا تھا یہ سیاسی اور سماجی حلقوں میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس نے اس سے پوچھا کہ اسے کس پر شک ہے۔ اس نے کسی پر بھی شک نہ کیا اور کہنے لگا کہ میں اس کے بیٹے کے گھر چلوں پھر وہ میرے ساتھ علیحدگی میں بات کرے گا۔ میں اس کے گھر چلا گیا''۔

''کیا تم نے تمام حالات وغیرہ معلوم کر کے ایف آئی آر تحریر کر لی تھی؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''نہیں!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''مجھے معلوم تھا کہ موقعۂ واردات پر جانے

سے پہلے کیا کیا کاغذات تیار کرنے ہیں، لیکن اس سیٹھ نے مجھے ایف آئی آر نہ لکھنے دی کہنے لگا کہ پہلے میرے بیٹے کے گھر چلو.....

''میں اس کے ساتھ چلا تو گیا لیکن میں یہ سمجھ چکا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ والا ہے اور مقتولہ کو انہوں نے خود ہی قتل کیا ہوگا۔ آپ نے مجھے سچ بولنے کو کہا ہے تو میں بالکل سچ بول رہا ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ یہ بہت مالدار آدمی ہے اور اثر ورسوخ والا بھی ہے، اگر کوئی پیچیدگی اور خطرے والی بات نہ ہوئی تو میں اس سے اچھی خاصی رقم وصول کرسکتا ہوں''۔

اس سے آگے جو وقوعہ ہوا وہ میں ذرا مختصر کر کے اور کچھ انہی لوگوں کی زبانی سناتا ہوں۔ انسپکٹر نروتم داس نے امرناتھ کے گھر میں داخل ہو کر اور ان کی راہنمائی میں بیڈروم میں جا کر دیکھا۔ مقتولہ کی لاش پلنگ پر پیٹھ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر نروتم داس نے لاش کے جسم کا معائنہ کیا۔ گردن پر نیلے نیلے دھبے نظر آئے۔ ان دھبوں سے اور کھلے ہوئے منہ اور مروہ چہرے پر تکلیف کے آثار ہے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مقتولہ کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ انسپکٹر نروتم داس پلنگ اور کمرے کا جائزہ لینے لگا تو امرناتھ کے باپ نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہ اس مکان کا ڈرائنگ روم تھا۔ فرنیچر، قالین اور دیگر اشیاء سے پتہ چلتا تھا کہ یہ کتنے امیر لوگ ہیں۔ مقتولہ کا خاوند امرناتھ وہیں تھا۔

''پنڈت نروتم جی!''۔۔۔ امرناتھ کے باپ نے انسپکٹر نروتم داس سے کہا۔۔۔ ''میں آپ کو بالکل صحیح بتا دیتا ہوں کہ یہ کیا ہوا ہے۔ آگے آپ پر چھوڑتا ہوں۔ آپ چاہیں تو میرے بیٹے کو گرفتار کرلیں اور چاہیں تو اسی طرح معاملہ گول کر دیں''۔

''کیا اپنی بیوی کو آپ کے بیٹے نے خود ہی قتل کیا ہے؟''۔۔۔ انسپکٹر نروتم داس نے پوچھا۔

''ہاں''۔۔۔ بڑے سیٹھ نے جواب دیا۔۔۔ ''لیکن اس نے بیداری کی حالت میں نہیں بلکہ نیند کی حالت میں اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا ہے..... ساری بات غور سے سنیں اور میرے بیٹے کی بچت کا کوئی راستہ نکالیں''۔۔۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔۔۔ ''انہیں پوری بات سنا دو''۔

''میں تو سمجھتا تھا کہ یہ خواب ہے لیکن آنکھ کھلی تو یہ ایک حقیقت نظر آئی''۔۔۔ امرناتھ نے کہا۔

''پورا خواب بیان کریں''۔۔۔ انسپکٹر نروتم داس نے کہا۔

''میں نے خواب میں اپنی بیوی کو ایک آدمی کے ساتھ دیکھا''۔۔۔ امرناتھ نے کہا۔۔۔ ''وہ اس آدمی کے ساتھ بڑی بیہودہ حرکتیں کر رہی تھی۔ میں نے پہلے اس آدمی کو پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹا اور اس کے منہ پر گھونسہ مارا۔ وہ آدمی پیچھے کو گرا۔ میں اس کے اوپر بیٹھ گیا اور اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ میری بیوی نے اپنے آشنا کو مجھ سے چھڑانے کے لیے کوئی چیز میری پیٹھ پر ماری۔ میں نے اٹھ کر اپنی بیوی کی گردن دونوں ہاتھوں سے جکڑ لی اور گردن کو بہت زور سے دبانے لگا۔ دباتے دباتے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا پھر ہلکی ہلکی روشنی ہوگئی۔ اپنی بیوی کی گردن ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں بیدار ہوگیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ میں پلنگ پر ہوں اور یہ بیڈروم ہے۔ پھر مجھے پوری طرح ہوش آئی تو میں نے دیکھا کہ میں اپنی بیوی کے پیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں اور اس کی گردن میرے ہاتھوں میں ہے جسے میں پوری زور سے دبا رہا ہوں۔ میں نے فوراً اس کی گردن چھوڑ دی۔ بیوی بالکل نہیں ہلی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھ پر اتنا زیادہ خوف طاری ہوا کہ میں گھر سے بھاگنے لگا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ پتا جی کو اطلاع دے دوں۔ میں نے انہیں ٹیلی فون پر بتایا تو انہوں نے میرا حوصلہ مضبوط کیا اور کہنے لگے کہ ڈرنا نہیں، میں آ رہا ہوں۔ گھر میں صرف میں تھا یا یہ بیوی تھی جو مر چکی تھی۔ بیوی کا چہرہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ منہ پورا کھل گیا تھا اور زبان تھوڑی سی باہر آ گئی تھی اور آنکھیں تو زیادہ ہی کھل گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی زبان اندر کی اور منہ بند کیا لیکن تھوڑا سا کھلا رہا پھر اس کی آنکھیں بند کیں۔ یہ بھی تھوڑی سی کھلی رہیں۔ اس کے بعد پتا جی کے ساتھ آپ آ گئے''۔

دس ہزار کا بھوت

''میں اس بیان پر کس طرح یقین کرسکتا ہوں!''۔۔۔ انسپکٹر نروتم داس نے انہیں کہا۔۔۔ ''یہ تو بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اپنی بیوی کو امرناتھ نے خود بیداری کے عالم میں قتل کیا ہے''۔

میں آپ کو دو ڈاکٹروں کے نام و پتے بتا سکتا ہوں''۔۔۔ امرناتھ کے باپ نے کہا۔۔۔ ''یہ ان کے زیرِ علاج رہا ہے۔ امرناتھ میں یہ خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ کبھی کبھی نیند میں اٹھ کر چل پڑتا ہے۔ کمروں میں گھوم پھر کر واپس اپنے بستر پر آجاتا ہے۔ اس میں یہ بیماری دس سال کی عمر میں پیدا ہوئی تھی جب اس کی ماں مرگئی تھی۔ ماں کا پیار کھو جانے سے یہ ہوا کہ اسے نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی''۔

انسپکٹر نروتم داس نے ان سے بہت سی باتیں پوچھیں پھر اس نے اپنا حساب کتاب جوڑا اور یہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان لوگوں سے دولت وصول کی جا سکتی ہے اور اس واردات کی نوعیت بھی بدلی جا سکتی ہے۔ دولت کے علاوہ انسپکٹر نروتم داس ان لوگوں کی مدد اس وجہ سے بھی کرنا چاہتا تھا کہ وہ خود بھی برہمن تھا۔ اس نے ان سے پندرہ ہزار روپیہ مانگا اور دس ہزار پر راضی ہوگیا۔ امرناتھ کے باپ نے اسے پولیس کے دو ہندو افسروں کا نام لے کر یقین دلایا کہ ان سے مل کر وہ اسے ترقی بھی دلا دے گا اور اگر اس کیس میں اس پر کوئی مشکل آپڑی تو وہ بھی رفع کرا دے گا۔ انسپکٹر نروتم داس کے دماغ پر دس ہزار کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ جن دو ہندو افسروں کے سیٹھ نے نام لیے تھے وہ دونوں ڈی ایس پی تھے۔ اس سے بھی نروتم داس خوش ہوا کہ کوئی مشکل آپڑی تو یہ ڈی ایس پی اس کی مدد کریں گے۔

انسپکٹر نروتم داس نے اس واردات کو ڈکیتی کی واردات بنا دیا۔ اسے بیڈ روم میں ایک اٹیچی کیس پڑا نظر آیا۔ اس نے اس اٹیچی کیس کو اپنے قبضے میں لے لیا اور اور ان سیٹھوں سے کہا کہ اب وہ یہ رپورٹ دیں کہ اٹیچی کیس میں سے اتنے زیورات اور اتنی رقم چوری ہو گئی ہے۔ امرناتھ کو اس نے یہ کہا کہ وہ اس طرح بیان دے کہ وہ آدھی رات سے کچھ پہلے باہر سے آیا۔ بیڈ روم میں آکر دیکھا کہ بیوی مری پڑی ہے۔ اٹیچی کیس کھلا ہوا ہے اور اس میں سے یہ مال غائب ہے۔

''اسے یہ بھی بیان میں شامل کرنا چاہئے کہ یہ کہاں گیا تھا''۔۔۔ امرناتھ کے باپ نے کہا۔۔۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ اپنے دوستوں کے پاس بیٹھا رہا تھا''۔

''نہیں!''۔۔۔ انسپکٹر نروتم داس نے کہا۔۔۔ ''اگر یہ دوستوں کا نام لے گا تو ان سب کے بیان لینے پڑیں گے۔ چونکہ یہ دوستوں کے پاس نہیں تھا۔ بلکہ اپنے گھر اپنے بیڈ روم میں سویا ہوا تھا اس لئے دوستوں کو جھوٹے بیان پر راضی کرنا پڑے گا اور یہ ہو سکتا

ہے کہ کسی بھی وقت کوئی دوست دھوکہ دے جائے''۔۔۔ نروتم داس نے سوچ کر کہا۔۔۔ ''بہترین اور محفوظ بیان یہ ہوگا کہ یہ آپ کے گھر چلا گیا تھا اور یہ اور آپ کاروبار کا حساب کتاب کرتے رہے تھے اور اسی میں آدھی رات ہوگئی''۔

اس طرح ایک قتل کی واردات ڈکیتی کی واردات بن گئی اور قتل کا باعث ڈکیتی ثابت کیا گیا۔ یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ انسپکٹر نروتم داس نے اس واردات کی تفتیش کو دوسری لائن پر ڈال دیا تھا۔ اس نے امرناتھ اور اس کے باپ کے بیانات لکھ لیے۔ پھر اس کیس کی فائل کو طرح طرح کی ضمنیوں سے بھرتا رہا، جھوٹے روزنامچے بھی لکھتا رہا۔

یہ اس کی غیر معمولی جرأت تھی جو دس ہزار روپے نے اس سے کروائی تھی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ کیس اخباروں میں بھی چھپ گیا ہے۔ انگریزی کے اس وقت کے سب سے بڑے اخبار ''سٹیٹسمین'' میں بھی اس کی خبر نمایاں طور پر چھپی تھی۔ اخباروں میں مقتولہ کے باپ کے اس قسم کے بیان بھی چھپے تھے کہ اس کی بیٹی کو اس کے خاوند نے قتل کیا اور ڈکیتی محض ایک ڈرامہ ہے۔

انسپکٹر نروتم داس کے پیٹ میں دس ہزار روپیہ جا چکا تھا جو مڈل کلاس کے آدمی کے لیے ایک خزانہ تھا۔ آج کل سارے ہی اخبار اور رسالے پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں، لیکن کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ انگریزوں کے زمانے میں کسی محکمے کے خلاف کسی ایک اخبار میں ہلکا سا اشارہ بھی آجاتا تو سرکاری مشینری حرکت میں آجاتی تھی۔ یہ حرکت اس اخبار کے خلاف نہیں ہوتی تھی بلکہ اس محکمے میں پوری انکوائری ہوتی تھی کہ اخبار نے کہاں تک سچ لکھا ہے۔ پھر اس محکمے کی وہ خامی دور کی جاتی تھی۔ دلی میں مقتولہ کے باپ کے بیان شائع ہوئے تو پولیس کا محکمہ چونک اٹھا۔ مقتولہ کے باپ نے پولیس کے اعلیٰ حکام کو درخواست دی کہ اس کی بیٹی کو قتل ہوئے ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے اور ابھی تک قاتل کو گرفتار نہیں کیا گیا، اس لئے درخواست ہے کہ یہ کیس سی آئی اے کو دیا جائے اس کی درخواست پر فوراً حکم صادر کیا گیا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ کیس اخباروں میں آگیا تھا۔

اب یہ کیس سی آئی اے کے پاس آگیا تھا اور صرف ایک رات کے اندر اندر پردے اٹھ گئے اور متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او اقبالی بیان دے رہا تھا۔

اب ہم نے یہ دیکھنا تھا کہ امرناتھ کا یہ بیان کہاں تک سچ ہے کہ اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے اور اس نے اپنی بیوی کو گہری نیند اور خواب کی کیفیت میں قتل کیا تھا۔ انسپکٹر نروتم داس کو ہم نے باقاعدہ طور پر زیرِ حراست لے لیا۔ اسے حوالات میں بھیج کر امرناتھ کے باپ کو بلایا اور اسے بتایا کہ نروتم داس گرفتار ہو کر حوالات میں بند ہو چکا ہے کیونکہ اس نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔

''اب آپ جھوٹ بولنے کی کوشش کرنا''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے اسے کہا۔۔۔ ''ہمارے پاس دو اقبالی بیان آ گئے ہیں۔ ایک نروتم داس کا اور دوسرا آپ کے بیٹے کا''۔

اس کا سر جھک گیا۔ ہم نے اسے یہ نہ بتایا کہ اس کے بیٹے اور نروتم داس نے اپنے بیانات میں کیا کہا ہے۔ ہم نے اسے صرف یہ بتایا کہ مقتولہ اس کے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے اور انسپکٹر نروتم داس نے دس ہزار روپیہ رشوت لے کر قتل کے اس کیس کی شکل صورت ہی بدل ڈالی تھی۔

''میرے بیٹے نے یہ قتل ہوش و حواس میں نہیں کیا''۔۔۔ اس نے بڑی اداس اور ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ امرناتھ نے نیند کی حالت میں اپنی بیوی کو قتل کیا ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''لیکن اس کا تو بڑا ہی ٹھوس اور قابلِ یقین ثبوت چاہئے''۔

''آپ نے دو ڈاکٹروں کے نام دیئے تھے''۔۔۔ انسپکٹر والٹر نے کہا۔۔۔ ''لیکن انسپکٹر نروتم داس نے کیس کی اصل صورت بدل کر ان ڈاکٹروں کے بیان نہیں لئے''۔

''میں آپ کو ان ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا دیتا ہوں''۔۔۔ امرناتھ کے باپ نے کہا۔۔۔ ''آپ ان سے تفتیش کر سکتے ہیں''۔

''ان کے بیان لینے کا وقت گزر گیا ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اگر اب ہم ان کے ساتھ بات کرتے ہیں تو خود ہمارے دل میں یہ شک پیدا ہو گا کہ جس طرح آپ نے ایک پولیس انسپکٹر کو رشوت دی ہے اسی طرح ان دونوں ڈاکٹروں کو بھی رشوت دے کر آپ بیان دلوا دیں گے۔ ہمارا شک یہ ہے کہ آپ نے ان دو ڈاکٹروں کو تیار کر رکھا ہے''۔

''ایسی بات نہیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''امرناتھ کے پاس ڈاکٹروں کے پرانے نسخے موجود ہوں گے۔ یہ دونوں ڈاکٹر اتنے معزز اور بے غرض ہیں کہ انہیں خریدا نہیں جا

سکتا''۔

اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ امرناتھ کی ماں اس کے بچپن میں مر گئی تھی۔ اس کے بعد اسے کبھی کبھی نیند میں چلنے کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

مسلمان نواب زادہ

یہ کوئی عجیب و غریب مرض یا عادت نہیں کہ کوئی نیند میں چلتا پھرتا ہے اور واپس اپنے پلنگ پر آ جاتا ہے اور صبح اسے یاد ہی نہیں رہتا۔ اس مرض کا تعلق جذبات کے ساتھ ہوتا ہے اور سوئے ہوئے انسان کو نیند میں چلانا، اسے کہیں ٹھوکر نہ لگنے دینا، گرنے نہ دینا اور واپس پلنگ پر لٹا دینا ذہنِ لاشعور کا کام ہے۔ اس ذہنی مرض کے بعد مریض نیند میں صرف چلتے ہی نہیں بلکہ کوئی کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ کام ادھورا چھوڑ کر یا پورا کر کے پلنگ پر چلے جاتے اور لیٹ جاتے ہیں۔ صبح انہیں رات کی کارگزاری کا ذرا سا بھی علم نہیں ہوتا۔

امرناتھ کے اس مرض کا باعث یہ بتایا گیا تھا یعنی ماں کی موت، یہ قابلِ یقین تھا۔ اس مرض کی وجوہات اسی قسم کی ہوا کرتی ہیں لیکن یہاں ایک سنگین جرم ہو گیا تھا۔ ایک لڑکی قتل ہو گئی تھی۔ قاتل کے باپ کا صرف یہ کہہ دینا کہ اس سے یہ قتل گہری نیند کی حالت میں سرزد ہوا ہے، قانون کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ قتل کی یہ وجہ صحیح ثابت کرنا ملزم کا کام تھا۔ ہم نے امرناتھ کے باپ کو باہر بھیج کر امرناتھ کو بلایا۔

اس نے کمرے میں آتے ہی سگریٹ مانگا۔ اسے سگریٹ کی بجائے ہم سے پھٹکار اور لعن طعن ملی کیونکہ اس نے انسپکٹر نروتم داس کے خلاف ثبوت خوری کا ذکر تو کر دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی بیوی اس کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے۔ اب ہم نے اسے بتایا کہ اس کا باپ اور انسپکٹر نروتم داس بیان دے چکے ہیں تو اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور ویسا ہی بیان دیا جیسا کہ انسپکٹر نروتم داس نے دیا تھا۔

اگر اس نے اپنی بیوی کو واقعی نیند کی حالت میں قتل کیا تھا تو اس کے ذہنِ لاشعور میں اپنی بیوی کے لیے نفرت اور انتقام کا جذبہ دبا ہوا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ اس کی بیوی کے تعلقات کس کے ساتھ تھے۔

''ایک مسلمان نوابزادہ ہے''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میرا خیال ہے کہ ان

کی یہ دوستی شادی سے پہلے کی تھی لیکن شادی کے پانچ چھ مہینے بعد مجھے اس کا علم ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن ان کا تعلق بڑا گہرا تھا۔ ویسے بھی یہ لڑکی میرے قابو سے نکل گئی تھی۔ شام کو اکیلی باہر نکل جاتی تھی۔ میں اسے کچھ کہتا تھا تو وہ ایک کے بدلے دس سناتی تھی۔ میں اسے محبت کا واسطہ دیتا تھا اور وہ مجھے یہاں تک کہہ جاتی تھی کہ مجھے تمہاری صورت سے ہی نفرت ہے''۔

مختصر یہ کہ ان دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہوگئی۔ امرناتھ نے صاف الفاظ میں بتایا کہ اسے جب یقین ہوگیا کہ اس کی بیوی کے تعلقات ایک مسلمان نوابزادے کے ساتھ ہیں تو اس نے بیوی کو دھمکی دی کہ وہ اسے اس طرح قتل کرے گا کہ اس کی لاش بھی نہیں ملے گی اور وہ مشہور کرے گا کہ اس کی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

''اس کے تین روز بعد مجھے یہ نوابزادہ ملا''۔۔۔ امرناتھ نے بیان دیتے ہوئے کہا۔۔۔ ''کہنے لگا کہ تم نے تو اپنی بیوی کو خالی دھمکی دی ہے لیکن میں دھمکی دیئے بغیر غائب کردوں گا، خبردار! پھر کبھی زبان پر ایسے لفظ نہ لانا..... میں نے سوچا کہ جس نے اتنی دلیری سے دھمکی دی ہے وہ کر کے بھی دکھا سکتا ہے۔ میں اس سے ڈرنے لگا لیکن اپنی بیوی کو میں دیکھتا تھا تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی''۔

''یہ کب کا واقعہ ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''قتل سے دو روز پہلے کا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

''اس معاملے میں اپنی بیوی کے ساتھ بات ہوئی تھی؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''اس سے اگلے روز ہوئی تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''بیوی نے مجھے ایسے الفاظ کہے جو کوئی بزدل آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں وہ ساری رات اور اگلا سارا دن یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ میں کیا کروں۔ قتل کی رات آئی، میں نے خواب میں دیکھا.....''

اس نے وہی خواب سنایا جو ہم سے پہلے اس نے انسپکٹر نروتم داس کو سنایا تھا۔ اس نے بھی بتایا کہ دو ڈاکٹروں سے وہ نیند میں چلنے کی بیماری کا علاج کراتا تھا لیکن یہ بیماری کم نہ ہوئی۔

ہم نے اسے بتایا کہ وہ عدالت میں ان دونوں ڈاکٹروں کو پیش کرے۔ یہ فیصلہ عدالت کرے گی کہ وہ ڈاکٹروں کا بورڈ طلب کرے جو اس کے متعلق اپنی رپورٹ دے کہ اس نے اپنی بیوی کو نیند کی حالت میں قتل کیا ہے اور اسے نیند میں چلنے پھرنے اور کوئی کام کرنے کی بیماری ہے۔

ملزم کا پاگل پن INSANITY ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن اس نوعیت کے ذہنی مرض کو ثابت کرنا بہت مشکل تھا۔ ہمارا یعنی پولیس کا مؤقف یہ تھا کہ ملزم ذہنی خرابی کا بہانہ کر رہا ہے۔ اس نے دیدہ و دانستہ اور بقائمی ہوش و حواس اپنی بیوی کو قتل کیا ہے اور قتل کا باعث موجود تھا یعنی مقتولہ کی ایک آدمی ساتھ آشنائی اور خاوند کے ساتھ حقارت آمیز سلوک۔

ہم نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا۔ عدالت نے ذہنی مرض کو قبول نہیں کیا۔ امرناتھ کو عمر قید انسپکٹر نروتم داس اور امرناتھ کے باپ کو دو دو سال سزائے قید دی گئی۔ ان دولت مند سیٹھوں نے جہاں تک اپیل ہو سکتی تھی دائر کی لیکن سزا قائم رہی۔

✳ ختم شد ✳